اقبال

کے

ہم نشین

علامہ اقبال کی صحبتوں سے مستفیض ہونے والے ۶۶ افراد کی یادداشتیں جن سے علامہ کی شخصیت کے بعض نئے گوشے پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں ؛

مرتبہ

پروفیسر صابر کلوروی

شائع کردہ

مکتبہ خلیل
گلستان سٹریٹ ۲۵
اسلام گنج ابراہیم روڈ
لاہور

شورش کاشمیری
نظیر لدھیانوی
یوسف حسین خاں
مولوی فیروز الدین
خان عبدالغفار خان
جواہر لال نہرو
رئیس احمد جعفری
شیخ محمد عبداللہ
غلام احمد پرویز
آفتاب اقبال
منیرہ بیگم
اسلم جیراجپوری
شیخ عبدالرحیم
زیڈ۔ اے بخاری
ضیاء الدین احمد برنی
جلیل قدوائی
پروفیسر محمد مجیب
نواب مشتاق احمد خان
ممتاز حسن
ڈاکٹر ریاض الحسن
شوکت تھانوی
سر ظفر اللہ خان
خواجہ غلام السیدین
خالد صوفی
مس ڈورس لینڈور

اقبال کے ہم نشین

علامہ اقبال کی صحبتوں سے مستفیض ہونے والے ۶۶ افراد کی یادداشتیں جن سے علامہ کی شخصیت کے بعض نئے گوشے پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں ؛

مُرتّبہ

پروفیسر صابر کلوروی

شائع کردہ

مکتبہ خلیل گلستان سٹریٹ ۲۵ اسلام گنج ابراہیم روڈ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ——— اِقبال کے ہمنشین
طابع ———
کتابت ———
طبع ——— اول
سال اشاعت ——— اکتوبر ۱۹۸۵ء
قیمت ——— ۶۰ روپے

انتساب

پروفیسر مبارک شاہ رکمل گیلانی

پروفیسر ایوّب صابر

پروفیسر سیّد یُونس شاہ

پروفیسر امان اللہ کرمانی (مرحوم)

کے نام

جو گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد
میں میرے ایم اے کے اُستاد تھے۔

فہرست مضامین

	عرضِ مُرتّب		۷
	پیش لفظ	**ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی**	۱۰
۱۔	اقبال اور انجمن :	غلام محی الدین قصوری	۱۶
۲۔	علامہ اقبال میری نظر میں :	سر ظفر اللہ خان	۱۹
۳۔	میرے بچپن کی یادداشت :	اے رزّاق	۲۳
۴۔	علّامہ اقبالؒ سے ایک یادگار ملاقات :	شیخ عبدالرحیم ایڈووکیٹ	۲۵
۵۔	اقبالؒ :	آغا حیدر حسن مرزا	۲۹
۶۔	حضرت علّامہ اقبالؒ سے سلسلۂ نیازمندی :	اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی	۳۶
۷۔	یادِ اقبال :	صغریٰ ہمایوں مرزا	۶۱
۸۔	ڈاکٹر اقبال :	ضیاالدین احمد برنی	۶۶
۹۔	ڈاکٹر اقبال سے پہلی ملاقات :	سید ذوالفقار علی بخاری	۷۳
۱۰۔	اقبال اور طلب علم :	حاجی سردار محمد	۷۶
۱۱۔	اقبال سے ملاقات :	یوسف حسین خان	۷۹
۱۲۔	یادِ اقبال :	جلیل قدوائی	۸۵
۱۳۔	اقبال :	مشتاق احمد وجدی	۹۴
۱۴۔	علّامہ اقبالؒ :	مولوی فیروزالدین	۹۵
۱۵۔	علّامہ اقبالؒ، میری طالب علمی کے تاثرات :	فضلِ حمید	۹۹
۱۶۔	ڈاکٹر اقبالؒ :	پروفیسر محمد مجیب	۱۰۷
۱۷۔	اقبال سے ملاقات :	خان عبدالغفار خان	۱۱۴
۱۸۔	اقبال :	کرنل بشیر حسین زیدی	۱۱۷
۱۹۔	شاعرِ مشرق علّامہ اقبال سے چند ملاقاتیں :	سیّد بادشاہ حسین	۱۱۸
۲۰۔	علّامہ اقبالؒ : ملاقاتیں، یادیں، تاثرات۔	نواب مشتاق احمد خان	۱۲۵
۲۱۔	علّامہ اقبالؒ	چراغ حسن حسرت	۱۳۳
۲۲۔	اقبالؒ (۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء) :	عبدالماجد دریاآبادی	۱۴۸

۲۳۔ اقبالؒ :	محمد علی علویہ پاشا	۱۵۱
۲۴۔ علّامہ اقبال کا انکشاف :	ممتاز حسن	۱۵۵
۲۵۔ علّامہ اقبال — چند یادیں :	نجم الدین عشرت	۱۵۶
۲۶۔ اقبال تاثرات و مشاہدات :	رئیس احمد جعفری	۱۶۰
۲۷۔ اقبال کا سفرِ افغانستان — چند یادیں :	مقبول احمد	۱۷۰
۲۸۔ اقبال :	محمد اسد	۱۷۴
۲۹۔ علّامہ اقبال کی زیارت :	فیض لدھیانوی	۱۷۵
۳۰۔ اقبالؒ سے ایک ملاقات :	ڈاکٹر ریاض الحسن	۱۸۲
۳۱۔ اقبالؒ — چند یادیں :	ملک افتخار علی	۱۸۶
۳۲۔ وضع سادہ :	ڈاکٹر السّعد مسعود	۱۹۱
۳۳۔ علّامہ اقبال کے ساتھ چند لمحے :	محمد الیاس	۱۹۳
۳۴۔ کشمیر اور ڈاکٹر اقبال :	شیخ محمد عبداللہ	۱۹۶
۳۵۔ اقبال سے میری پہلی ملاقات :	ابو محمد مصلح	۲۰۱
۳۶۔ اقبالؒ :	شورش کاشمیری	۲۰۵
۳۷۔ تاثرات :	چوہدری محمد عبداللہ خان	۲۰۸
۳۸۔ اقبال :	شوکت تھانوی	۲۱۲
۳۹۔ اقبال :	پنڈت جواہر لال نہرو	۲۱۴
۴۰۔ یومِ اقبال ،	اسلم جیراجپوری	۲۲۰
۴۱۔ حضرت علّامہ اقبال سے آخری ملاقات :	غلام احمد پرویز	۲۲۶
۴۲۔ حضرت علّامہ اقبال :	شیخ عبدالشکور	۲۳۵
۴۳۔ دانائے راز ڈاکٹر اقبال :	خواجہ غلام السّیدین	۲۴۵

حصّہ دوم — اقبال درونِ خانہ

۴۴۔ میرا بھائی ،	کریم بی	۲۵۲
۴۵۔ صیقلِ ادراک :	آفتاب اقبال ، - بیرسٹر ایٹ لا	۲۵۶
۴۶۔ اَباجی :	بیگم منیرہ صلاح الدین	۲۵۹
۴۷۔ اقبال ایک تاثر :	بیگم محمودہ ریاض	۲۶۰

۴۸۔ اقبال ــ چند یادیں، چند تاثرات : خالد صوفی ۲۶۲
۴۹۔ اقبال کے حضور : مس ڈورس لینڈور ۲۶۶

حصّہ سوم ــــ تاثرات

۵۰۔ نقی محمد خان ۲۲
۵۱۔ شاہد احمد دہلوی ۲۴
۵۲۔ علی بخش ۷۲
۵۳۔ نذیر احمد ۷۸
۵۴۔ آقا بیدار بخت ۱۱۳
۵۵۔ سر محمد شفیع ۱۵۰
۵۶۔ قاضی گوہر الرحمٰن ۱۶۹
۵۷۔ نواب بہادر یار جنگ ۱۸۱
۵۸۔ محمد اختر ۱۸۵
۵۹۔ عرش ملیسانی ۱۹۰
۶۰۔ جانباز مرزا ۱۹۲
۶۱۔ علم الدین سالک ۲۱۰
۶۲۔ جسٹس ایس اے رحمان ۲۱۹
۶۳۔ سندباد جہازی ۲۴۱
۶۴۔ غلام رسول مہر ۲۶۱
۶۵۔ ابوالحسن ندوی ۲۶۵
۶۶۔ عبدالرزاق کانپوری ۲۷۲

واشاریہ ــــ موضوعات ــ ۲۶۴

اسمار

کتب، ادارے

عرضِ مرتب

علامہ کی حیات اور فکر پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ تو علامہ کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ لیکن اِن کی متفرق تحریروں کی تدوین کا کام علامہ کی وفات کے بہت دیر بعد شروع ہوا۔ نظم و نثر کی ان باقیات کے ساتھ ساتھ علامہ کے ملفوظات اور ان سے ملنے والوں کے تاثرات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بھی وجود میں آیا۔ جس سے ایک طرف تو علامہ کے فکری ارتقاء کی متعدد کڑیاں واضح شکل میں ہمارے سامنے آئیں اور دوسری طرف اِن کی سوانح حیات کے متعدد نئے گوشے پہلی بار منظرِ عام پر آئے۔ علامہ سے ملنے والوں نے اپنے تاثرات قلمبند کرنے کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا۔ اس ضمن میں محمود نظامی کی مرتب کردہ "ملفوظات اقبال" کو اوّلیت حاصل ہے۔

اس مجموعے کے بعد روزگارِ فقیر کے مولف فقیر وحیدالدین نے بھی اپنی کتاب کی بنیاد شخصی تاثرات پر رکھی۔ پروفیسر رحیم بخش شاہین کی مرتب کردہ کتاب "اوراقِ گم گشتہ" میں بھی اس سلسلے کا خاصا مواد موجود ہے۔ مصباح الحق صدیقی کی مرتب کردہ کتاب "اقبال اپنوں کی نظر میں" اور ایم ایس ناز کی تالیف "اقبال کے ہم عصر" اس ضمن میں تازہ ترین کاوشیں ہیں۔ اگرچہ موخر الذکر کتاب کے بعض مضامین بالکل وہی ہیں جو ملفوظات اقبال میں شامل ہیں۔ پھر بھی بعض اعتبار سے یہ کتاب اقبالیات میں ایک مفید اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں جب تک علامہ کے تمام مضامین، خطوط، بیانات اور نظمیں دریافت نہیں ہوجاتیں اُس وقت تک علامہ کی سوانح اور افکار کے ضمن میں کوئی حتمی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ اس ضمن میں اقبال سے ملنے والوں کے تاثرات اور یادداشتیں بھی (ثانوی ماخذ کے طور پر) بے حد مفید ہوسکتی ہیں۔ "اقبال کے

ہم نشین" کی تالیف کا محرک یہی خیال رہا ہے۔

اس کتاب کی "تالیف میں یہ اصول پیش نظر رہا ہے کہ کوئی ایسی تحریر شامل نہ کی جائے جو محولہ بالا اس نوع کے دیگر باقاعدہ مجموعوں میں پہلے سے شامل ہو۔ تاہم اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ راقم ان تحریروں میں انتخاب کے اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے تمام تر تعصبات کو ایک طرف رکھ کر، ہر طرح کی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے یہ اس سلسلے کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ مرحلہ وار پروگرام کے تحت اس نوع کی دیگر تحریروں کو بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ان یادداشتوں کے علاوہ ۷۲ مضامین پر مشتمل ایک دوسرا مجموعہ بھی تدوین کے مراحل میں ہے۔ جو عنقریب شائع ہو جائے گا۔ تیسری جلد میں ان حضرات کی یادداشتیں شائع کی جائیں گی جنہوں نے اپنے تاثرات انگریزی زبان میں قلمبند کئے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ چوتھی جلد کا مواد بھی تب تک فراہم ہو جائے۔

زیرِ نظر کتاب میں بعض مضامین جامع ہیں اور بعض بے حد مختصر بعض حضرات نے برسبیل تذکرہ علامہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح کے تاثرات کا حوالہ اگرچہ فہرست مضامین میں ایک علیحدہ حصے کے طور پر موجود ہے تاہم بعض مجبوریوں کی بنا پر انہیں مختلف مضامین کے اختتام پر خالی جگہ میں مناسب مقام پر شامل کر لیا گیا ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں، عمومی تاثرات اور یادداشتیں ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ انہیں زمانی اعتبار سے درج کیا جائے تاکہ علامہ کے ذہنی ارتقاء اور سوانح کو زمانی پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ دوسرے حصے میں ان کے اہل خانہ کی یادداشتیں ہیں جس سے اندرون خانہ علامہ کے معمولات کی بعض نئی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ تیسرا حصہ جزوی تاثرات پر مبنی ہے۔

مضامین کی فراہمی کا کام تو مختلف اوقات میں جاری رہا لیکن سب سے زیادہ مدد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) پروفیسر عبدالجبار شاکر (شیخوپورہ)

رشید اختر (حضرو) اور خواجہ اسد مرحوم کے کتب خانہ "میر اکتب خانہ" واقع حضرو سے ملی۔ راقم اِن حضرات کے تعاون کا تہ دِل سے شکر گزار ہے۔ اِن حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی تحریریں اس کتاب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اس کتاب کے لئے گراں قدر دیباچہ لکھ کر بے حد ممنون کیا۔ اِن کے بے پایاں احسانات کا شکریہ الفاظ میں کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ مکتبہ کلس کے مختار عمر صاحب اس لحاظ سے ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہی کی کاوشوں سے یہ تحریریں محفوظ اور مبسوط شکل میں ہم تک پہنچ رہی ہیں۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس نوع کی دیگر تحریروں کے بارے میں آگاہ کریں تاکہ انہیں بھی کتابی شکل میں پیش کیا جا سکے۔

صابر کلوروی

شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد
۱۵ر نومبر ۱۹۸۵ء

پیش لفظ

معاصر عالمی شخصیات میں کم ہی ایسے لوگ ہوں گے، جنہیں کسی دنیوی منصب کے بغیر، محض اپنی شخصیت کے سحر اور اپنے افکار و شاعری کے بل بوتے پر ایسی عزت و مقبولیت اور ناموری حاصل ہوئی ہو، جیسی علامہ اقبال کے حصے میں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک اسطوری شخصیت (Legend) بن چکے تھے — ان کی شاعری کا شہرا چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا اور شعرِ اقبال کے اسیر دور دور سے ان کی ملاقات و زیارت کو آتے اور ان کی گفتگو کے چشمۂ صافی سے اپنے اپنے ذوق و ظرف کے مطابق سیراب و فیضیاب ہوتے۔ ان کے ملاقاتیوں میں بقول م ش موچی گیٹ کے کباب فروشوں سے لے کر، اسلامی دنیا کے علما و فضلا، اور عالمی مستشرقین تک شامل ہوتے — علامہ، ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرتے — وہ علم و حکمت کے بحرِ بے کراں تھے۔ اور ان کی صحبت میں شعر و ادب، فلسفہ و حکمت، تہذیب و تمدن سیاست، تاریخ و عمرانیات، غرض دنیا بھر کے علوم اور مسائل و موضوعات پر بحث ہوتی۔ علامہ کی خدمت میں سوالات پیش کیے جاتے، اور وہ اُن کے برجستہ و بے ساختہ جواب عنایت کرتے۔ بقول تاثیر، ایسی خیال افروز گفتگو ہوتی کہ ہر ملاقات میں کئی نئی کتابیں لکھنے کا مواد ہوتا تھا۔" اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ ملفوظات ایک نابغۂ عصر کے عمر بھر کے مطالعے و مشاہدے، ایک خلاقانہ ذہن کے غور و فکر اور ایک بھرپور زندگی بسر کرنے والے شخص کے عملی تجربات کا نچوڑ تھے۔

حکیمانہ و فلسفیانہ افتادِ طبع کے سوا، علامہ کی شخصیت و طبیعت کا ایک اور اہم رُخ اِن کی ظرافت ہے۔ وہ ایک حاضر جواب، برجستہ گو اور بذلہ سنج شخص تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں طبیعت لہراتی، تو اُن کی زبان سے ظرافت ایسی پھلجھڑیاں چھوٹتیں اور ایسے بے ساختہ

لطائف اُمڈتے کہ محفل قہقہوں سے گونج اُٹھتی۔ خاص طور پر چوہدری شہاب الدین کو دیکھ کر ان کی طبیعت بے اختیار گدگدا اُٹھتی۔ ہر ملاقات پر وہ اِن پر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور چست کرتے۔ اُن کے بارے میں علامہ کے بہت سے لطائف مشہور ہیں۔ چراغ حسن حسرت راوی ہیں کہ ایک روز چوہدری شہاب الدین سے کہنے لگے۔

"چوہدری صاحب، آپ سچے مسلمان ہیں۔"

خواجہ صاحب نے ذرا متعجب ہو کر پوچھا: "آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟"

علامہ نے کہا، "مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ اور بحمداللہ آپ کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔" (خیال رہے کہ چوہدری شہاب الدین کی رنگت خاصی سیاہ تھی)

علامہ کی گفتگو بالعموم پنجابی میں ہوتی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں پنجابی زبان میں چوہدری شہاب الدین پر کوئی پھبتی کستے ہوں گے یا کوئی لطیفہ بیان کرتے ہوں گے تو قہقہوں کی کیا صورت ہوتی ہوگی۔

علامہ کے ملفوظات کو اُن کی خدمت میں حاضر رہنے والے ان کے متعدد دوستوں، نیازمندوں اور عام ملاقاتیوں نے قلم بند کیا ہے۔ یہ یادداشتیں محض علامہ کے اقوال و اشارات تک محدود نہیں، اور ان سے شاعرِ مشرق کے حکیمانہ ذہن ان فکر رسا اور اُن کی طبع ظریفانہ ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اِن میں ہم اِن کی مجموعی پسند و ناپسند، اُن کے اکل و شرب ان کے ملبوسات، نشست و برخاست، عادات و اطوار اور مشاغل و مصروفیات اور ان کی مجموعی شخصیت اور اقبال بحیثیت شخص کو زیادہ قریب سے اور گہرائی سے دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کھانے میں انہیں بعض خاص چیزیں پسند تھیں، مگر طبیعت میں ایسی سادگی تھی کہ جو کچھ مل جاتا، خاموشی سے کھا لیتے، اور کبھی کھانے میں مین میخ نہ نکالتے، البتہ نمکین کشمیری چائے بہت رغبت سے پیتے تھے۔ پھلوں میں انہیں آم بے حد پسند تھا۔ ایامِ علالت میں ان کے معالج حکیم نابینا نے آموں کے استعمال پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مگر علامہ کے اصرار پر انہوں نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک روز

عبدالمجید سالک عیادت کے لئے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز پر خاصا بڑا، کوئی ایک سیر وزنی آم رکھا ہے۔ سالک نے کہا یہ تو بدپرہیزی ہے۔ کہنے لگے۔ حکیم صاحب نے ایک آم کھانے کی تو اجازت دے رکھی ہے اور یہ، بہرحال ایک ہی آم تو ہے۔"

طبعاً انہیں انگریزی لباس پسند نہیں تھا۔ انگریزی لباس وہ بہ کراہت اور مجبوراً زیب تن کرتے۔ عدالت سے لوٹتے ہی اُسے اتار پھینکتے، اور ڈھیلا ڈھالا پنجابی لباس (موسم گرما میں بالعموم تہ بند اور دھوتی) پہن کر چارپائی پر نیم دراز حقہ "گڑگڑانے لگتے۔ ان کے نزدیک لباس نمائش کا ذریعہ نہیں، اس کی اصل اہمیت اس کی پوشش میں ہے۔ ایک بار اُن کے لئے رضائی تیار کی جانے لگی تو اُنہوں نے ہدایت کی کہ استر، کھدر کا ہونا چاہیئے۔ کسی نے کہا، آپ کے پاس دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ کھدر کے استر والی رضائی کچھ جچے گی نہیں۔ علامہ نے کہا۔ لباس اور بستر دکھاوے کے لئے نہیں، اپنے آرام کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ استر کھدر ہی کا بنوایا۔

علامہ اقبالؒ ایک دل کش ترنم کے مالک تھے، مگر عام شعراء کے برعکس وہ حاضرین کو شعر سنانے کے شائق نہ تھے۔ فرمائشوں سے تنگ آکر اُنہوں نے ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ بعد کے دور میں کم ہی لوگ ان کی خوش آہنگی سے لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل کر سکے۔

اِن کی شخصیت کی دل کشی اور سحر، ملاقاتیوں کو بہت جلد اپنا اسیر بنا لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے نیازمند جب علامہ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبالؒ سے ملاقات وصحبت، ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ تھی، جس سے وہ محروم ہو گئے

تیسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء سے واپسی پر علامہ اسپین جانے والے تھے، اُنہوں نے کرنل بشیر حسین زیدی کو اس سفر میں ساتھ چلنے کی دعوت دی، کرنل صاحب بعض ناگزیر مجبوریوں، اور غالباً یہ سببِ ملازمت ساتھ نہ دے سکے۔

وہ آج بھی اس محرومی کا، نہایت تاسّف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

علامہ سے ملاقاتوں کی اِن یادداشتوں میں ہمیں اِن کی دردمندی، انکسار اور سادگیِ مزاج کے بہت سے پہلو نظر آتے ہیں۔ خواجہ غلام السیدین کا بیان ہے کہ بھوپال میں قیام کے دوران میں، جمعہ کے روز جب وہ نماز کے لئے جامع مسجد میں جایا کرتے۔ تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے، اور اُن سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے اور باتیں کرتے رہتے ——— اسی طرح کم ہی ایسا ہوتا کہ اُن کے ہاں سے کوئی حاجت مند مایوس و نامراد لوٹتا ہو۔ حتیٰ کہ جو لوگ تجارتی اغراض یا کسی اور مصلحت کے پیشِ نظر اپنی کسی تصنیف پر رائے چاہتے، یا کسی نوکری کے لئے کوئی سند یا سفارشی رقعے کے لئے حاضر ہوتے، وہ بھی بالعموم اپنے مقصد میں کامیاب واپس جاتے۔ چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں کہ ایسے موقع پر وہ بالعموم کہتے: خود لکھ لاؤ۔ میں دستخط کر دوں گا ——— اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے، بلکہ جو کچھ کوئی کر لاتا تھا، اس پر دستخط کر دیتے تھے ——— علامہ کی شخصیت کا یہ پہلو، ان کی عمومی انسانی ہمدردی اور فراخ دلی کا مظہر ہے۔

علامہ کی شعر گوئی کا انداز کیا تھا؛ وہ شعر کیسے کہتے تھے؛ کیسے املا کراتے تھے؛ اِن کا انداز نشست و برخاست کیا تھا؛ اُن کے شب و روز کے معمول کیا تھے؛ ان کی معاشرتی زندگی کیسی تھی؛ عادات مطالعہ کیا تھیں؛ اجنبیوں سے کس طرح پیش آتے تھے؛ آزادیِ ہند اور ملی مفادات کا کیسا احساس رکھتے تھے؛ اسباب زوال اُمت ان کی نظر میں کیا تھے؛ اور نشاۃ ثانیہ کے لئے اُن کے ذہن میں کیا پروگرام تھا؛۔

یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہمیں اُن مضامین میں ملتا ہے، جو اُن کے عقیدت مندوں اور مدّاحوں نے لکھے ——— اس طرح کی تحریروں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ایسے اصحاب کے مضامین، جنہیں برسہا برس تک علامہ کی ہم نشینی حاصل رہی۔ اِن میں سے بیشتر اصحاب اُن کے ہم عمر، ہم عصر یا اُن کے بے تکلف احباب میں سے تھے۔ اس نوع کے بیشتر مضامین خاصے جامع اور مفصل ہیں اور

علامہ کی شخصیت کا بھرپور نقش پیش کرتے ہیں، ایسے مضامین زیادہ تر "ملفوظاتِ اقبال" (مرتبہ: محمود نظامی) شامل ہیں۔

۲۔ بعض علمی و ادبی شخصیات (اور علامہ کے چند غیر معروف عقیدت مندوں) نے حضرت علامہ سے اپنی معدودے چند ملاقاتوں پر مبنی یادداشتیں قلم بند کیں ـــــ ان میں ملفوظات و فرمودات کا حصہ تو بہت زیادہ نہیں، مگر وہ تاثرات قابلِ توجہ ہیں، جو علامہ کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں ان مشاہدات سے ہمیں علامہ کے پورٹریٹ کے خدوخال واضح کرکے اسے مکمل کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

۳۔ بعض اصحاب نے اپنی خودنوشتوں یا دیگر تحریروں میں ضمناً کسی ایک ملاقات یا علامہ کے بارے میں کسی یاد کا مختصر اور سرسری ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی علامہ کی شخصیت کا تاثر ابھرتا ہے۔

"ملفوظاتِ اقبال" علامہ اقبال سے متعلق یادوں اور یادداشتوں کا اوّلین اور بنیادی مجموعہ ہے۔ ایم ایس ناز کے مرتب مجموعے "اقبال کے ہم صفیر" میں بھی بعض مضامین جمع کئے گئے ہیں، مگر دوسری اور تیسری نوعیت کی بیسیوں تحریریں اخبارات و رسائل اور کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ پروفیسر صابر کلوروی نے بڑی کاوش کے ساتھ ایسی قیمتی تحریروں کا سراغ لگایا، اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں مفصل مقالات کے ساتھ ساتھ، بعض تراشے بھی شامل ہیں، جو اپنے اختصار کے باوجود تاریخی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ـــ مصنفین کی فہرست پر نظر ڈالیں تو اقبال کی مقناطیسی شخصیت اور اُن کے فکر و شعر کی غیر فانی تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے ـــ ان میں عبدالماجد دریابادی، خواجہ غلام السیدین، رئیس احمد جعفری شورش کاشمیری، نواب مشتاق احمد خاں، شیخ محمد عبداللہ، اسلم جیراج پوری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر محمد مجیب جیسے نامور اور معروف اکابر کے ساتھ علامہ کے بعض ایسے غیر معروف اور گم نام عقیدت مندوں کے نام بھی شامل ہیں۔ جو اپنی ذاتی حیثیت میں غیر معروف، بلکہ گم نام ہیں مگر لوہا بھی اس سے چھو جائے تو سونا بن جاتا ہے۔

اِن طویل اور مختصر تحریروں اور تاثرات کو قلم بند کرنے والوں کے نام، علامہ کے حوالے سے، تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہ جائیں گے۔

پروفیسر صابر کلوروی نے مرتبین کے شیوۂ عمومی (رسائل وکتب سے مضامین نقل یا فوٹو اسٹیٹ کرا کے کاتب کے حوالے کر دینے) کے برعکس، اِن تحریروں کو غور سے پڑھا، دیکھا اور تشریح طلب امور کی، ذیلی حواشی میں وضاحت کی اور بعض تنقیح طلب روایات پر نقد و جرح کرتے ہوئے صحیح صورت حال پیش کر دی۔ اس ترتیب و تدوین کے ساتھ، زیرِ نظر مجموعے میں تحقیق و تلاش کا عنصر بھی شامل ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو اقبال کی عظیم شاعری، اور ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ فکر کے ساتھ اِن کی شخصیت سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے، اِن مضامین کو پڑھتے ہوئے قاری کے سامنے حضرتِ علامہ کی شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے ایک طرف تو یہ کتاب بجائے خود سوانحی اہمیت رکھتی ہے، (علمائے اقبال کے لئے اِن تحریروں کی حیثیت قیمتی لوازمے کی ہے) تو دوسری طرف عام قارئین کے لئے اصل اقبال تک رسائی کا نہایت آسان اور یقینی ذریعہ ہے۔

پروفیسر صابر کلوروی، قبل ازیں "اشاریہ مکاتیب اقبال" کے نام سے اقبالیاتی تحقیق کے ضمن میں ایک مفید تصنیف شائع کر چکے ہیں، ان کی زیرِ نظر تالیف بھی، اقبالیات کے ایک بنیادی تقاضے کی جانب قابلِ قدر پیش رفت کا باعث ہوگی۔

توقع ہے، اس پسِ منظر میں صابر کلوروی صاحب کی اس کاوش کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

رفیع الدین ہاشمی

یکم مارچ ۱۹۸۵ء

اقبالؒ اور انجمن

غلام محی الدین قصوری

علامہ اقبال سے پہلی ملاقات ۱۸۹۵ء میں ہوئی، میں نے گورنمنٹ کالج لاہور کے سالِ اوّل میں داخلہ لیا، علامہ مرحوم ایم اے (پانچویں سال) میں تھے، وہ نہایت ہنس مکھ اور شفیق دوست تھے، میر غلام بھیک نیرنگ[۱] اور مولوی ضیاء الدین[۲] کی معیت میں ہماری ملاقاتیں علامہ اقبال سے اکثر ہوا کرتی تھیں، علامہ اقبال مجھے ینگ فلاسفر کے نام سے پکارتے تھے، ایم اے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کیا، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہو گئے لیکن میڈیکل ٹیسٹ میں ناکام رہے، یہ عجیب چیز ہے کہ ان کی اس ناکامی پر میں نے انہیں مبارکباد پیش کی۔ میرے نزدیک ایک بہت بڑے انسان کے اس نوکری میں چلے جانے سے خداداد صلاحیتوں کے ضیاع کا اندیشہ تھا، میں نے وہ بات انہیں کس جذبے کے ساتھ کہہ دی تھی، میں آج بھی سوچتا ہوں تو سوائے اس کے کچھ نہیں پاتا کہ میڈیکل ٹیسٹ میں ناکامی پر حضرت علامہ کو مبارکباد کہلوانے میں قدرت ہی کا منشا تھا، حیرانی کے علاوہ مجھے آج بھی مسرّت ہوتی ہے کہ یہ سعادت میرے حصّہ میں آئی۔

کچھ زمانہ بعد جب تعلیم سے فراغت ملی تو علامہ مرحوم سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، میں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، اُس میں ایک جگہ میرے الفاظ یہ تھے "علامہ اقبال کی ذات میں تقدّس آ رہا ہے"۔ ایک صاحب نے اس مضمون کے جواب میں لکھا کہ صاحبِ مضمون کو (مجھے) تقدس کے معنی نہیں آتے۔ خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری یہ دوسری بات بھی درست نکلی، حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حضرت علامہ مرحوم کو بے پناہ عشق تھا، حضور نبی کریم (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

کا اسم گرامی سن لیتے تو قلب پر رقت طاری ہو جاتی، اس سے زیادہ تقدس اور کیا ہو سکتا ہے کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب گئے تھے، علامہ مرحوم نے ایک نظم میں میرا نام لے کر مجھے احیائے دین کے لیے ملت کی خدمت کرنے کی بشارت دی تھی۔

۱۹۱۴ء میں مجھے جرمن فلاسفر برن ہارڈی کے خیالات پڑھنے کا موقع ملا، اس نے اپنی تعلیمات سے سپرمین اور سپر نیشن کا پرچار کیا، چونکہ علامہ مرحوم اپنے بعض اشعار میں اسی نوع کے مضامین باندھتے تھے، اس لئے مجھے اپنی کم علمی کے باعث یہ خیال پیدا ہوا کہ علامہ مرحوم کی تعلیم جرمنی میں ہوئی اس لیے انہوں نے جرمن فلاسفر نیٹشے سے اس تخیل کو مستعار لیا ہے لیکن بعد میں جب میں نے قرآنِ کریم کے اسرار و رموز پر غور کیا تو مجھے پتہ چلا کہ حضرت علامہ کے ان تصورات کا سرچشمہ کلامِ پاک تھا۔ کلامِ پاک میں مردِ مومن اور امتِ مسلمہ کو اسی انداز میں خطاب کیا گیا ہے اور جرمن فلسفیوں کے یہ تصورات کتابِ مبین ہی سے لیے گئے ہیں۔

میں جب انجمن حمایتِ اسلام کے جائنٹ سیکرٹری اور بعد میں سیکرٹری کی حیثیت سے دینی خدمات انجام دیتا تھا، علامہ مرحوم انجمن کے جلسوں میں تشریف لایا کرتے تھے ان کی ولولہ انگیز نظمیں ہمارے پروگرام کا مستقل حصہ تھیں، علامہ مرحوم کا انجمن سے اتنا شغف تھا کہ وہ کسی اور جگہ اس نوع کی قومی نظمیں ماسوائے انجمن کے پلیٹ فارم کے نہیں پڑھتے تھے، اگر کوئی شخص ایسا کرنے کی درخواست کرتا تو اسے بتا دیتے کہ وہ صرف انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجتماع میں نظم پڑھیں گے، یہ ان کی وضع داری اور دینی کاموں سے لگن کا ثبوت ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے علامہ مرحوم نے انجمن کے سالانہ جلسہ میں پہلی نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ ان دنوں جو سماں حضرت علامہ کے کلام سے بندھ جاتا تھا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اگر میں یہ کہوں کہ ان کا بیشتر کلام قرآن حکیم کی تفسیر ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

میری خواہش تھی کہ حضرت علامہ کا کلام نہایت عمدہ اور وسیع پیمانے پر شائع کرا کے ارزاں داموں اپنی قوم کے افراد تک پہنچایا جائے، چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد میں نے

اس موضوع پر ایک خط وزارتِ تعلیم کو بھیجا تھا، اس میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ علامہ مرحوم کی بعض نظموں کا اِنتخاب شائع کر کے سکولوں اور کالجوں میں رائج کر دیا جائے، مرحوم کے منتخب کلام کے کتابچے بھی تقسیم ہونے چاہئیں تاکہ وہ انہیں یاد کر کے گلی کوچوں میں الاپتے پھریں، میری یہ پختہ رائے اب بھی ہے کہ حضرت علامہ کا کلام نئی پود میں اسلام کا ولولہ اور دین سے لگن پیدا کرنے میں نہایت سُود مند ہوگا، علامہ مرحوم کی تصانیف کو شائع کرنے کی ذمہ داری حکومت کو اٹھانی چاہیئے۔

ایک مرتبہ حضرت علامہ کی خدمت میں گذارش کی کہ ہمیں یہاں ایک ایسی لائبریری قائم کرنی چاہیئے جس میں دوسری زبانوں میں اسلام کے موضوع پر مطبوعہ لٹریچر کو جمع کیا جائے اسلامی افکار کی تحقیق اور دوسرے ملکوں میں اس کی اشاعت کے لیے یہ دارالمطالعہ قائم کرنے پر حضرت علامہ نے رضامندی کا اظہار فرمایا لیکن قبل از مرگ علالت کے باعث وہ اس کام پر توجہ نہ دے سکے۔ میری تمنا ہے کہ اس نوع کا کتب خانہ ہمارے یہاں ضرور ہونا چاہیئے، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم دین سے متعلق لٹریچر کے خزانہ سے مالا مال ہوں[۴]

حواشی

[۱] غلام بھیک نیرنگ۔۔۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے، انبالہ کے رہنے والے، کالج میں علامہ سے دو سال پیچھے تھے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

[۲] مولوی ضیاء الدین۔۔۔ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی جو نیرنگ اور علامہ کے مشترکہ دوست تھے یہ دونوں حضرات مولوی صاحب کے گھر جا کر اکھاڑے میں کُشتی کی مشق کرتے تھے۔

[۳] نالۂ یتیم۔۔۔ یہ نظم اب علامہ کے کلیات میں موجود نہیں، سرودِ رفتہ، مرتبہ غلام رسول مہر میں شامل ہے، ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں پڑھی۔

[۴] شائع شدہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء

علامہ اقبالؒ میری نظر میں

سر ظفر اللہ خان

میرے طالبعلمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر رابسن (ROBSON) اور وائس پرنسپل مسٹر ہیمی (HEMMY) تھے، اوّل الذکر انگریزی اور مؤخر الذکر طبیعات پڑھاتے تھے، ان کے علاوہ قابلِ ذکر اساتذہ میں لیفٹیننٹ کرنل سٹیفن (STEPHENSON) مسٹر بریٹ (BRET) مسٹر وادن (WATHEN) مسٹر جونز (JONES) مسٹر گولک ناتھ چیٹرجی، لالہ جیارام، شیخ نور الٰہی، مرزا محمد سعید، لالہ رچی رام، مسٹر چاولہ، مسٹر مکند لعل، لالہ چیتن انند، مسٹر لینگ ہارن (LANG HORN) مسٹر رام پرشاد کھوسہ، مسٹر تاج محمد خان اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام ہیں۔ مسٹر بریٹ کے کالج چھوڑنے کے بعد ان کی جگہ ڈاکٹر سر محمد اقبال فلسفے اور انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے، وہ بیرسٹری کی پریکٹس بھی کرتے تھے اور ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۱ء تک کالج میں بھی پڑھاتے تھے[1] فلسفہ تو میرے مضامین میں شامل نہ تھا لیکن دو سال مجھے ڈاکٹر صاحب سے انگریزی پڑھنے کا فخر حاصل ہو گیا، ڈاکٹر صاحب ہمیں انگریزی نظم پڑھاتے تھے اور بہت محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے، مشکل مقامات کو اچھی طرح واضح فرما دیتے تھے۔

[علامہ سے دوسرا تعلق ان کے برادر زادے (شیخ عطا محمد کے فرزند) کے توسط سے تھا] شیخ اعجاز احمد[2] اسلامیہ کالج سے بی اے پاس کرنے کے بعد لاء کالج میں داخل ہوئے تھے، مجھے شیخ عطا محمد صاحب سے نیاز حاصل تھا، علامہ ممدوح کا تو میں شاگرد بھی تھا اور اب ان کا جونیئر ہم پیشہ بھی تھا، لیکن شیخ اعجاز احمد صاحب سے اس وقت تک دور کی صاحب سلامت تھی، چوہدری بشیر احمد صاحب کے ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔

شیخ اعجاز احمد صاحب جب ایل ایل بی کلاس میں تھے تو انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ مضامین کی تیاری میں بھی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کوئی صورت نہیں، اگر آپ کچھ وقت دے سکیں تو میں آپ کے پاس آکر مشکل مقامات حل کرلیا کروں۔ میں نے کہا کوئی خاص وقت مقرر کرنا تو مشکل ہے آپ اپنی رہائش ہی میرے ہاں منتقل کرلیں، جب بھی وقت میسر آجایا کرے گا میں آپ کی مدد کر دیا کروں گا، چنانچہ ان کی رہائش کا انتظام دفتر کی عمارت کی تیسری منزل میں کر دیا گیا جہاں ایک آرام دہ کمرہ میسر تھا۔

میاں سر فضل حسین صاحب ۱۹۲۱ء میں پنجاب کی حکومت میں وزیر مقرر ہوئے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ انہوں نے یونینسٹ پارٹی قائم کی، یہ پارٹی اقتصادی اصولوں کی بناء پر قائم کی گئی تھی، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب اپنی سہ سالہ رکنیتِ مجلس کے دوران میں اس پارٹی کے رکن رہے۔ شیخ سر عبدالقادر صاحب، شیخ دین محمد صاحب اور کئی دیگر معززین شہری طبقہ میں سے وقتاً فوقتاً اس پارٹی کے قابلِ احترام رکن رہے۔

۱۹۲۶ء میں جب میں پنجاب کی کونسل کے لیے منتخب ہوگیا۔۔۔ ایوانِ مجلس میں جو نشستوں کی ترتیب تھی اُس کے مطابق میری نشست علامہ سر محمد اقبال صاحب اور مولوی سر رحیم بخش صاحب کے درمیان تھی، مجلس کا پہلا اجلاس جنوری ۱۹۲۷ء کے اوائل میں شروع ہوا، چوہدری سر شہاب الدین صاحب صدرِ مجلس تھے۔

۱۹۳۰ء میں وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستان کے آئینی مستقبل پر از سرِ نو غور کرنے کے لیے لندن میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی، رسمی افتتاح اور خوش آمدید کے تقریروں کے بعد سب سے پہلا فیصلہ جو پہلی گول میز کانفرنس نے کیا وہ یہ تھا کہ برما کی ہندوستان سے علیحدگی کو اصولاً تسلیم کر لیا گیا۔ (اس کانفرنس میں) ہز ہائی نس سر آغا خان صاحب، مستقبل کے قائداعظم اور بانیٔ پاکستان مسٹر جناح، مولانا محمد علی صاحب اور دوسری اور تیسری کانفرنس کے دوران میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب، میاں سر محمد شفیع صاحب، سر سید سلطان احمد صاحب، مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب کی صحبت کا میسر آنا بھی میرے لیے غنیمت اور باعثِ فخر تھا، ان کے علاوہ ہز ہائی نس، نواب صاحب بھوپال،

نواب سر اکبر حیدری صاحب، سر مرزا اسمٰعیل صاحب جیسے حکمرانوں اور مدبّروں کے ساتھ اگر تبادلۂ خیال نہیں تو کم سے کم ان کے نتائجِ فکر سے آگاہی ہوئی۔

لندن میں ان کا (اقبال) ورود وہاں کے فلسفی، مستشرقین اور ادبی حلقوں میں بہت دلچسپی کا موجب رہا۔ والڈارف ہوٹل میں آپ کے اعزاز میں وسیع پیمانے پر استقبالی دعوت کا انتظام ہوا، ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے اور نئے احبّا کی ملاقاتوں سے بہت محظوظ ہوئے لیکن کانفرنس کی سُست رفتاری سے ان کی طبیعت بہت اکتائی رہی۔

قائداعظم مسٹر جناح نے پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر ہندوستان واپسی کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور لندن میں ایک پُرفضا مقام پر ایک مکان میں رہائش اختیار کر کے پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی تھی، پہلی گول میز کانفرنس کی کاروائی سے وہ مطمئن نہیں تھے، دوسری گول میز کانفرنس کی کاروائی بھی ان کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب نہ ہو سکی۔

تیسری گول میز کانفرنس کے مندوبین کا انتخاب ان دنوں ہوا جب میں میاں فضل حسین صاحب کی رخصت کے سلسلہ میں قائم مقام ممبر وائسرائے کونسل تھا۔ وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں میں نے جو نام مسلم وفد کی رکنیت کے لیے پیش کئے ان میں سے ایک تو وائسرائے نے فوراً بلا تامل رَدّ کر دیا باقی ناموں پر میرے رفقاء نے اتفاق کیا اور ان کے نام غیر مسلم نمائندگان کے ناموں کے ساتھ وزیرِ ہند کی خدمت میں بھیج دیئے گئے، وزیرِ ہند نے میرے تجویز کردہ ناموں میں سے دو کے متعلق اختلاف کیا (قائداعظم) مسٹر جناح کے متعلق تو لکھا "وہ ہر بات پر تنقید تو بہت کڑی کرتے ہیں لیکن کوئی اثباتی حل پیش نہیں کرتے، اب انہوں نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے، ہندوستان کے معاملات کے ساتھ ان کا براہِ راست تعلق نہیں رہا"، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے متعلق لکھا "وہ دوسری گول میز کانفرنس میں تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے کانفرنس کے دوران میں ایک لفظ بھی نہیں کہا"، میں نے دونوں اصحاب کی شمولیت پر پُرزور اصرار کیا اور وائسرائے نے میری معروضات وزیرِ ہند کی خدمت میں بھیج دیں، بالآخر

وہ ڈاکٹر صاحب کو شامل کرنے پر تو رضامند ہو گئے لیکن مسٹر جناح صاحب کے متعلق میری سعی ناکام رہی[۳]

حواشی

[۱] اس ضمن میں کالج کے پرنسپل نے عدالتِ عالیہ کے مشورہ سے یہ انتظام کیا تھا کہ علامہ کے مقدمے آخری وقت میں پیش ہوں تاکہ وہ صبح کے اوقات میں کالج میں لیکچر دے سکیں۔

[۲] علامہ اقبال کے بھتیجے اور شیخ عطا محمد کے فرزند: علامہ کا خاصا قرب حاصل رہا: "روزگارِ فقیر" نامی کتاب میں زیادہ تر یادداشتوں کے راوی اور ماخذ ہیں: ۱۲ جنوری ۱۸۹۹ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے: وکالت کے بعد جج بنے، پھر حکومتِ ہند کے محکمہ خوراک میں رہے: علامہ نے ان کے نام متعدد خطوط لکھے ہیں زیادہ تر خطوط غیر مطبوعہ حالت میں ہیں، صرف تین خطوط "خطوطِ اقبال" میں شائع ہوئے ہیں۔

[۳] یہ مضمون سر ظفر اللہ خان کی کتاب "تحدیثِ نعمت" کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا ہے۔ سر ظفر اللہ خان کا انتقال یکم ستمبر ۱۹۸۵ء کو ہوا۔

۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، خان بہادر اکبر حسین صاحب سے ملنے کی غرض سے الہ آباد تشریف لائے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی، شب کے کھانے کے بعد ان سے "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کے اشعار سُنے، ترنم سے پڑھتے تھے اور خوش گلو تھے۔

("عمرِ رفتہ" از نقی محمد خان خورجوی صفحہ ۲۶۴)

حواشی

نقی محمد خان، ایسٹی ۸۸۰ میں خورجہ نزد علی گڑھ پیدا ہوئے، ۱۹۱۳ء میں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے الہ آباد میں تقرر ہوا، اکبر الہ آبادی کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا، انکی یادداشتیں سب سے پہلے ساقی کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئیں۔

میرے بچپن کی سنہری یادا شت[1]

اے رزاق[2]

میرے بزرگ بھائی عبدالقادر صاحب بمبئی کے معزز مونسپل کونسلر تھے۔ کاروباری شغف کے علاوہ ادب اور گیان سے بھی تعلق تھا۔ وہ وسیع النظر انسان تھے۔ اور اخلاق، مذہب اور انسانیت کے بلند اصولوں کے پرستار تھے۔ فلسفے سے ان کے شغف کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے اپنے کاروبار میں تار کا پتہ لفظ 'غالب' رکھا ہوا تھا یہ تمام حقائق ان کے مزاج کی گہرائی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسلامیات اور عربیات ان کی دلچسپی ذوق وشوق اور توجہ کے مرکز تھے۔ ان کے اسی شغف کا ہی نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ہمارے ہاں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے کلام میں سے یہ نظم ؎

چین وعرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
سارے جہان سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ترنم سے سنائی۔ بھائی صاحب نے مجھے ان کی خدمت میں پیش کیا اور میں ان کے حضور باادب حاضر ہوا اور ان کی بزرگی سے متاثر ہوا علامہ کی آواز گونج دار تھی اور جب وہ اپنے کلام کو ترنم سے سناتے تھے تو مجھے بے حد لطف آتا تھا اور میں ان کو بہت اچھا سمجھتا تھا

آج جب کہ وہ نہ صرف ہمارے پاکستان کے افق پر ایک سنہری ستارے کی طرح تاباں ہیں بلکہ اسلام کے افق کو بھی زینت بخش رہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے جو مختصر مواقع ملے ہیں وہ میری زندگی کی تعمیر کے لیے نعمت ہیں۔ علامہ اقبال کا اثر ہر مسلمان کے قلب پر انفرادی طور پر ہے اور تمام مسلمانانِ عالم کی حیات پر مجموعی طور پر ہے جس طرح ہر مفکر کا فلسفہ اپنے

پیروؤں کو متاثر کرتا ہے اقبال بھی آج ہمارے سارے عالم اسلام کو متاثر کرتا ہے:

حوالہ جات

۱؎ شائع شدہ، ساغر کراچی ۲۱ اپریل ۱۹۷۰

۲؎ سیکریٹری آدم جی انڈسٹریز

۳؎ علامہ کے یہ اشعار "ترانہ ملی" کے اشعار ہیں جو بانگ درا میں موجود ہے: یہ شعر یہاں درست طور پر نقل نہیں ہوا:

اسلم صاحب جس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں پڑھتے تھے تو انہیں شاعری کا شوق تھا۔ شعر دلکش کہتے تھے اور اکثر انعامات بھی شاعری کی بدولت ملے۔ ڈاکٹر اقبالؒ اس زمانہ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور اسلم صاحب کے خاص کرم فرما۔ ان کے ادبی ذوق کو ڈاکٹر اقبال ہی نے اُبھارا۔ اسلم صاحب کو نثر لکھنے پر مرحوم ہی نے مائل کیا، ڈاکٹر صاحب سے ان کے تعلقات آخر تک بہت مخلصانہ رہے۔ اسلم صاحب کی معیت میں جب مجھے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلا موقعہ ملا تو اُن کی مہلک بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی، علامہ کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور بولتے تو اُن کے نفس پر زور پڑتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عید کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے گئے تھے، فرش ٹھنڈا تھا، دیر تک بیٹھنا پڑا، سردی کا اثر ہو گیا، آواز بالکل جاتی رہی، اس حالت میں بھی اپنے ملنے والوں سے گھنٹوں باتیں کرتے اور ان کی باتیں اتنی دلکش ہوتیں کہ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھ سے اُردو میں اور اسلم صاحب سے پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔ اسلم صاحب سے جو باتیں ہوئیں ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے باہمی تعلقات کس قدر دیرینہ اور مخلصانہ ہیں علامہ کے انتقال کے بعد اسلم صاحب کے لیے لاہور کی ادبی زندگی ویران ہو گئی۔

(گنجینۂ گوہر)
(از: شاہد احمد دہلوی صفحہ ۱۶۵)

علامہ اقبال سے ایک یادگار ملاقات

شیخ عبدالرحیم ایڈووکیٹ

۱۹۱۳ء کے موسم گرما میں جبکہ ایم او کالج علی گڑھ ابھی یونیورسٹی کے درجہ تک نہ پہنچا تھا راقم الحروف اپنے تین دوسرے ہمسفر طالب علموں کے ساتھ کالج کی انجمن "الفرض" کی طرف سے پنجاب کے چند اضلاع میں چندہ جمع کرنے کے لیے مامور کیا گیا، میرے ساتھیوں میں ایک حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی تھے، جو بعد میں جامعہ ملیہ دہلی کے رجسٹرار ہوئے، ایک محمود احمد صاحب جو مولانا ظفر علیخان مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں عرصہ تک پروفیسر رہ کر مرحوم ہو گئے، اور ایک ڈیرہ غازی خان کے بھاری بھرکم نوجوان محمد اعظم خان مرحوم تھے۔

رہتک، کرنال، امرتسر اور گوجرانوالہ میں ہم نوجوان خوش پوش گداگروں کی ٹولی "تماشائے اہلِ کرم" دیکھ کر جب لاہور پہنچی تو محمود احمد مرحوم نے دفتر اخبار "زمیندار" میں ہم کو کرم آباد کے خوانِ کرم کا مہمان بنا دیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ جن جن مقامات پر فراہمی چندہ کے سلسلہ میں ہم نے قسمت آزمائی کی تھی وہاں بلند مناصب پر جو علی گڑھ ہی کے فیضیافتہ حضرات فائز تھے، انہوں نے بلطائف الحیل ہم کو چائے کی پیالی یا شربت کے گلاس پر ٹرخا دیا تھا، لاہور آکر جب ہم نے اپنے کشکولِ گدائی کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ پائے گدا اگرچہ لنگ نہیں مگر ملکِ خدا فراہمی چندہ کے لحاظ سے تنگ ہوئی ہے، بقیہ وقت کی تنگ دامانی بھی کچھ پریشان کرنے لگی، لہٰذا طے پایا کہ "سوسنار" کو چھوڑ کر یہاں کوئی ایسا "لوہار" تلاش کیا جائے جس کے جود و سخا کی ایک ہی ضرب سے ہزار پانچ سو کے نقرئی سکے ڈھل کر ہمارے کاسۂ گدائی کو بھر دیں۔

حسنِ اتفاق سے انہی ایام میں حیدر آباد دکن کے یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد[1] آنجہانی حضورِ نظام کے زیرِ عتاب ہو کر حیدر آباد کے "داتا" کے دربار سے داتا گنج بخش کے دربار میں حاضری کے لیے اپنے خدم و حشم سمیت ایک مختصر سپیشل گاڑی میں لاہور وارد ہوئے تھے، چنانچہ ہماری کوششیں اسی پر مرکوز ہو گئیں کہ کسی طرح مہاراجہ کی خدمت میں باریابی حاصل ہو جائے، چنانچہ ہم نے اُن دعاؤں کو یاد کرنا شروع کر دیا جن کو "صرفِ درباں" کرنا ضروری تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن پر مہاراجہ کی سپیشل گاڑی ایک طرف کھڑی تھی، شروع میں ہم نے بلا وساطت باریابی کی کوشش کی تو مہاراجہ کے ملازم جن کے سروں پر حیدر آباد کی مخصوص "منصب داری" نمایاں ہوتی، ہم کو یہ کہہ کر ٹرخا دیتے کہ اب "حضور حرم میں ہیں" کبھی یہ کہ اس وقت "حضور خاصہ پر ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ آخر پتہ چلا کہ مہاراجہ کی خدمت میں باریابی کا انتظام ان کا وہ پرائیویٹ سیکرٹری کر سکتا ہے جو شکل و لباس کے لحاظ سے ایک پارسی معلوم ہوتا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ صاحب سید وجاہت حسین لکھنوی[2] ہیں، جن کے دوستانہ مراسم سید جالب دہلوی ایڈیٹر "پیسہ اخبار" سے ہیں، اب ہم سیدھے حضرت جالب[3] دہلوی کی خدمت میں پہنچے تاکہ اس سے تعارفی خط حاصل کر کے پہلے لکھنوی سیکرٹری کو ہموار کریں، جالب دہلوی مرحوم ایک درویش منش، صاحب مروت، مشہور صحافی تھے، انہوں نے فوراً تعارفی خط دے دیا، مگر جب ہم نے ان کی خدمت میں مہاراجہ کی خدمت میں اپنی حاضری کی غرض و غایت بیان کی، تو جالب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "وجاہت حسین صاحب کے نام تو میں نے یہ خط لکھ دیا ہے، مگر خود مہاراجہ شیخ محمد اقبال بیرسٹر سے شاعرانہ ہم مشربی کی وجہ سے گہرے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں، اپنے مقصد میں کامیابی چاہتے ہو تو ڈاکٹر صاحب سے مہاراجہ کے نام ایک سفارشی خط حاصل کرو۔[4]

پیسہ اخبار بیرسٹر بٹ سے انارکلی بازار کا وہ چوبارہ کچھ ایسا دور نہ تھا، جہاں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اپنی وکالت کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ جالب صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ سیدھے انارکلی بازار کے کاشانۂ اقبال میں پہنچے اور طالب علم کی اس سادہ لوحی

سے جاتے ہی قبال کی خدمت میں حرفِ مدعا پیش کر دیا، ڈاکٹر صاحب کی فرشی نشست تھی۔ کمرہ کا سامان اس زمانہ میں بھی نہایت سادہ اور مختصر تھا، یہ چوبارہ ایک وکیل کے دفتر سے بدرجہا زیادہ درویش اور عالم کا نشیمن معلوم ہوتا تھا، اقبال نے اخلاق و مروت سے ہم کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور حرفِ مطلب سے ہم فارغ ہوئے تو مرحوم نے کس قدر تیز و تند لہجہ میں جو کچھ فرمایا اس کے پورے الفاظ تو اب یاد نہیں ــــ مگر اس کا مفہوم اب تک لوحِ دل پر نقش ہے، فرمانے لگے کہ "دیکھو عزیزو! تم جس غرض سے میرے پاس آئے ہو میں اس میں تمہاری کوئی مدد کرنے پر آمادہ نہیں، مہاراجہ کشن پرشاد سے میرے تھوڑے بہت مراسم ضرور ہیں مگر میں ذاتی طور سے اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں کہ قوم کے نوجوانوں سے گداگری کرا کر اسی عمر میں ان کی عزتِ نفس اور علوِ فطرت کو پست اور مجروح کیا جائے"۔ ہم نے جواب میں ادب و متانت مگر نوجوانوں کی خود اعتمادی سے عرض کیا کہ جناب کا ارشاد بالکل بجا ہے، مگر ہم اپنی ذات کے لیے دریوزہ گری نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے غیر مستطیع طالبعلم بھائیوں کی مالی اعانت کے لیے در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، اور پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ اگرچہ ہم اپنی دلی آمادگی اور شوق سے یہ خدمت کر رہے ہیں مگر ہم کو اس کام پر مامور کرنے والے کالج ہی کے اربابِ اختیار مثلاً نواب وقار الملک صاحبزادہ" علامہ نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کسی قدر جوش سے فرمایا" ہاں بھائی مجھے افسوس اور تعجب انہی بزرگوں پر ہے جو تم سے ایسا کام لے رہے ہیں جو تمہاری غیرت و خودداری کو مجروح کرنے والا ہے، آخر خوش حال طالب علم اپنے فیشن و تعیشات سے روپیہ بچا کر خاموشی سے اپنے غریب بھائیوں کی دست گیری کیوں نہیں کرتے۔ اور پھر ایک مسافر اور پریشان حال ہندوستانی سے مسلمان نوجوانوں کا اپنے کالج کے طلباء کے لیے بھیک مانگنا تو میرے نزدیک ذلت و بے غیرتی کی وہ آخری حد ہے جس کو کم از کم میں برداشت نہیں کر سکتا، افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کو اس معاملہ میں مشکور نہیں کر سکتا"۔ ہم کچھ مایوس اور شکستہ خاطر ہو کر اٹھے اور رخصت چاہی، اس پر اقبال مرحوم بھی کچھ متاسف ہوئے، اور ہم "فقیروں کے" دل نوازی کے لیے جیب سے ایک اشرفی نکالی اور ہمارے حوالے کر کے

فرمایا:- WELL-GENTLEMEN THIS IS ALL THE GOLD THAT I POSSESS

اس کے بعد مہاراجہ سرکشن پرشاد کے ہاں ہم نے کیونکر باریابی پائی اور آنجہانی سے کس طرح مبلغ پانچ سو روپیہ کا گرانقدر عطیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، یہ ایک جداگانہ اور خاص دلچسپ کہانی ہے، جس کو کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھنا پڑے گا۔

مگر ۱۹۱۳ء میں ایک گمنام طالبعلم کی خوش نصیبی نے ایک خاص سلسلۂ کار کی تقریب سے علامہ اقبال کی خدمت میں جو چند لمحات عطا کر دیئے، وہ لمحات نہ تھے بلکہ درس و بصیرت کے لمعات تھے جن سے علامہ مرحوم کی فطرت بلند اور فکری عالی کی وہ کرن نظر آئی جو کم و بیش بیس سال بعد ایک مکمل و مربوط نظامِ فکر کی صورت میں ان کی تصنیف "اسرارِ خودی" میں جلوہ گر ہوئی [۴]

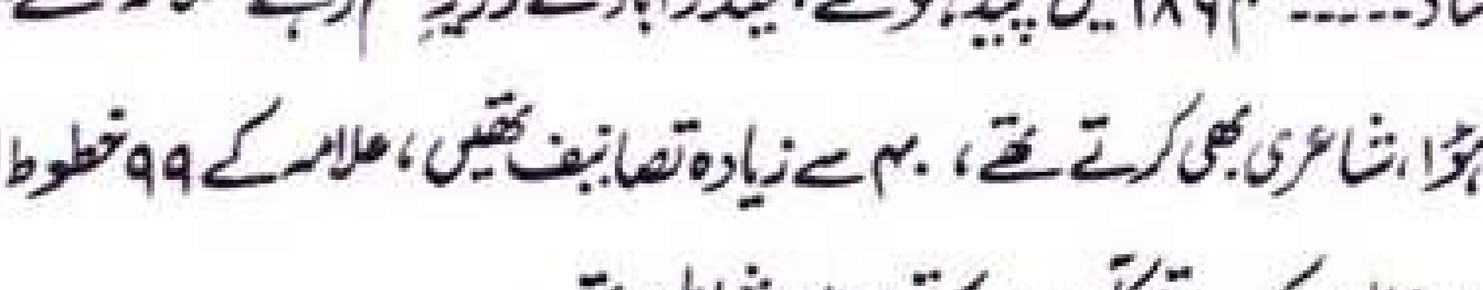

حواشی

[۱] سرکشن پرشاد---- ۱۸۶۴ میں پیدا ہوئے، حیدرآباد کے وزیرِ اعظم رہے، علامہ سے تعلقات کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا، شاعری بھی کرتے تھے، ۴۰ سے زیادہ تصانیف تھیں، علامہ کے ۹۹ خطوط ان کے نام دریافت ہو چکے ہیں، علامہ کے بے تکلف دوستوں میں شامل تھے۔

[۲] سید وجاہت حسین لکھنوی ... حیدرآباد کے مشہور ادیب "باقیاتِ غالب" کے مصنف اور سرکشن پرشاد کے سیکرٹری۔

[۳] جالب دہلوی---- میر بشارت علی جالب دہلوی، پیسہ اخبار کے جائنٹ ایڈیٹر تھے، سفر انگلستان بسلسلہ تعلیم کے لیے علامہ جب دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر پہنچے تو جالب وہاں موجود تھے۔ جالب دہلوی لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ "ہمدم" کے بھی ایڈیٹر رہے، آخر میں اپنا اخبار روزنامہ "ملت" نکالا۔

[۴] شائع شدہ "شہاب" یکم مئی ۱۹۶۰ء

اقبال علیہ رحمۃ اللہ

از آغا حیدر حسن مرزا

دہلی کی بیگماتی زبان کے ماہر، نرم نازک لہجہ اور دلکش اندازِ بیان۔ وہ ہر محفل میں طوطیٔ ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ حیدر آباد کے اعلےٰ طبقے میں بے حد مقبول تھے، لوگ پکڑ کر لے جاتے اور اپنا مہمان بناتے۔ بے ضرر انسان تھے، ان کے منہ سے کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ امیروں کے علاوہ معمولی لوگوں سے بھی ان کا یارانہ تھا، ان کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سُنی گئی۔ سر اکبر حیدری کے دوست تھے۔ آخری زمانے میں سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری ان سے کچھ بدظن ہو گئے تھے۔ علیگڑھ سے انٹرمیڈیٹ کر کے تلاشِ روزگار میں حیدر آباد پہنچے تو سر راس مسعود نے ان کا تعارف سر اکبر حیدری سے کرایا، سر اکبر حیدری کی دلچسپی سے پہلے پولیس کے محکمے میں سب انسپکٹر ہوئے۔ سر راس مسعود نے انہیں نظام کالج میں لیکچرار مقرر کرا دیا، اور لیکچرار کی حیثیت سے پنشن لی۔ انہیں نوادر جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ دکنی اُردو کے نایاب نسخے ان کے پاس تھے۔ آخری عمر میں کچھ عرصہ پیر میں بھی گذارا۔ ۱۹۶۵ء میں ستّر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

(بحوالہ "یادوں کی دنیا" از یوسف حسین خاں)

اقبالؒ کے بارے میں ان کے یہ تاثرات رسالہ "آجکل" ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔

پہلے پہل میں نے چوتھی جماعت میں اقبالؒ کی نظم "پرندے کی فریاد" پڑھی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ اُستادوں کے نام ہدایتیں آئی تھیں کہ نہ کان پکڑوائیں نہ لڑکوں کو مُرغا بنائیں، نہ اٹھک بیٹھک کرائیں، اور نہ اُن کی اُنگلیاں قلموں کے شکنجے میں کسی جائیں، نہ کان مروڑے جائیں، نہ ہاتھوں پر

بیتیں ماری جائیں، اور نہ اُلٹے ہاتھ کرا کے ان پر انگوٹھیوں کی مار پڑے۔ بلکہ بچوں کو کھیل کھلائے جائیں اور نظمیں حفظ کرا کر ان کو گوایا جائے۔ میری چھٹن میں آواز پہنچتا سی تھی۔ میں نے پہلے "پیر نلدمے کی فریاد" حفظ کر کے اور گا کر سنائی، دوسری نظم "بچے کی دعا" یاد کی اور گائی۔ پہلی نظم کا میرے ننھے منے دل پر یہ اثر ہوا کہ لال پدڑیاں، بٹے اور گلدم پالنے کا شوق خاندانی تھا، میں نے پنجروں کی کھڑکیاں کھول کر سب اڑا دیئے اور گلدموں کی پیٹیاں اور پودے کھول ان کو بھی آزاد کیا اور ایسی اس فعل سے خوشی ہوئی کہ شاید کسی بادشاہ کو ملک آزاد کرنے سے نہ ہوگی۔ دوسری نظم جب میں نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر گا کے پڑھی تو میرے ہاں کی تمام مغلانیاں اور مامائیں جو قدیم تھیں چٹ پٹ بلائیں لینے لگیں اور میری دادا حسین خانم نے جھٹ کالا دانہ مجھ پر سے اُتارا۔ میں اپنے جی میں بڑا اترایا کہ آج بھی اس آزاہٹ کا خیال آتا ہے تو دل کا کنول کھل جاتا ہے..... ہاں یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کس کی نظمیں ہیں۔ پہلی دفعہ مخزن میں ان کا مرثیہ مسدس پڑھا اور معلوم ہوا کہ شیخ محمد اقبال کوئی پنجاب کے بیرسٹر ہیں، انہوں نے لکھا ہے۔ میرا گھرانہ زبان کے معاملے میں بڑا تنگ خیال اور کوتاہ نظر تھا، دِلّی میں اپنے سے اچھی اردو کسی کی نہ سمجھتے اور دِلّی سے اچھی اُردو کسی باہر والے کی نہ جانتے۔ مجھے اس مرثیہ کو پڑھ کر شوق ہوا کہ بغداد کے لیے بلبلِ شیراز کے نالے سُنوں اور جہان آباد پر داغ کے خونیں آنسو دیکھوں، تلاش کر کے یہ چیزیں نکالیں اور اس طرح میری ادبی تحقیق کی ابتدا ہوئی۔ البتہ ابن بدرون نے جو غرناطہ میں فریاد کی تھی اُس سے اب تک کان ناآشنا کیا رہے آنکھیں محروم رہیں۔ جس دردِ دل سے انہوں نے معصوموں کے لیے دعا لکھی تھی ویسی ہی قبولیت اس کو روزی ہوئی..... زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری..... ایسی گھڑی میں مانگی گئی کہ قبول ہوئی اور اب اس کے شکریے میں گلنے کو جی چاہتا ہے ع

کہ مثالِ شمع گذری میری ساری زندگانی

ان کا کلام رسالوں میں شوق سے پڑھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا، انگریزی پڑھے لکھوں کی ان کے کلام کے متعلق آراء سُنتا، یہاں تک کہ علیگڑھ کی درسگاہ میں میری خوش قسمتی سے ایسے طالبعلموں میں میل جول ہو گیا جو علی گڑھ کے گرانڈی سمجھے جاتے، ان میں سے ایک صاحب ملک غلام محمد تھے جو آجکل سر غلام محمد ہیں، اُن کو اس زمانے میں سارے ہندوستان کے

مشاہیر کے حالات ازبر تھے۔ اس زمانے میں آجکل کی طرح ہر رہنما، قائد ملت، سیاس، ادیب نقاد، قومی شاعروں کی سوانحعمریاں موجود نہ تھیں۔ البتہ اخباروں اور رسالوں میں ان مشاہیر کے حالات لکھے جاتے، چونکہ یہ اخبار پابندی سے پڑھتے تھے ان کو ان سب کے حالات خوب یاد تھے اور اپنی اس ہمہ دانی کا رعب ہم سب پر خوب جماتے، انہی حضرت کی بدولت اقبال بینی کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ دلّی میں اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے الفاظ میں الجھ کر رہ جاتے، اب اقبال کے درخشاں تخیل کے راستے میں الفاظ اس طرح پس کر ذرہ ذرہ ہو جاتے کہ اپنی جگہ پر وہ بھی آفتاب بن کر چمکنے لگتے۔ پھر جب درسگاہ کی زندگی ختم ہوئی تو رات دن نواب مسعود جنگ مرحوم کے ساتھ رہنا ہوا، ان کو لاکھوں کے ہزاروں شعر یاد تھے، اقبال بھی ان کے دماغ میں محفوظ تھے (اللہ ان کو غریق رحمت کرے) جوش میں آکر خوب مزے سے سُناتے تھے۔ ان کی وجہ سے شام کی نشست نواب سر حیدر جنگ کے ہاں ہو گئی تھی، وہاں اقبال مرحوم کا کلام مسعود مرحوم سُنایا کرتے اور سب جھومتے۔ مسعود صاحب اقبال کی قدردانی میں بہت فراخ حوصلہ تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ سر محمد اقبال مرحوم کو عثمانیہ یونیورسٹی کی زینت بنائیں، مگر اُن کا دانہ پانی یہاں کا نہ تھا کیسے آتے۔ سر یمین السلطنت مرحوم سے خوب یاد اللہ تھی، لیکن یہاں کھینچا نہیں۔ سر اکبر حیدری نے مولوی عبدالحق صاحب کو سُنا ہے بُلانے کو بھیجا، وہ لاہور گئے۔ باتیں جانے کیا ہوئیں، یہاں کا پیام کس طرح دیا اور وہاں کا جواب کن الفاظ میں لائے کہ اقبال تو یہاں نہ آئے، البتہ ہزار روپے ان کی پرورش کے خیال سے نواب صدر اعظم بہادر نے بھجوائے۔ روپے تو واپس آگئے، لیکن سر اکبر حیدری مرحوم کا نام "ارمغانِ حجاز" کی بدولت شاعروں کی غیر تمند دنیا میں غیر فانی ہو گیا۔ اسی ارمغان میں مسعود مرحوم کا بھی مرثیہ ہے، کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے تو کیوں کہوں، محبت اور احسان مندی بھرے دماغ کو لفظوں کی صورت میں پیش کیا ہے — آپ میں سے بہت سے حضرات ایسے ہوں گے جنہوں نے حضرتِ اقبالؒ کو دیکھا ہے اور دیکھنا کیسا! بعضے تو ایسے بھی ہوں گے جو مدتوں اُن کے ساتھ رہے سہے ہوں گے، ان کے لیے میری باتیں ایسی ہی ہوں گی کہ نانی کے سامنے ننھیال کی باتیں — کیونکہ رہنا سہنا تو کجا یہاں اُن کی صورت بھی نہ دیکھی۔ اکثر پڑھنے والوں کو مجھ سے توقع ہو گی کہ میں اپنی طرز کو نبھاتے ان کا ناک نقشہ آپ کے سامنے لفظوں میں کھینچوں، اور لفظوں کے جادو سے آپ کے کانوں کی

آنکھوں کے سامنے ان کو پیش کر دوں، یہ مجھ سے ناممکن ہے۔

ہاں لیجئے، سُنیئے! پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء میں لاہور گیا، ایک دوست تھے لاہور ہی کے رہنے والے حکیم احمد شجاع صاحب، ان سے ملنا تھا، ایک بنٹھ دو کاج ہو جاتے جو حضرت اقبالؒ سے بھی مل لیتا۔ لیکن مجھے دوسروں کی بدولت اُن سے ملنا پسند نہ آیا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور رستے میں پڑا، لاہور کی سیر کو اُترا، کشمیر کے طفیل اور حضرتِ اقبالؒ کی زیارت، جی نے مکروہ جانا اور یہ ارادہ کیا کہ حیدر آباد سے دلّی تک ریل میں جاؤں۔ اور دلّی سے پیدل ہو کر زیارت کی نیت باندھ کر پاؤں پاؤں چلتا ہوا لاہور پہنچوں، ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ذرا سانس کو قابو کر دوں، اندر ادب سے داخل ہوں، ان کے ہاتھ چُوموں اور اپنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں۔ پوچھیں کون ہے؟ عرض کروں جاہل زائر، فرمائیں کیوں آیا؟ عرض کروں، زیارت کے لیے۔ وہ کہیں کیوں دیکھ لیا؟ اور میں اُلٹے پاؤں واپس ہو کر دکن چلا آؤں۔ زبان کو کوکو لے جائے اور چپ لگ جائے، دل و دماغ باتیں کریں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک بار دیکھا دوسری کی ہوس ہے۔ نہ دیکھا نہ آرزو پوری ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں پھر کشمیر کی ٹھانی اور لاہور اترنا ہوا۔ اب کی دفعہ جناب عبداللہ چغتائی صاحب سمجھا کر گھسیٹ کر اُن کی گلی تک لے گئے۔ گلی کے دونوں طرف کچے کھنڈر تھے، سامنے چوپہل پیل چوپالوں کا پھاٹک کھلا تھا، بن چمن کی انگنائی۔ اس کے بعد ایک برآمدہ، اس میں ایک چارپائی بچھی، پاس ایک پنجابی حُقّہ رکھا۔ مُونڈھوں، کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے، ایک صاحب تکیوں کا ٹیکا لیے اَدھے لیٹے، چارخانے کا چادر اپڑا۔ صورت دیکھی ہو تو اللہ وہاں دیدار نہ دکھائے۔ ایک دم اپنی بے ادبی کا احساس ہوا اور وہیں سے بندہ فوراً واپس۔ بہتیرا ساتھیوں نے رد کا سمجھایا۔ لیکن کشمیر کے طفیل اور حضرت اقبالؒ کی آستاں بوسی ایمان نے نہ مانا اور چلا آیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد تشریف لائے۔ نگر گھر کہوں یا ایوانِ مدینہ۔ آپ نے تو ٹون ہال سُنا ہو گا، بس وہیں جلسہ ہوا۔ سر یمین السلطنت مرحوم کے ہاں مشاعرہ ہوا، گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ لیکن سُنا کہ سب کی بولیاں سُنا کیے، اور چُپ بیٹھے رہے۔ جن صاحب سے یہ روایت سُنی البتہ اُن کے ایک شعر پر فرمایا پھر پڑھیئے۔ ان ہی صاحب کا بیان ہے کہ انداز ایسا پُرمعنی تھا کہ وہ نہ سمجھ سکے کہ غلطی پر ٹوکے گئے ہیں یا تعریف ہے۔ میں نے تو اس دفعہ بھی کسی جلسے میں جانے کی کوشش نہ کی۔ پیاسا کنوئیں کے

پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس آجائے تو سب کو اچنبھا ہوتا ہے، اس لیے گھر ہی سے نہ نکلا، اس جذبے کو تقویت شریمتی پدما دیوی نے ادرد ی، کہا نہ تم صورت دیکھو نہ تم پڑھتے سنو، تمہارے لیے یہی بہتر ہے یہاں جملہ شرطی تو پہلے ہی سے موجود تھا بیرائے اور ہاتھ آئی۔ پھر دیکھنا اور سُننا بھی نصیب نہ ہُوا ــــ آج دنیا کے اسی عظیم شاعر کا ذکر ہے اور آپ میرے تاثرات جو اُن کے متعلق ہیں ٹوٹے پھُوٹے لفظوں میں سُن رہے ہیں۔ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنی عقل اور دوسرے کی دولت زیادہ سمجھتا ہے۔ الحمدللہ اِس کمزوری سے نجات ملی اور حضرتِ اقبالؒ کی عقل نے محسوس کرادیا کہ اپنے پلّے کچھ نہیں۔ عاقل بننے کا شوق ہے، سات خزانے عقل کے تین خزانے خودی۔ رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ۔ ان کی قفل کنجیاں ایران اور تین خزانے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم کی ہندوستانی، باقی رہا ایک خزانہ ارمغانِ حجاز۔ اس کا قفل ایسا جس کو دونوں کُنجیاں کھول سکتی ہیں، جتنا جس کا بل بوتہ ہے، اتنا مال اپنی بساط کے موافق لے جائے۔ اقلیمِ خاموشاں دماغ کے خزانے ہی میں بند رکھی کہ سنا سنا تو کیسا اِدھر کی سیر بھی نصیب نہ ہوئی۔ آدمی اپنی بُری بھلی صورت میں بھی ایسے پہلو نکال لیتا ہے کہ اچھے اچھے حسینوں کو چاہنے کا منہ ہو جائے اور ایسے بھی مائی کے لال ہوتے ہیں جو اپنے کو حسین اور طرحدار سمجھتے ہیں۔ میرے دل کی آنکھوں نے حضرتِ اقبالؒ کا وہ حُسن اور طرحداری دکھائی کہ رقابت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کو عام کردوں۔ ان کی تراش خراش، وضع قطع، خدوخال، بول چال اور لباس میرے دھیان میں ایسے بسے ہوئے ہیں جو مجھے پسند ہیں، چاہے وہ خود حضرت اقبالؒ کو پسند نہ ہوں، اس لیے میں نے اُن کی صورت کو راز رکھا اور آپ صاحبوں پر ظاہر نہ کیا، آپ نے تو کتابوں میں بھی پڑھا ہوگا یا دوستوں سے سُنا ہوگا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، کشمیری اصل کے تھے، لاہور میں ایک کوٹھی بنالی تھی، اور اس اینٹ چُونے کے مکان میں رہتے تھے۔ توبہ کیجئے اور دیکھئے کہ ایک عالی شان محل ساری شاعری کی دُنیا پر پھیلا ہُوا ہے۔ حضرت سلابہائیؒ نے جب لال حویلی تعمیر کرانی شروع کی تو اس کی تکمیل ہونے تک اپنے ٹھہرنے کے لیے مٹیا محل بنوالیا تھا۔ اسی طرح حضرت اقبالؒ نے جب اپنا قصرِ شاعری تعمیر کرنا شروع کیا تو اپنے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہمالیہ کی دیواریں اٹھائیں۔ سوامی رام تیرتھ، شری رامچندر جی، اور گورو نانک صاحب کو پاس بٹھالیا۔ سامنے ہندی بچے حضرت اقبالؒ کی تعلیم کی ہوئی دُعائیں

مانگتے اور ننھی مُنھی سی فوج بنا کر کھیلتے، تو حضرتِ اقبالؒ ہی کا سکھایا ہُوا ترانہ گاتے ہوئے فوجی کرتب دکھا کر جی خوش کرتے۔ ان کو مکڑی اور مکھی دکھا کر حزم و احتیاط کا سبق دیا۔ پہلے بادشاہوں کے زمانے میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ یہاں اس کی ضرورت تھی کہ گائے بکری ایک ساتھ چریں۔ اور تبادلۂ خیال کریں اور یہ رنڈ رونا چھوڑ دیں۔ عبادت کے لیے نیا شوالہ تعمیر کر دیا، پھر اس محل نے وہ وسعت اختیار کی کہ دنیا کا چپہ چپہ اس کی رتن جڑاؤ چھت کے نیچے آگیا۔ جو حصے چھٹے وہ محل کے بائیں باغ کا کام دینے لگے، اس محل میں مذہب، ملت، رنگ روغن کی قید نہیں۔ یہاں خودی ہمہ ہمی نہیں بلکہ خودداری اور مکمل انسانیت ہے۔ انقلاب گھٹیا بازاری نہیں کہ کسی کو اچھی سواری میں دیکھا تو جل گئے، کسی کو اچھا پہنتے اور کھاتے پیتے دیکھا کہ بھُن گئے کہ تو کو نہ موکو لے چولہے میں جھونکو۔ آپ کا نروے ہوں تو بلا سے محلے والے تو اندھے ہو جائیں، ظالم خدا ترس ہو جائیں، انقلاب ایسا ہو کہ گندی کایا پلٹ جائے، بدخواہ بہی خواہ ہو جائیں، بے فیض دولتمند بافیض ہو جائیں اور نکمے مُفت خورے مفلس قلانچ (قلاش) محنتی کماؤ اور زردار بن جائیں۔ ہر ایک کی اپنی برائی بدل کر اچھائی صحیح معنوں میں ہو جائے۔ اس محل میں بار عام ہو جائے۔ ظالموں، سُست عیش پرستوں اور کاہلوں کو بار نہیں۔ ان کے لیے بھی دروازے تو کھلے ہیں لیکن خود ان کے دل اندر آنے کو نہیں چاہتے۔ کیونکہ اپنی ہی غفلت کاہلی اور پندار کے پردے پڑے ہیں، وہی حجاب حائل ہے اور اپنی کمزوریاں ہی حاجب ہیں۔ اس محل میں نہ سازشیں ہیں نہ جوڑ توڑ نہ خون آشامی، نہ کمزوروں کو ملنا ولنا، جیو اور جینے دو، نیکی سے کام کیے جاؤ، دھوکا دو نہ دھوکا کھاؤ، کالے کو لال منہ والا نہ کھائے اور نہ کلموئیے کو زر و آزار ستائے۔ اللہ کے بندے، اللہ کی زمین۔ سو بس بسیں اسے یاد کریں۔ رام کی چڑیاں رام کا کھیت، آؤری چڑیوں کھاؤری کھینت کی اگر نوید نہ دیں تو غُلّہ مار کے اُڑا کر بھی پاپ نہ لیں۔ بلونت کمزوروں کے منہ کا ٹکڑا چھین کر مینا نہ بنے۔ طاقت پیدا کریں اور قوی ہو کر اپنا بچاؤ کریں۔ اصل قوت تو ملاپ ہی میں ہے۔ نفاق کا نام کمزوری ہے، کمزور بھلا عمل کے میدان میں کیوں اُترنے چلا، جسم کے ساتھ روح کی بھی ترقی ہو۔ قیمتی برتن اور لذیذ کھانا، مٹی کے ڈھوبرے میں کندن قلیے کو کس کا جی چاہے گا، اور زمردین تھالی جوڑ کٹورے میں نمک پانی کو کوئی کیوں پیئے گا، ظرف مظروف کی شان ایک ہو تو لطف ہے، مزا ہے۔

جسم سکھا کر روح بڑھائی تو کیا پھل پایا، اور روح مردار کر کے جسم پالا تو دُنیا ہی کو حلال کیا۔ یہاں دین دنیا دونوں کو ساتھ رکھ کر اور آنکھیں کھول کر کام کرنے کے آداب سکھلائے گئے ہیں، جتنا جو بچا سکتا ہے اتنا ہی اُس کو دیا گیا ہے۔ اگر اچھے اوتار ختم نہ ہوئے ہوتے تو لوگ اقبالؒ کو اوتار مان لیتے اور ختمِ نبوت پر ایمان نہ ہوتا، تو کون ابوجہل ہے جو ان کی آواز سُنکر صدقنا نہ کہتا۔ اُن کا نظر ایسا کہ دوسروں کی خودی کو اُبھارتے رہے اور راستے سیدھے اور سہل سہل ترکیبیں اس کے حصول کی بتایا کیے لیکن کبھی جھوٹے منہ بھی خدائی کا دعویٰ نہ کیا بلکہ یہاں تک احتیاط برتی کہ جواب شکوہ میں بتا دیا کہ اللہ میاں جواب نہیں دے رہے، کیونکہ نہ تو وحی آئی اور جو آتی تو نبوت کا اعلان کر دیتے، لیکن ایمان سلامت تھا۔ نبوت ختم ہوئی عقیدتمند خدا نہ بنا دیں، اس لیے شکوہ کے مقابلے میں جوابِ شکوہ کچھ یونہی سا رہا۔ شکوہ میں بھرے ہوئے انسان کی گلگذاری کا پورا حق ادا ہو گیا، اس زور شور اور دھوم دھام کا جواب تو اللہ میاں ہی دیتے تو دیتے، اگر اقبالؒ وہی زور جواب میں دکھا دیتے تو شرک عائد آتا، اس لیے اجتناب کیا۔ جُوں جُوں انسان اقبالؒ کی سیر کریں گے اُن پر روز نئے نئے اسرار آشکارا ہوتے جائیں گے۔ اللہ حافظ اقبالمندوں کا۔

حضرت علامہ اقبالؒ سے

سلسلہ نیازمندی

تحریر:۔ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

میں نے پہلے پہل حضرت علامہ اقبالؒ کا نام (جنہیں اس وقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ کہا جاتا تھا) ۱۹۰۸ء میں سنا جب کہ انہوں نے ملی ترانہ (چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا) شائع کیا۔ یہ ترانہ کیلنڈر سائز کے خوشنما چارٹوں پر بھی چھاپا گیا تھا۔ یہ چارٹ ہر گھر میں آویزاں تھا۔ اسی زمانے میں مجھے ترانے کے کئی شعر حفظ ہو گئے تھے، میرا بچپن کا زمانہ تھا، یہ اشعار مجھے دوسروں سے سنکر یاد ہوئے تھے، اس وقت علامہ کے متعلق میرا کوئی تاثر نہ تھا۔

۱۹۱۹ء میں جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، میٹرک کے اردو کورس میں جس کا نام نصابِ اُردو تھا، علامہ اقبالؒ کی نظم "نیا شوالہ" اور "ایک آرزو" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں یہ نصاب نویں اور دسویں جماعت میں دو سال میں ختم کرایا جاتا تھا۔ میں اس وقت اردو کے تمام بڑے اساتذہ کے دیوان پڑھ چکا تھا اور خود بھی غزلیں کہتا تھا، میر انیس کی بکلمات پڑھنے کے بعد نظمیں بھی کہنے لگا، جو اُس وقت کے اخبارات میں چھپتی تھیں۔ اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ جن اساتذہ کا کلام میں پڑھ چکا ہوں اب ان جیسے اُستادوں کا جواب پیدا ہونا محال ہے۔ میں حالی اور داغ کو اُردو کے آخری شعراء سمجھتا تھا۔ نصابِ اُردو میں علامہ کا "نیا شوالہ" اور "ایک آرزو"۔ اور مولانا اکبر الہ آبادی کی رباعیات اور قطعات جو اسی کورس میں درج تھے، دیکھ کر مجھے اپنا سابقہ خیال غلط نظر آیا، اور اب میں نے تسلیم کر لیا کہ پچھلے اساتذہ کے مقابلے کے استاد اب بھی موجود ہیں، شاعری ختم نہیں ہوئی۔

میں نے علامہ کے مزید کلام کی تلاش شروع کر دی۔ لاہور کی مرغوب ایجنسی نے علامہ کی بعض نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، قومی ترانہ، نالۂ یتیم، فریادِ اُمت، شمع و شاعر، الگ الگ خوبصورت کتابچوں کی شکل میں شائع کر رکھی تھیں، یہ سب نظمیں میں نے منگوا لیں۔ بعد میں اسی طرح خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور لیکچر اقبال (مترجمہ مولانا ظفر علیخان) بھی شائع ہوئیں، میں نے یہ بھی منگوائیں اور سب کی ایک جلد بندھوالی جو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ ان میں سے "نالۂ یتیم" اور "فریادِ اُمت" بانگِ درا میں درج نہیں۔ اسی دوران میں میں نے ماہنامہ مخزن، ماہنامہ صوفی منڈی بہاؤالدین، اخبار زمیندار، خمخانۂ جاوید جلد اوّل اور دیگر رسائل اور جرائد سے علامہ کا تمام اُردو کلام ایک بیاض میں نقل کر لیا۔ اس بیاض میں مولانا ظفر علی خان اور دیگر قومی شعراء کا کلام بھی درج ہے، یہ بیاض بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

میں علامہ کے اُردو کلام کا حافظ ہو گیا تھا۔ اب مجھے خیال ہوا کہ علامہ کا اصل پیغام تو فارسی میں ہے، میں نے سکول میں عربی پڑھی تھی فارسی مجھے آتی نہ تھی، میں نے فارسی پڑھنی شروع کی، فارسی کسی استاد سے نہیں پڑھی بلکہ یہ کیا کہ علامہ کی مثنوی اسرارِ خودی پڑھنی شروع کر دی، چونکہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور مولانا نیاز فتح پوری کی فارسی نما اردو نثر کا دلدادہ تھا، مجھے اسرارِ خودی اور پھر مثنوی رموزِ بے خودی کا مطالعہ مشکل نظر نہ آیا، فارسی گرامر کی ایک ابتدائی کتاب سرسری دیکھ لی تھی جس سے فارسی افعال کو سمجھنے میں مدد ملی، میں نے "اسرار و رموز" کے تمام مطالب سمجھ لیے بلکہ بہت سے اشعار حفظ ہو گئے، اور میں خود بھی فارسی شعر کہنے لگا۔

پیشتر اس کے کہ میں علامہ مرحوم سے اپنی ملاقاتوں کی یادداشتیں بیان کروں چند واقعات کسی منطقی ترتیب کے بغیر بیان کر دوں۔

اکبر الہ آبادی سے تعلق

۱۹۱۱ء میں سید اکبر حسین الہ آبادی نے علامہ اقبال کو الہ آباد سے "نگڑے آموں" کا ایک ٹوکرہ تحفۃً بھیجا۔ علامہ نے اکبر کو آموں کی رسید کے طور پر یہ شعر ارسال کیا جو علامہ کے اردو کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے ؎

؎ جناب سیّد اکبر کا یہ اعجاز تو دیکھو!
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

یہ شعر لُدھیانے کے ماہنامہ اقبال میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ شہزادہ صابر درّانی نے علامہ اقبال کے نام پر لُدھیانے سے جاری کیا تھا۔

چندے میں شعر

۱۹۲۱ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کی یادگار تعمیر کرنے کے لیے سرمایہ جمع کرنے کی تحریک شروع ہوئی، چندہ جمع کرنے والے لاہور میں علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور عطیہ طلب کیا، شاعر کا سرمایہ تو اس کے اشعار ہی ہوتے ہیں، چنانچہ علامہ نے یہ دو اشعار چندے میں دیئے، یہ اشعار بھی علامہ کے اردو کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تُو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

قطعۂ تاریخ

علامہ اقبال کی ایک بیگم لُدھیانے کے نولکھا خاندان سے تھیں، ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا، علامہ کو بہت صدمہ ہوا، انہوں نے اس جانگداز حادثے پر فارسی میں قطعۂ تاریخ کہا جو لُدھیانے میں ان کی لوحِ مزار پر کندہ تھا، یہ قطعہ بھی علامہ کے فارسی کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے، فرماتے ہیں ؎

اے دریغا ز مرگِ ہمسفرے — دلِ من در فراقِ اُو ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم — [illegible] مصطفےٰ آورد
بہ سالِ رحیلِ اُو فرمود — بہ شہادت رسید و منزل کرد
۱۳۴۲ھ

ذوالفقار گنج

گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ کے سامنے نواب سر ذوالفقار علی خان ممبر کونسل آف سٹیٹ کی کچھ اراضی تھی، نواب صاحب علامہ کے خاص دوستوں میں سے تھے، ۱۹۲۴ء میں انہوں نے اس اراضی پر بہت سے دو منزلہ مکانات تعمیر کر کے خوشنما آبادی قائم کر دی جس کا نام ذوالفقار گنج رکھا، اس آبادی کے بلند و بالا محراب دروازے کے سنگِ پیشانی پر علامہ اقبال کا یہ قطعہ تاریخ کندہ تھا، علامہ کا یہ قطعہ بھی علامہ کے فارسی کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے ؎

بانیٔ ایں خوش بنا سر ذوالفقار
سالِ تعمیرش ز ہاتف خواستند

از فلک ایں مصرع چوں شبنم چکید
بر زمیں خلدِ بریں آراستند
۱۹۲۴ء

مُسلم آؤٹ لُک

پنجاب میں مسلمانوں کا کوئی انگریزی اخبار نہیں تھا، تحریکِ خلافت کے زمانے میں یہ کمی بہت بُری طرح محسوس کی گئی، چند مسلم نوجوانوں نے لاہور سے مُسلم آؤٹ لُک جاری کرنے کا فیصلہ کیا، علامہ اقبال نے اس پر چند اشعار کہے جو علامہ کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں ؎

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں، ہمت سبک، ووٹر فزوں روزی تنک
لُک وِدان[1] کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے مُسلم آؤٹ لُک
کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار
کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا کُک

---

[1] LOOK WITHIN

قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں!
کہہ دیا مرحوم دِل کے زباں دانوں نے ٹھیک
ختم تھا مرحوم اکبر ہی پہ یہ رنگِ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رُک

عرشی کے جواب میں

۱۹۱۹ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپی اتحادیوں نے ترکی کے تمام مقبوضات اور عرب ممالک پر قبضہ کر کے پورے عالمِ اسلام پر اپنی سیادت قائم کر لی تو دُنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ خلافت شروع کی گئی۔ ان دردناک حالات میں جناب محمد حسین عرشی امرتسری نے ایک فارسی نظم میں علامہ اقبال سے التجا کی کہ وہ موجودہ قیامت خیز حالات میں خاموش نہ رہیں، قوم کی رہنمائی کے لیے کچھ فرمائیں۔ عرشی کی نظم طویل ہے آخری اشعار یہ تھے ؎

خیز و گلبانگ دہل در گنبدِ خضرا فگن
از قبور آید خلقے شور صور آسا فگن
خیز و سوتِ خود بہ آہنگِ رجز تبدیل کن
قطرۂ زاری، بیاور، در شرِ تحلیل کن
خیز از یں کنج متانت جلوۂ بر ما فگن
ہاں بیا ہمچو سنائی گوئے در میداں فگن

یہ نظم روزنامہ "زمیندار" مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اور مولانا ظفر علیخاں مرحوم اخبار "زمیندار" کا یہ پرچہ لے کر خود علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، علامہؒ نے عرشی امرتسری کے پیغام کے جواب میں جو اشعار مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے حوالے کئے وہ علامہ کے کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ میں یہ اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

ے دانی کہ چیست شیوۂ مردانِ پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم، ہنوز از کرمِ ساقیٔ حجاز
آہِ دردنہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست
از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز
آں لالۂ کہ موجِ سیمے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردش شراب
پیرِ عجم چہ گفت بہ رندانِ مے پرست
داناکہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و درِ گفتگو ببست

علامہ کا مطلب یہ تھا کہ اب کام کرنے کا وقت ہے باتیں کرنے کا نہیں ہے۔

ے جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے دوسرے روز مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کہا ؎

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سربلند
چرخِ ستیزہ کار کرے گا زبون و پست
لیکن نہ قولِ سعدیٔ شیراز بھولئے
چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ الست

رفتن بہ پائمردیٔ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است

حکیم طغرائی امرتسری نے بھی علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے ایک نظم کہہ ڈالی جس کے آخری دو شعر یہ تھے ؎

گیرم کہ گنج فلسفہ و حکمت است کس
را چہ سود، مہر سکوت ازلبش بہ بست
پذیرا عتذار ز طغرائی حزیں
دانی کہ او ز بند الم ہیچ گہ نہ رست

آخر علامہ نے عرشی امرتسری، مولانا ظفر علی خان مرحوم اور حکیم طغرائی امرتسری کے اسرار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کو بتایا کہ انہوں نے ایک نظم شروع کر دی ہے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پروائے من
برنہ خیزد یک شرار از قسمت نازائے من

یہ نظم بھی جس کے چند اشعار میرے پاس محفوظ ہیں، علامہ مرحوم کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔

پہلی بار زیارت

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجھے پہلی بار علامہ کی زیارت نصیب ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ برطانیہ کے حکم کے تحت ہندوستان کے تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ۲۵ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کے سالانہ جلسے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں مشترکہ طور پر ہو رہے تھے، اس مشترکہ جلسے میں کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو (والد پنڈت جواہر لال نہرو) اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم تھے، ۲۶ دسمبر کو مولانا محمد علی جوہر چھندواڑہ جیل سے اور مولانا شوکت علی بتویل جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ ہم چند طالب علم بھی بلا ٹکٹ

لدھیانے سے اسی گاڑی میں سوار ہوگئے اور امرتسر پہنچ گئے۔ علی برادران جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو مسلم لیگ کا اجلاس شروع تھا جو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا، دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حکیم اجمل خان صاحب نے اعلان کیا کہ اب ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال علی برادران کے خیر مقدم کے طور پر چند اشعار پڑھیں گے، جو انہوں نے فی البدیہہ لکھے ہیں۔ حضرت علامہ تکبیر کے پُرجوش نعروں میں کھڑے ہوئے اور ترنم کے ساتھ ذیل کے اشعار پڑھے جو بانگِ درا میں "اسیری" کے عنوان کے تحت درج ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مُشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بُوند ہے — مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

آخری شعر حضرت خواجہ حافظ شیرازی کا ہے جسے علامہ نے تضمین کیا ہے، علامہ اس اجلاس میں سٹیج سیکرٹری تھے، مجھے علامہ کی زیارت کر کے اور ان کا کلام سُنکر بہت خوشی ہوئی، گویا کوئی بیش بہا خزانہ ہاتھ آگیا۔ لوگوں نے "مکرر ارشاد" کہہ کہہ کر یہ اشعار کئی کئی بار پڑھوائے اور مجھے وہیں حفظ ہو گئے۔

بارگاہِ اقبال میں باریابی

مجھے ۲۱-۱۹۲۰ء میں دوستوں سے ملنے کے لیے لاہور جانے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ یہ اس زمانے میں اخبار زمیندار کی نامہ نگاری بھی کرتا تھا، کبھی کبھی بعض بزرگوں کے ہمراہ علامہ کی بارگاہ میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوتی تھی، چونکہ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا، مجھے علامہ اقبال کے تبحرِ علمی اور دینی تقدس کی وجہ سے بے حد عقیدت تھی، کچھ احساسِ کمتری اور کچھ شرم اور پاسِ ادب بھی دامنگیر تھا، اس محفل میں فرشِ پا انداز میں جگہ مل جانا بھی بے حد مسرت کا باعث تھا وہاں مجھے عرصہ تک لب کشائی کی جرأت نہیں ہوئی۔

بات کرنے کی جرأت کب ہوئی، یہ بھی ایک داستان ہے۔ جب میں ۱۹۲۵ء میں اردو مرکز لاہور سے وابستہ ہوا تو فرصت کا وقت دفتر زمیندار میں گذرتا تھا، وہاں علامہ کبھی کبھی مولانا ظفر علی خان سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کے کمرے میں "زمیندار" کا ایک ۱۹۱۱ء کا فائل تلاش کر رہا تھا، کمرے میں اور کوئی نہیں تھا، یکایک علامہ تشریف لے آئے میں کمرے کے ایک کونے میں فائلوں کے ایک اونچے ڈھیر کے پاس کھڑا فائل دیکھ رہا تھا، میں کچھ گھبرایا لیکن جرأت کر کے سلام عرض کر دیا، علامہ نے سلام کے جواب کے بعد پنجابی میں فرمایا "مولانا نوں کتھے لکو رکھیا اے"۔ میں نے پنجابی میں عرض کیا کہ وہ ابھی اٹھ کر ایک مہمان کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ علامہ نے فرمایا "اوہ لال لوبی تاں نہیں ہوئی اے"۔ یہ مولانا کی ترکی ٹوپی کی طرف اشارہ تھا جو میز پر پڑی تھی، میں نے عرض کیا کہ شاید ننگے سر ہی چلے گئے ہیں، (اس زمانے میں شرفاء کا ننگے سر بازار میں نکلنا معیوب تھا) علامہ یہ سنکر بیٹھ گئے، شاید یہ خیال کیا کہ چونکہ ننگے سر گئے ہیں تو دور نہیں گئے ہوں گے۔ اتنے میں مولانا اختر علی آ گئے، علامہ کو دیکھ کر سلام عرض کیا اور کڑک کر بابو مولاداد (مینیجر زمیندار) کو آواز دی کہ علامہ کو تحفہ پیش کرو، ادھر بابو مولاداد نے تحفہ بھیجا اور ادھر کھٹ سے مولانا ظفر علی خان نے کمرے میں قدم رکھا اور علامہ کے پاس بیٹھ گئے۔

اس دن میں نے پہلی بار آفتاب و ماہتاب کو ایک برج میں جلوہ آرا دیکھا اور علامہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا، اس اثنا میں میں نے فائل تو تلاش کر لیا تھا لیکن فائل لے کر وہیں بیٹھا اس کی ورق گردانی کرتا رہا، میرے کان ان بزرگوں کی باتوں کی طرف تھے جو قومی اور سیاسی امور کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس دن سے میرا احساس کمتری اور شرمساری گھٹنے لگا، اس زمانے میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور بعض دیگر اصحاب علامہ کے دولت کدے پر اکثر جاتے تھے۔ میں بھی ان میں سے کسی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جانے لگا۔ اس عرصے میں علامہ اقبال کا "پیام مشرق" شائع ہو چکا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی جب کسی سے میرا تعارف کراتے تو میرا نام بتانے کے بعد کہتے "یہ اقبال کا فدائی ہے"۔

شعر اقبال کی تضمین

مئی ۱۹۲۷ء میں مثنوی اقبالؒ کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے میں نے علامہ اقبالؒ کی یوں مدح سرائی کی۔

حضرتِ اقبالؒ آں بحرِ علوم — چشمِ او مستِ شرابِ پیرِ روم
بے خبر از مدعا بودیم ما — از حرم نا آشنا بودیم ما
زد سرِ انگشت بر تارِ حیات — آشکارا کرد اسرارِ حیات
مسلمِ پروردۂ باغِ سروش — بود در ہندوستان زنار پوش
داد اُو را عشقِ لیلائے حجاز — نازہا افروخت از خاکِ نیاز
دین فطرت را بلند آوازہ کرد — گلشنِ ہندوستان را تازہ کرد
از خمِ عرفاں شرابِ ناب داد — قلب را بے تابیٔ سیماب داد
جلوۂ طیبہ قرارِ جانِ اُو — مدحِ ختم المرسلین ایمانِ اُو
فکرِ او در مثنوی دُرِ سفتہ است — در ثنائے مصطفیٰ خوش گفتہ است

"در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید"

کارِ ختم الانبیاء ایں بود و بس — ہستی اش را مدعا ایں بود و بس
ساخت از اقوام یک قومِ گراں — یک دل و یک اعتقاد و یک زبان
دین و دنیا را بہ آئیں چوں ببست — آدمِ کم مایہ شد بیضا بدست
علم و حکمت را بہ قرآں ربط داد — در جہاں از شعلہ ہا فردوس زاد
لطفِ او گیرندۂ ہر سرزمین — زیں سبب شد رحمتؐ للعالمین
ضربِ الا اللہ زد چوں صبحِ دم — قوم شد بیدار از خوابِ عدم
دہر از آئینِ حق تسخیر شد — قیصر و کسریٰ تہِ شمشیر شد
ہیبتِ رومافرِ ایراں نہ ماند — ہیچ قانونے بجز قرآں نہ ماند

"در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید"

میری یہ نظم مقصودِ رسالت ؐ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ اور پرچہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش ہوا۔ علامہ نے ایک صاحب سے پڑھوا کر سنی اور اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

نذرِ اقبالؒ

پھر ۱۹۲۷ء میں "نذرِ اقبالؒ" کے عنوان سے میں نے ایک فارسی نظم کہی۔ جو روزنامہ انقلاب مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ نظم یہ تھی ؎

سوزِ الفت در رگِ جانم نہ بود — ماہ پروین زیرِ دامانم نہ بود
بے خبر از جلوہ لیلیٰ بدم — از تمالِ خویش بے پروا بدم
عاقل از رسمِ تپیدن جانِ من — خندہ زن الحاد بر ایمانِ من
غرقِ عصیاں بندہ لات و منات — ناشنیدہ حرفِ مقصودِ حیات
نغمہ غفلت فزا در سازِ من — ساقیانِ ماہ وش در مسازِ من
دود تر خاکسترم از تابِ عشق — در جہاں بیگانہ از اربابِ عشق
در چمن اقبالؒ چوں ساز نوا ست — از غبارم یک جہانِ عشق ساخت
جانِ من از دامہا آزاد گشت — دل ز نقشِ لا الہ آباد گشت
گل بدم از سوزِ او آدم شدم — از رموزِ زندگی محرم شدم
فکرِ او بر من درِ جنت کشاد — عشق در جانم بنائے خود نہاد
برق اگر دیدگرد حاصلم — کعبہا تعمیر شد اندر دلم
در رہِ الفت شدم چوں یارِ او — جستم از گفتارِ او اسرارِ او
اے نسیمِ صبح از گلشن بہا — از رہِ الطاف سوئے من بہا

مہربان شو بر دلِ ناکامِ من
تا بہ گوشِ اُو رساں پیغامِ من

اے کہ عالم مست شد از ہوئے تو — "جلوہ ہا خیزد دہر پہلوئے تو"
"انتظارے غمگسارے تا کجا — جستجوئے رازدارے تا کجا"
اے کہ سینا ذرّہ از تابِ تو — نعرۂ ارنی زنم بر بابِ تو
آرزو دارم کہ غمخوارت شوم — در مصافِ زندگی یارت شوم
"تا بہ جانِ من سپاری ہوئے خویش — باز بینی در دلِ من روئے خویش"
خیز و از چنگم نوائے سازِ تو — من بایں دوری شدم ہمرازِ تو

اے کہ بامِ تو ز ماہ و خور بلند
لطف کن بر من در خود را مبند

مدیرِ انقلاب نے یہ نظم شائع کرتے ہوئے اس پر یہ نوٹ لکھ دیا۔ "ارنی کی را متحرک ہوتی ہے۔ خدا جانے نظیر صاحب نے ساکن کیوں باندھی"۔

میں نے اس اعتراض کے جواب میں مدیرِ انقلاب کو غیاث اللغات کے حوالے سے ایک شعر سند میں لکھ بھیجا جس میں ارنی کی را ساکن باندھی گئی تھی، لیکن مدیرِ انقلاب نے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا۔

"۲۴ ستمبر کے انقلاب میں جناب اصغر حسین خان صاحب نظیر لودھیانوی کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس کے ایک شعر میں ارنی بہ سکون را باندھا گیا تھا۔ اس پر ہم نے اظہارِ تعجب کیا کیونکہ ہمارے نزدیک عربی الفاظ کو محض ضرورتِ شعری کی وجہ سے اس طرح بگاڑنا کہ ان کی صرفی و نحوی صورت برقرار نہ رہے مستحسن نہیں۔ اس پر حضرت علامہ اقبالؒ مدظلہ العالی کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا۔ جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے"۔

ڈیر سالک۔ ٹیک چند بہار نے ابطالِ ضرورت میں ربّ ارنی پر مفصل بحث کی ہے۔ افسوس ابطالِ ضرورت کا کوئی نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں۔

بہرحال یہ صحیح ہے کہ اساتذۂ عجم نے رب اَرنی کی رائے ثانی کو بہ سکون بھی استعمال کیا ہے۔ سالک لاہوری سالک یزدی کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

مرغِ اَرنی گو ز شوقِ لن ترانی پر زند
پیشِ موسیٰ خارِ خارِ وادی ایمن گل است

اصغر حسین خان صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں۔ والسلام: محمد اقبال"

حضرت علامہؒ کے بعد اصغر حسین صاحب نے بھی صاحب غیاث کی یہ عبارت نقل کر کے بھیج دی۔ رب اَرنی در فارسی بہ سکونِ رائے مہملہ نیز آمدہ چنانچہ در مخزنِ اسرار مولوی نظامی گفتہ ؎

موسیٰ دجام تہی دید دست
شیشہ بکہ کہ پایۂ ارنی شکست

حضرت علامہ اگر محض سالک یزدی کے شعر ہی پر اکتفا کرتے تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اب کہ حضرت نے خود اپنی رائے بھی ظاہر فرما دی کہ اصغر حسین صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ حضرت کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں۔ (روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء)

خطاب بہ اقبال

جنوری ۱۹۲۹ء میں میں نے علامہ اقبالؒ سے خطاب کرتے ہوئے ایک اور نظم کہی جو روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی۔ اسی نظم میں میں نے عرض کیا ؎

جان و دل از نوائے خود گداز — آشیاں در گلشنِ اقبال ساز
آں چمن آرائے اسرار و رموز — آسماں پیمائے اسرار و رموز
خیمہ زن در وادیٔ طورش کلیمؑ — شعرِ او تفسیرِ قرآنِ حکیم
حاصلِ خمخانہ ہا زیبِ برش — مے بہ تاک اندر نہاں در ساغرش
حشر ہا از فکرِ او در کائنات — چشمِ او بینندۂ رازِ حیات

حُسن از تحسینِ او سفاک تر　　عشق از تعلیمِ اُو بے باک تر
چوں خیالِ مصطفیٰؐ ایمانِ اُو　　برق می گیرد تپش از جانِ اُو
در جہانِ عشقِ محمدؐ عام کرد　　خاک بازاں را شرر آشام کرد
در تنِ ما گر رواں بینی ازوست　　آنچہ در ہندوستاں بینی ازوست
ذرّہ از آتشِ او سوز ماست　　حاصلِ صد دودشِ اُو امروزِ ماست

کور ذوقاں داستاں ہا ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند

اِلتجائے دُعا

۱۹۳۱ء میں گورداسپور میں میری چار سالہ لڑکی طاہرہ خانم فوت ہوگئی۔ چونکہ وہاں ہم میاں بیوی اکیلے تھے۔ دونوں نے کبھی کسی عزیز کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہم دونوں بہت ہراساں ہوئے۔ احباب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مل جل کر بچی کو سپردِ خاک کیا۔ رات کو میری والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی صاحب کی اہلیہ اور دیگر اعزّہ لودھیانے سے آگئے۔ میری بھابی کی گود میں چار سالہ لڑکا تھا۔ جو کچھ علیل تھا وہ گورداسپور پہنچتے ہی مر گیا۔ اسے اگلے روز سپردِ خاک کیا گیا۔ دو روز میں دو موتیں ہو گئیں۔ ان دونوں بچوں کی قبریں گورداسپور میں پہلو بہ پہلو ہیں۔ ان کے سرہانے سنگِ مرمر کی تختیاں لگائی گئیں۔ جن پر علامہ کی مثنوی کے اشعار کندہ تھے۔ طاہرہ خانم کی تختی پر اس کے علاوہ مثنوی کا یہ شعر کندہ تھا ؎

شعلہ ہائے او صدا ابراہیمؑ سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

میرا دل ان بچوں کی موت سے بہت متاثر ہوا۔ اور دلی صدمے کی وجہ سے سخت علیل ہو گیا۔ فروری ۱۹۳۲ء میں میں نے علامہ اقبالؒ کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اپنی علالت کی طوالت اور تفصیل بیان کر کے ان سے دعا کی التجا کی۔ علامہ نے میرے خط

کے جواب میں جو خط لکھا اس کی نقل ذیل میں درج ہے :

لاہور ۲۹ فروری ۱۹۳۲ء

جناب من !

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کی علالت کا حال معلوم کرکے بہت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے میں آپ کو صحتِ عاجل کرامت فرمائے۔ آپ کے حسن ظن اور اپنی بے بضاعتی سے میرا دل بہت متاثر ہوا۔ میں کیا اور میری دعا کیا۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تکمیل میں دریغ نہ ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال

اس گرامی نامہ کی یاد میں مَیں نے چند اشعار کہے۔ ان میں سے چار شعر نقل کرتا ہوں ؎

بخت نے وہ خوفناک ایام دکھلائے مجھے
جن کے ڈر سے لرزہ بر اندام ہے یوم النشور

شانِ مُطلق ہے وہ مایوس نہیں ہو دل مرا
جان دی جس نے وہی تاب و تواں دیگا ضرور

جب اٹھا میرے لیے دستِ دعا اقبالؒ کا
کھل گیا بابِ اجابت صورتِ آغوشِ حور

میں گنہگار اس لیے کہتا ہوں بے تقصیر ہوں
تری رحمت کے مقابل کچھ نہیں میرے قصور

عاشقانہ مثنوی

۱۹۲۷ء میں مَیں نے ایک عاشقانہ مثنوی لکھنی شروع کی۔ جو نامکمل رہ گئی۔ اب اس کی تکمیل محال ہے۔ اس کے شروع میں لودھیانے کے حضرت عنایت ولیؒ کے مزار پر حاضری کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ کا ذکر ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

ہو رہی تھی یوں غلامی میں بسر
سر بہ سر بیکار تھے فکر و نظر

جس نے نبضِ عشق کو گرما دیا !
اہلِ دین کی روح کو تڑپا دیا

ہو گئے جب تنگ ظلم و جور سے
یک بیک اٹھی صدا لاہور سے

پھر ہوئی پیدا نوائے لا الہ
پھر سنی ہم نے صدائے لا الہ

سر اٹھایا سبزۂ پامال نے
تازگی بخشی ہمیں اقبال نے

پھر کیا عشق نبیؐ سے آشنا — پھر کیا زورِ علیؓ سے آشنا
پھر پلایا ہم کو جامِ اہلِ بیتؓ — پھر دیا ہم کو پیامِ اہلِ بیتؓ
پھر اٹھایا پردۂ حسن و جمال — پھر دکھایا روئے سلمانؓ و بلالؓ
پھر ملا احساسِ پامالی ہمیں — مل گیا پھر سوزِ ابدالیؒ ہمیں

حضرت علّامہ کی علالت

اپریل ۱۹۳۶ء میں اخبارات میں یہ تشویش ناک خبر شائع ہوئی کہ علامہ سر محمد اقبال علیل ہیں۔ گلے میں سخت تکلیف ہے۔ مسلمان علامہ کی صحت کے لیے دعا کریں چنانچہ ہر شہر کی مساجد میں علامہ کی صحت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ اس موقع پر میں نے ایک نظم لکھی جو روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوئی۔

حضرتِ اقبالؒ آں سالارِ قوم — آفتابِ مطلعِ انوارِ قوم!
در گلوئے او نوا ہائے خلیلؑ — قوم از آہنگِ اُو گرم رحیل
بہرہ یاب مستی و عشق و نیاز — مایہ دار ذوق و شوق و سوز و ساز
حشرہا مستور در پہلوئے اُو — عاشقاں گرم عمل از ہوئے اُو
قطرہ از خمخانۂ بطحا چشید — دید آں رنگے کہ موسیٰؑ ہم نہ دید
ذرہ از علمِ نبیؐ تحصیل کرد — فکر خود را شہپرِ جبریلؑ کرد
دانمود اسرارِ قرآنِ حکیم — داد اہلِ علم را ذوقِ سلیم
من کہ در زناریاں رقصاں بدم — بے خبر از جلوۂ یزداں بدم
جانِ من ناآشنا از تابِ عشق — خندہ زن بر حالِ من ارباب عشق
چوں نوائے او بہ گوشِ من رسید — در تنِ بے جانِ من جانے دمید
خفتہ بودم اُو مرا ہشیار کرد — از نوائے لا الٰہ بیدار کرد
ذکرِ پیغمبرؐ شنیدم من ازو — الفتِ حیدرؓ خریدم من ازو
پردہ از چشمم کشید آئینہ اش — سوزِ سلماں دیدم اندر سینہ اش

آشنا با شبرؑ و شبیرؑ کرد — در دلِ من عالمے تعمیر کرد
از کلامش مردِ صاحب دل شدم — واقفِ اسرارِ آب و گل شدم
داد از شوقِ عمل عزت مرا — از جہنم برد در جنت مرا
چشمِ من محو رخِ زیبائے اوست — دامنم معمور از رہگہائے اوست
در جہاں با اہلِ دولت کار نیست — در کفِ من درہم و دینار نیست
خم نہ کردم پیشِ منعم گردنم! — از درِ لعلش فروزاں دامنم
زندگانی میکنم در خار و خس — فکرِ من از فیضِ او افلاک رس
از شبِ ہجراں نے ترسد جانِ من — نورِ او در کلبۂ احزانِ من

اے خدا مثلِ خضر او زندہ باد
در جہاں اقبالؒ ما پائندہ باد

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ علامہ نے یہ نظم مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا سے پڑھوا کر سنی اور اشعار کی تعریف کی میں نے جولائی ۱۹۳۶ء میں ایک اور نظم کہی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ نظم یہ تھی ؎

حضرتِ اقبالؒ آں ممدوحِ ما — جانِ ما و روحِ ما و نوحِ ما
شمعِ محفل روئے دل افروزِ او — در دلِ ما سوزِ عشق از سوزِ او
از پیامش موجزن عمانِ ما! — از کلامش قوتِ ایمانِ ما
از نوایش مست پہنائے حیات — حشر در آغوشِ لیلائے حیات
زندگانی را نگارِ عشق داد! — ایں گلستاں را بہارِ عشق داد
آسمانِ زندگی را آفتاب — بہرہ یابِ حکمتِ اُم الکتاب
کرد ما را با خبر از لعل و سنگ — در ہجومِ نازنینانِ فرنگ
اے صبا اے قاصدِ طرارِ من — تا بہ گوشِ او رساں اشعارِ من
عرض کن کے رونقِ شہرِ علوم — چشمِ تو روشن تر از چشمِ نجوم
برقِ رومیؓ در خم و مینائے تو — چشمِ من سرمست از صہبائے تو

راہ تاریک و مہ روشن تو ئی
پیر تو رومیؒ و پیر من تو ئی

اُنتظار غمگسارے تا کجا
جستجوئے رازدارِ تا کجا"

ناتوانم لیکن افغاں زادہ ام
از فرازِ آسماں افتادہ ام

قطع استبداد کرد آبائے من
ہند را آباد کرد آبائے من

از سناں نقش و نگارے کردہ اند
ایں زمیں را لالہ زارے کردہ اند

سوز و سازِ جان من بنگر دمے
دیدۂ تو در تلاش آدمے

در غلامی جام تو نوشیدہ ام
آسماں زیر زمیں پوشیدہ ام

صبر از جانم ربود آئینہ ات
شکل آبا دیدم اندر سینہ ات

سوزِ تو بر جانِ من فرماں رواست
من ندانم تیغ ابدالؒ کجاست

ما برام جز مایۂ امید نیست
در کفِ من لعل و دُر وا دیدنیست

گردنم در حلقۂ طوقِ گراں
بے خبر جانِ من از آہ و فغاں

با کمالاں در جہاں خوارد ذلیل
کمتر نیساں وارثِ تیغ اصیل

شہ جہاں معدوم شد اکبر گزشت
دورِ چغتائی ازیں کشور گزشت،

ایں زمیں اہل سخن را کربلاست
مستیٔ دورِ جہانگیری کجاست

سوئے من اے پیرِ صاحب دل نگر
گلستانِ خویش را حاصل نگر

علّامہ کی وفات

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو نے علی الصباح یہ کربناک خبر سنائی کہ علّامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ آج صبح وفات پا گئے۔ میں آج تک کسی عزیز کی وفات پر نہیں رویا تھا۔ حضرت علامہ کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا اور میری آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ مدارس اور سرکاری دفاتر میں چھٹی ہو گئی۔ ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ میں نے علامہ کی وفات پر حسب ذیل نظم کہی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی ؎

اکبر جادو نوا ہے دیر سے خلد آشیاں — ہو چکی خاموش مدت سے گرامی کی زباں
سو رہا ہے جوہرِ بے باک ارض پاک میں — حشر محوِ خواب ہے داتا نگر کی خاک میں
آج رخصت ہو گیا اس بزم سے اقبالؒ بھی — بن گئی تاریخ ماضی داستانِ حال بھی
آں حکیم ایشیا آں ترجمان دینِ حق — آں کلیم عصر نو آں شارح آئینِ حق
اس نوا پرداز آں دارائے اسرار و رموز — آں ملک پرداز آں بینائے اسرار و رموز
آنکہ رازِ زندگی بر دیدۂ انساں کشاد — ملتِ ما را نوید زندگی تازہ داد
از نوائش روحِ من در جسم من بیدار شد — از جمالش دیدۂ من محرم اسرار شد
معنی حرف حیات و موت فہمیدم ازو — ہر چہ دیدم در سرائے آب و گل دیدم ازو
آتشِ عشقِ نبیؐ افروخت در پہلوئے من — شد چراغِ محفل عرفاں ضیائے روئے من

ملتِ ما را ز زنجیرِ اجل آزاد کرد
رفت از مادہ کنارِ موت را آباد کرد

اب حیات و موت کے اسرار بتلائے گا کون — عظمتِ اسلام کی تاریخ دوہرائے گا کون
کون دوہرائے گا اب افسانۂ ضربِ کلیمؑ — کون بتلائے گا اب اسرارِ قرانِ حکیم
کون دے گا اب ہمیں پیغام فاروقؓ و علیؓ — تو ہے فردوسِ بریں میں محوِ دیدارِ نبیؐ
کس سے اب جا کر سنیں ترک و عرب کی داستاں — کون دکھائے ہمیں شانِ حجازی کے نشان
کون دے گا اب خبر غرناطہ و بغداد کی — اپنی دنیا تو نے گردوں سے پرے آباد کی

تیرے ماتم میں بسر کر دیں گے ماہ و سال ہم
روئیں گے صبح قیامت تک تجھے اقبالؒ ہم

مدفنِ اقبالؒ

فقیر کا جنازہ جب جاوید منزل سے نکلا تو اسے پنجاب کے چار وزیروں نے اٹھایا ہوا تھا۔ جنازے کے اگلے پائے سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب اور لالہ منوہر لعل وزیر مالیات پنجاب نے اور پچھلے پائے میاں عبدالحیٔ وزیر تعلیم پنجاب اور سر چھوٹو رام وزیر تجارت و

صنعت نے تھامے ہوئے تھے۔ منوہر لعل گورنر پنجاب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے اقبالؒ کو شاہی مسجد کے دروازے کے پاس دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک وفد گورنر پنجاب سے اجازت لینے کے لیے گورنر ہاؤس گیا۔ گورنر نے وفد کو بتایا کہ وہ زمین حکومت پنجاب کے دائرۂ اختیارات میں نہیں ہے بلکہ مرکز کے محکمۂ آثار قدیمہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ گورنر نے لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند سے ٹیلی فون پر اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ صبح کے سات آٹھ بجے کا وقت تھا، لیکن وائسرائے سو رہے تھے۔ گورنر نے تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے کو پھر فون کیا اور علامہ کی وفات کی خبر سنا کر علامہ کو شاہی مسجد کی دیوار کے سائے میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔

جب میری اہلیہ پہلی بار میرے پاس فیروزپور آئی تو معلوم ہوا کہ اس نے لاہور نہیں دیکھا۔ چنانچہ ایک اتوار کو لاہور کی سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ لاہور پہنچ کر اسے چڑیا گھر، عجائب گھر، شاہی قلعہ، رنجیت سنگھ کی بارہ دری اور شاہی مسجد دکھائی اور علامہ اقبالؒ اور سر سکندر حیات کے مزاروں کی زیارت کرائی۔ ہم نے ان مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔ رات کو فیروزپور واپس پہنچ کر میں نے سیر لاہور کے عنوان سے ایک نظم کہی۔ اس میں علامہ کے مزار کا ذکر یوں کیا ہے ؎

آئے پھر با چشمِ تر ہم مرقدِ اقبالؒ پر
اور بھی اک آسمان ٹوٹا دلِ پامال پر

جلوہ آرا مرقدِ شاعر پہ اس کی یاد تھی
وہ فضا اک نغمہ خاموش سے آباد تھی

کہہ رہا تھا مجھ سے اے دیوانۂ شعر و غزل
ہو گیا سنسان کیوں میخانۂ شعر و غزل

اب تری باتوں میں رنگِ بے قراری کیوں نہیں
تیرے پیمانے میں صہبائے حجازی کیوں نہیں

تیری محفل میں نہیں ذکرِ خدائے لم یزل
آج پھر کیوں بن گیا تو بندۂ لات و ہبل

ہو گیا نا آشنائے جلوہ گاہِ طور پھر
دل کو چشمِ سامری نے کر لیا مسحور پھر

غنچہ و گل دشمنِ فصلِ بہاری ہو گئے
نوجواں تہذیبِ مغرب کے پجاری ہو گئے

دیکھ گردوں گیر ہے تہذیبِ مغرب کی کمند
گرگ کے پنجے سے کب تک بچ سکے گا گوسفند

فتنۂ باطل سے اے جانِ صداقت ہوشیار
مغربی جادو سے اے فرزندِ ملت ہوشیار

اے گرفتارِ الم یکسر پیامِ عید ہو　　رحمتِ حق سے کسی ساعت نہ پے امید ہو

بزمِ ہستی میں ترا نغمہ مسرت خیز ہے
میری صہبا سے تری مینائے دل لبریز ہے

نقشِ سویدا

انہیں ایام میں میں نے نقشِ سویدا کے نام سے ایک طویل قومی نظم لکھی جس کے ایک بند میں شاعرِ مشرق کو اس طرح یاد کیا ؎

ہوا روپوش اقبالؒ نو پرواز مدفن میں
عنادل آج نوحہ گر ہیں ہر سو صحنِ گلشن میں
بچھا درد ہے ہیں شاعرِ مشرق کے رستے پر
بھٹکتے تھے جو گلہائے خنداں حوروں کے دامن میں
نثار اس نے کئے جولتِ بیضا کی شوکت پر
سمندر میں گہر ایسے نہ دریا میں نہ معدن میں
حضورِ مصطفیٰ میں لے گیا وہ ساری امت کو
وہ نظارے دکھائے جو نہ تھے وادیٔ ایمن میں
شبابِ عشق مجھ پر پھٹ پڑا گلزارِ ہستی میں
سنی اس کی نوائے لاالہ جس دم لڑکپن میں
اسی کے نغمۂ جاں بخش نے پہلے پہل ڈالے
ریاضِ عشق کے گلہائے تازہ میرے دامن میں
اسی کے شعلہ ہائے شوق نے اے ہم نشیں ڈالا
شہِ کونین کا طوقِ غلامی میری گردن میں
اُسی کے فکر سے رازِ مسلمانی کو سمجھا ہوں
اُسی کے فیض سے اسرارِ قرآنی کو سمجھا ہوں

تابوتِ افغانی مزارِ اقبالؒ پر

مولانا سید جمال الدین افغانیؒ کی بلند و بالا شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے آپ نے ترکی میں وفات پائی تھی اور ان کا تابوت مبارک وہیں دفن تھا۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں حکومت افغانستان نے سید جمال الدین افغانیؒ کا تابوت ترکی سے کابل لانے کا اہتمام کیا، چنانچہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو یہ تابوت لاہور پہنچا اور شاہی مسجد میں فاتحہ خوانی کے بعد عوام کی زیارت کے لیے شاعرِ مشرق کے مزار کے پہلو میں رکھا گیا۔ اس موقع پر میں نے حسب ذیل اشعار کہے جو روزنامہ شہباز میں شائع ہوئے ؎

نظر آیا مزارِ شاعرِ مشرق کے پہلو میں — مجھے جس وقت تابوت جمال الدین افغانی
طلوعِ مہر و مہ ہے ایک ہی مطلع سے میں سمجھا — دو عالم ہو گئے جلوہ نما اک جا بآسانی
نواحِ عرش میں دونوں کی روحیں کل ملیں باہم — ملے روئے زمیں پر آج دونوں کے تنِ فانی
کشش کتنی ہے خاکِ شاعرِ اسلام میں مسلم — کہ آئی خود بخود پروانہ بن کر شمعِ عرفانی
یہ کیا اعجاز ہے مردانِ حق مر کر بھی زندہ ہیں — ہے زیرِ خاک بھی ذوقِ محبت کی فراوانی

پیامِ زندگی دیتے ہیں ذرے خاکِ تربت کے
کہ مٹی کے یہ تودے ہیں خزینے علم و حکمت کے

صدا تابوتِ افغانیؒ سے تیرے کان میں آئی — کہ اے اسلام کی شانِ گزشتہ کے تمنائی
کبھی سوچا بھی یہ، کیوں قوم کو ادبار نے گھیرا — ہوئی جلوہ گرِ اقوام میں کیوں تری رسوائی
نظر کو کر لیا محروم قرآں کے حقائق سے — حرم میں تو نے پیدا کر دیا رنگِ کلیسائی
کیا تھا ختم جس نے قیصر و کسریٰ کی شوکت کو — سپردِ گوشۂ نسیاں ہے وہ شمشیرِ آبائی
مرے پیشِ نظر اس شاعرِ مشرق کا مدفن ہے — کہ چشمِ کور جس کی خاک سے پاتی ہے بینائی
گزشتہ عظمتوں کو یاد کر کے عمر بھر رویا — اُسے بھولی نہ دینِ مصطفےٰ کی عالم آرائی

سُنا تو نے پیام اس کا مگر سمجھا نہ راز اُس کا
مفسّر ہے کلام اللہ کا ہر تارِ ساز اُس کا

مولانا حسین احمدؒ اور اقبالؒ

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کسی تقریر میں کہا "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے فارسی میں وہ اشعار کہے جو برصغیر کے اسلامی حلقوں میں مولانا حسین احمد کی شہرت کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مولانا حسین احمد اور دوسرے کانگریسی مسلمانوں نے پھر جغرافیائی وطنیت کا نعرہ بلند کیا تو علامہ کے وہی فارسی اشعار پھر اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ اشعار نوائے وقت میں بھی چھپے۔ میں نے علامہ کے ان اشعار کو تضمین کر کے مخمس بنایا۔ یہ مخمس جو درج ذیل ہے اس زمانے میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئی تھی۔

جو جانتا نہیں جینا وہ جانے کیا مرنا — حرم سے ٹوٹ کے دشوار ہے بسر کرنا
جہاں میں ہر کہیں رہنا عرب کا رم بھرنا — عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

حدودِ ہند و سمرقند و چیں سے ہے ملت — ہے فکر بادہ جام کہن سے سرمست
حرم کو چھوڑ کے بت خانے سے ہوا پیوست — سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست

روا نہیں ہے تمیز جمال و صورت و پوست — جہاں میں منحصر الا سے ہیں سب دوست
متاعِ مخزنِ دہلی نہ اصفہاں نہ خوست — بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اقبالؒ کا فیضان

میں نے اپنی زندگی میں برصغیر کے بہت سے علماء، فضلاء، صوفیا، شعرا اور قائدین کو دیکھا ان میں سے اکثر کا قرب بھی حاصل کیا، لیکن شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مشن کی تبلیغ میں بے لوث اور بے غرض پایا۔

مجھے ۱۸ برس (۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۸ء تک) علامہ کی خدمت میں بار ہا حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے دوسرے عقیدت مندوں سے ان کی باتیں سننے کا بھی دن رات موقع ملا۔ میں نے ان سے اور اُن کے کلام سے بے حد فیض حاصل کیا۔ دو دست مجھ سے پوچھتے تھے کہ تمہیں اقبال سے کیا ملا۔ میں کہتا تھا صرف دولتِ لا الہ۔ وہ دولت جو قرآن مجید کی بنا ہے۔ جو اسلام کی بنیاد ہے۔ جس دولت کو تقسیم کرنے کے لیے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ جس دولت سے خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام مالا مال ہوئے۔ میں آج بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے علامہؒ سے صرف دولتِ لا الہ حاصل کی۔ یہ دولت آج بھی اسی فراوانی سے موجود ہے کہ نہیں ہوئی، لٹ نہیں گئی۔ یہ لٹنے سے اور بڑھتی ہے۔ میری یہ خواہش تھی کہ مجھے جو کچھ علامہ کے کلام سے حاصل ہوا اسے دوسرے بھی حاصل کریں۔ چونکہ علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی زبان میں ہے اور بعض لوگ فارسی نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں۔ میں نے ان کی سہولت کے لیے علامہؒ کی مثنویوں (اسرار و رموز، پس چہ باید کرد اور مسافر) کا منظوم اردو ترجمہ۔ ترجمانِ اقبال کے نام سے کر دیا۔ اس سے پہلے میں علامہ کی شہرہ آفاق مثنوی "جاوید نامہ" کا منظوم ترجمہ کر چکا ہوں۔ اب یہ شائقین کا کام ہے کہ وہ اس کلام سے وہ گنجِ گراں بہا حاصل کر لیں۔ جو مجھے حاصل ہوا۔ ترجمان اقبال میں اشعار کی کل تعداد ۲۹۴۲ ہے۔ ان میں ۶۹ اشعار میری جانب سے عرضِ حال کے طور پر لائے ہیں۔ باقی ۲۸۷۳ اشعار علامہ کے کلام کا ترجمہ ہیں۔

علامہ کا مشن

علامہ کا مشن کیا ہے۔ وہی جو قرآنِ حکیم کا مشن ہے۔ جو اسلام کا مشن ہے۔ جو حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا مشن ہے۔ وہ دس بارہ نکات ہیں۔ جو انہوں نے عمر بھر اپنے اردو اور فارسی کلام میں مختلف انداز۔ مختلف اسالیب اور مختلف حکایات اور تمثیلوں کے ذریعے بیان کیے ہیں۔ وہ نکات کیا ہیں؟ توحید و رسالت۔ اخوت (اتحاد بین المسلمین)، فلسفۂ حیات و موت۔ خودی۔ عظمت آدم۔ نظریۂ قوم و وطن۔ جدوجہد (جہاد)

دین و سیاست اور عظمتِ اسلام کی تبلیغ اور امتیازاتِ نسل و نسب و رنگ۔ فرقہ بندی۔ مغربی تعلیم و تہذیب۔ مغربی سیاست و جمہوریت اور اسلام دشمن نظریات کی مذمت۔

علامہؒ مغربی تہذیب و تمدن۔ فرنگی تعلیم کے مقاصد۔ یورپ کی لادین سیاست اور جمہوریت سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے فرنگی نظریات کو اسلام کے منافی اور دین و ایمان دشمن قرار دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ پاکستان میں جو انہیں کا مجوزہ وطن ہے ان کی تعلیم اور ان کے مقاصد کے بالکل خلاف عمل کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے جاوید نامے میں مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ مسلمانوں کو "مسلمانانِ فرنگی مآب" کہا ہے اور اپنے صاحبزادے جاوید (اور نئی نسل) کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی ہے اور انہیں "دشمن دیں اور اہلِ کیں" قرار دیا ہے مگر افسوس ہے کہ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں مغربی تہذیب (مغربی نیشن) اور عیسائیت کی تقلید کر رہے ہیں حتیٰ کہ اپنے قومی تہوار اور بچوں کی سالگرہ تک عیسائی طریقے سے مناتے ہیں۔ اور اپنے نام تک عیسائیوں کے سے رکھتے ہیں۔

بعض علماء فرقہ بندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ میں نے یہ تمام حالات اپنی ایک نظم عرضِ حال میں بھی بیان کیے ہیں۔ جو ماہنامہ ضیائے حرم میں چھپی تھی۔ ملک میں سال میں دو بار (۲۱ اپریل اور ۹ نومبر کو) یوم اقبالؒ منایا جاتا ہے۔ جرائد و رسائل میں گراں بہا مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اقبالیات پر بہت کچھ کہا جاتا ہے مگر اقبالؒ کے کلام کے اُس حصے سے دامن بالکل چھڑا لیا جاتا ہے۔ جو تہذیبِ مغرب کی مذمت کے بارے میں ہے۔ جس میں مغربی تعلیم و تمدن یورپ کی لادین سیاست اور "فتنۂ فرنگ" کی قلعی کھولی گئی ہے۔

دایۂ ما اے دایۂ ما اے دایۂ ما[1]

---

[1] شائع شدہ ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور، اپریل ۱۹۸۰ء

یادِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

صفرا ہمایوں مرزا

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

موت ہر شخص کے لیے ہے، جو دُنیا میں آیا ہے وہ جائے گا ضرور، انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کو فنا ہونا ضروری ہے، لیکن مرنے مرنے میں بھی فرق ہے، یوں تو روزانہ ہزاروں انسان گذر جاتے ہیں کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، ایک وہ موت ہے کہ ایک شخص کے مرنے سے بہت سوں کو رنج ہوتا ہے، اُس کی یاد ایک زمانہ تک دوسروں کے دلوں میں تازہ رہتی ہے۔

سر محمد اقبال مرحوم ہمارے شہر کے رہنے والے نہ تھے لیکن ان کے انتقال کی خبر جب آئی پہنچی تو تمام شہر میں بجلی کی طرح گونج گئی، بڑے بڑے تعزیتی جلسے ہونے لگے، نوجوانانِ [illegible] نے بہت بڑا جلسہ کیا اور گاؤں گاؤں میں جلسے ہوئے، بہت سے اسکولوں میں جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا جلسہ میں نے انجمن خواتینِ دکن کی جانب سے ۲۵ اپریل کو محل ممتاز یار الدولہ کی صدارت میں اسکول صفدریہ واقع ہمایوں نگر میں کیا۔ یہ جلسے وغیرہ آخر کس لیے ہوئے؟ اس کی وجہ تھی کہ سر محمد اقبال جب تک زندہ رہے انہوں نے اپنا وقت دوسروں کی بھلائی کے لیے دیا، ایسی جوشیلی نظمیں لکھیں جس کی وجہ سے ہم بیدار ہوئے، انہوں نے سونے والوں کو جگایا اور اپنے ملک سے محبت کرنا سکھایا، انہوں نے بتایا کہ زندگی کس طرح گذارنی چاہیئے۔ جو انسان دوسروں کے لیے محنت کرتا ہے، جس کے دل میں خلوص رہتا ہے اُس کی زندگی میں بھی اس کی قدر ہوتی ہے اس کے بعد بھی اس کی عزت ہوتی ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر [illegible] اس کی

ہزار سالہ سالگرہ ہوئی۔ اس کی یاد پارسی، مسلمان سب کے دلوں میں تازہ ہے، یہ کس لیے؟ صرف اس کی نیت اور خلوص کا سبب ہے کہ فردوسی کے مرنے کے بعد سالگرہ ہوئی۔ لیکن اقبال مرحوم کی وہ عزت ہوئی کہ ان کی زندگی میں یومِ اقبال منایا گیا۔ میرے خیال میں کسی شاعر کی زندگی میں ایسی قدر و عزت نہ ہوئی ہوگی، مرنے کے بعد جلسے ہوئے تو کیا نہ ہوئے تو کیا مرنے والے کو تو کچھ اس کی خبر نہیں ہوتی، بقول شاعر ؎

ہمیں کیا جو تُربت پہ میلے رہے
کہ ہم تو یہاں بھی اکیلے رہے

یہ اقبالؒ کی اقبال مندی تھی جو اُن کی زندگی میں یومِ اقبال منایا گیا اُن کو ضرور خوشی ہوئی ہوگی، بلکہ روحانی خوشی ان کو ان کی زندگی میں حاصل ہوئی۔ اب وہ مرے نہیں وہ زندہ جاوید ہیں، اُن کا کلام اور اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اقبالؒ کشمیر کے رہنے والے تھے، انہوں نے اپنے بچپن میں جو اشعار کہے وہ لکھتی ہوں ؎

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور — یا نافہ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستان آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور
کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے — اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موت اور زندگی پر مرحوم نے جو اشعار لکھے وہ قابلِ داد ہیں ؎

زندگی انسان کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا
آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں اور کیا گئے — زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

میں اقبال مرحوم کی زندگی کے حالات نہیں لکھ رہی ہوں اور نہ اُن کا کلام لکھ رہی ہوں، اس لیے کہ بہت سے لوگوں نے لکھ دیا ہے۔ اقبال ابرِ نیساں کی طرح آئے اور موتی برسا کر ہمارے لیے چھوڑ گئے۔ سر محمد اقبال مرحوم سے میری خط و کتابت ۱۹۲۲ء سے تھی جب میں نے رسالہ "النساء" حیدر آباد دکن سے جاری کیا تھا تو رسالہ اُن کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے جو خط مجھے لکھا تھا وہ درج کرتی ہوں :-

مکرّمہ!

تسلیم! رسالہ "النساء" کے لیے نہایت سپاس گذار ہوں، یہ بہت اچھا رسالہ ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ مسلمان عورتوں کے لیے بہت سبق آموز ہوگا۔ میں کچھ مدت سے اُردو میں بہت کم لکھتا ہوں لیکن اگر کچھ اُردو اشعار ہوگئے تو بھیجوں گا۔

محمد اقبال بیرسٹر لاہور، ۲۸ نومبر ۱۹۲۲ء [۱]

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں میں نے ایک خط اور لکھا تھا کہ آپ اپنا کلام رسالہ "النساء" کے لیے بھیجئے اس کا جو جواب آیا اس کی نقل بھی لکھتی ہوں:-

مخدومہ جناب صغریٰ ہمایوں بیگم صاحبہ!

تسلیم! آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، میری صحت ایک مدت سے خراب ہے اس واسطے لٹریری مشاغل کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا ہوں۔

"پیامِ مشرق" نام کا ایک مجموعۂ نظم جو فارسی میں ہے، تیار ہو رہا ہے، شاید دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا، انشاء اللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا، لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہنچے تو بلا تکلف یاد دلا دیجئے۔ آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے لیکن میں نے آپ کا خط جو "ہزار داستان" میں شائع ہوا ہے، پڑھا ہے، اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ نریادؔ مرحوم کی لٹریری عظمت سے کس کو کلام ہو سکتا ہے جن کے شاگردوں میں شادؔ عظیم آبادی ہوں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص۔ محمد اقبال لاہور ۱۸ فروری ۲۳ [۲]

۱۹۲۳ء تک سر محمد اقبال صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ۱۹۲۸ء میں جب ہم کشمیر گئے تھے تو راستہ میں لاہور چند روز ٹھہرنا ہوا۔ ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال مرحوم کا مکان تھا، پھاٹک پر بورڈ لکھا ہوا تھا، بیرسٹر صاحب سر محمد اقبالؒ سے ملنے گئے۔ اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی موٹر بھیج کر مجھے بلوایا، میں نے ایک منظم نور جہاں کے مزار پر چڑھانے لکھی تھی وہ اُن کو دکھائی، اس میں مرحوم نے اصلاح دی، اس لیے وہ میرے اُستاد بھی ہوئے اور

میرے آٹوگراف البم میں سر محمد اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ لکھتی ہوں :-

"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی ذات باری پر پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا"

محمد اقبال لاہور ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء

اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں موت کا ڈر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جو میرے اوٹوگراف میں لکھا تھا وہی جملے اُن کے آخر وقت بھی زبان سے نکلے۔ وہ اپنی بیوی کو کہیں بھجواتے نہ تھے اور نہ کسی سے ملاتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں بیگم عبدالقادر صاحب سے ذکر آیا۔ میں نے کہا میں سر محمد اقبال صاحب کی بی بی کے ہاں گئی تھی، انہوں نے چائے پر مجھے بلایا تھا، تو بیگم عبدالقادر صاحب کو سخت تعجب ہوا، انہوں نے کہا ہمارے صاحب اور سر محمد اقبال صاحب کی بہت دوستی ہے مگر آج تک ہم نے بیگم محمد اقبالؒ کو نہ دیکھا اور آپ مل آئیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مہمان نواز دل رکھتے تھے اور مسافر کی قدر اُن کے دل میں تھی۔

اور ایک اتفاق عجیب ہوا ہم ۱۹۲۴ء میں لندن گئے، کیمبرج میں ایک انڈین مجلس ہے جس میں ہر ماہ جلسہ ہوا کرتا ہے، کسی نہ کسی بڑے آدمی کو دعوت دی جاتی ہے وہ تقریر کرتا ہے۔

ہم جب لندن میں تھے اُس زمانہ میں سر علی امام صاحب مرحوم کو تقریر کرنے انڈین مجلس والوں نے بلایا تھا، سر علی امام نے بیرسٹر صاحب سے اور مجھ سے کہا کہ آپ لوگ بھی چلیں۔ چنانچہ لندن سے کیمبرج تک بیگم سر علی امام، سر علی امام صاحب، سر کشن گپتا صاحب اور بیرسٹر صاحب ہم سب موٹروں میں گئے، وہاں جانے کے بعد مجھے سر کشن گپتا صاحب اور وہاں کے لڑکوں نے کہا کہ آپ بھی تقریر کریں، آپ اردو میں تقریر کر سکتی ہیں، یہ انڈین مجلس ہے۔ سر علی امام صاحب کی تقریر کے بعد میں نے تقریر کی، میری تقریر لوگوں کو پسند آئی۔ جب ہم کیمبرج سے لندن واپس گئے سر علی امام صاحب اور سر کشن گپتا صاحب نے میری تقریر کی بڑی تعریف لوگوں سے کی کہ یہ تیار نہ تھیں یک بیک مردانہ جلسہ میں زبانی تقریر کی، لڑکوں کو خوب نصیحت کی۔

اس کے بعد مس بیک صاحبہ جن کے بھائی مسٹر بیک علیگڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے، انہوں نے

میرے لیے ایٹ ہوم جلسہ مقرر کیا جس میں عورتوں کی تعلیم پر تقریر کرنے کی مجھ سے فرمائش کی، میں نے اردو میں تقریر کی، اس کا ترجمہ انگریزی میں آفتاب اقبال نے کیا، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سر محمد اقبال صاحب کے یہ بڑے فرزند ہیں۔

حضرتِ اقبالؒ کے لیے ہم جس قدر رنج کریں کم ہے، اب ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کہ اُن کا جانشین کس کو قرار دیں، یوں تو اردو اور فارسی کے شعراء بہت ہیں لیکن اس جوش سے بیدار کرنے والا دکھائی نہیں دیتا۔

میں آخر میں دعا کرتی ہوں کہ خدا سر محمد اقبال مرحوم کے پسماندوں کو صبر عنایت فرمائے اور ہم سب کو بھی صبر دے اور ان کی نصیحتوں پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین

خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ہمیشہ اُن کے مزار پر پھول برستے رہیں۔

◎

حواشی

۱؎ مشمولہ اقبالنامہ اول ص۲۱۴

۲؎ جناب سید شاہ الفت حسینی صاحب فریاد عظیم آبادی میرے خسر تھے اور شاد عظیم آبادی سید ہمایوں مرزا صاحب کے عزیز بھی تھے اور حضرت فریاد کے شاگرد، حضرت شاد نے حضرت فریاد کی سوانحعمری لکھی ہے جس کا نام "حیاتِ فریاد" ہے۔

۳؎ مشمولہ اقبال نامہ اول ص۲۱۴ : یہاں تاریخ محررہ ۲۸، فروری درج ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔

۴؎ سر علی امام (۱۸۶۹ — ۱۹۳۱) علامہ نے اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انتساب بھی ان کے نام کیا تھا: دوسری گول میز کانفرنس میں وہ ملوجا جہاز پر علامہ کے ہمسفر بھی تھے۔

۵؎ "سب رس" جون ۱۹۳۸ء

نوٹ: ۲؎ کے تحت حواشی صغرا بیگم کے اصل مضمون میں درج ہیں۔

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء الدین احمد برنی

ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ کو میں نے پہلے پہل آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سنہ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں دیکھا تھا جہاں انہیں "ترجمانِ حقیقت" کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اس وقت انہوں نے بلادِ اسلامیہ کی نظم کا وہ ٹکڑا جس کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنایا تھا اور ایک تقریر بھی کی تھی۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ موقع نہ ملا کہ میں ترنم کے ساتھ ان کا کلام سن سکوں۔

دہلی یونیورسٹی کے قیام سے پیشتر دہلی کے طلباء اعلیٰ امتحانات کے لیے لاہور جاتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں بی اے (B.A) کے امتحان کے سلسلہ میں میں لاہور گیا۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ واقع انارکلی پہنچا۔ دہلی سے چلتے وقت میں نے خواجہ حسن نظامی سے تعارفی خط لے لیا تھا تاکہ ملاقات میں دشواری نہ ہو، پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے انتہائی محبت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے لسی کے ایک گلاس سے میری تواضع بھی کی۔ میں بہت دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا کہ "کون کون سے شعراء کا کلام زیادہ تر آپ کے زیر مطالعہ رہتا ہے؟" فرمایا "حافظ، مولانا روم، غالب، گوئٹے وغیرہ"۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ مسائل زیر بحث آگئے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "فرقہ وارانہ ذہنیت نے پنجاب کی فضاء کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ اگر کسی ہندو ممتحن کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس لڑکے کے پرچے وہ جانچ رہا ہے، وہ مسلمان ہے تو وہ یا تو اسے فیل کر دے گا یا اگر وہ اونچے نمبر پر آنے والا ہے تو اسے اتنے کم نمبر دے گا کہ وہ غریب مشکل سے پاس ہو سکے، یہی حالت مسلمان ممتحن کی ہے، وہ بھی بے دریغ ہندو لڑکے کو یا تو فیل کر دے گا یا اس کے نمبروں میں

کنز بیرنت سے کام لے گا بشرطیکہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ پرچہ ہندو طالبعلم کا ہے"۔ اس سلسلہ میں انہوں نے فرمایا:۔ "میں بھی بی۔اے اور ایم۔اے میں فلسفہ کے مضمون میں ممتحن مقرر ہوتا ہوں، مگر میں نے کبھی کسی امیدوار کے ساتھ بے انصافی نہیں برتی"۔ جب مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب فلسفہ کے ممتحن ہیں تو میں نے طفلانہ جسارت سے کام لے کر رعایت حاصل کرنے کی غرض سے انہیں اپنا رولنمبر بتا دیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت بگڑے اور غصہ کے لہجہ میں (مگر نہایت اخلاق سے) فرمایا:۔ "آپ امیدوار ہیں، آپ کو ممتحن سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی آپ کی گفتگو غیر مناسب ہے"، اتنا کہنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ "اب آپ جا سکتے ہیں"۔

راستہ بھر مجھے سخت ندامت رہی لیکن چھٹا ہوا تیر کیسے واپس آتا، اور اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اپنے رویہ کے بارے میں غیر مشروط معذرت درج تھی، اور ان سے درخواست کی گئی تھی کہ "از خوردان خطا و از بزرگاں عطا" کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ میری بدتمیزی پر چشم پوشی فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"میں نے اس موقع پر جو کچھ عرض کیا تھا اس میں اخلاقی اعتبار سے بالکل حق بجانب تھا، اس کو آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اور معاملہ ہوتا یا اب ہو تو میں ہر طرح آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں"۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال، لاہور

اس کے بعد میں نے ایک اور خط بھیجا جس کے جواب میں انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ:۔

"..... اس واقعہ کا کوئی اثر میرے دل پر نہ تھا اور نہ اب ہے، آپ بلا تکلف جب چاہیں میرے غریب خانہ پر تشریف لائیں"۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال

بی۔اے میں میرے تین مضامین تھے۔ انگریزی، فلسفہ اور فارسی۔ آخری مضمون میں مجھے غالباً

۹۸ فیصدی نمبر ملے ہوں گے۔ لیکن جس دن فلسفہ کا امتحان ہونے والا تھا اُس دن یونیورسٹی نے یکایک امتحان کا مرکز بدل دیا۔ بہرحال میں بہت گھبرایا ہوا نئی جگہ پہنچا۔ افسران نے مجھے اس شرط پر امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی کہ مقررہ وقت سے ایک منٹ زیادہ نہیں دیا جائے گا جب پرچہ لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ پورا آدھ گھنٹہ گذر چکا ہے، اگر مجھے پورا وقت مل جاتا تو یقیناً میرا پرچہ بہت ہی اچھا ہوتا۔ مگر خدا بھلا کرے ڈاکٹر صاحب کا کہ انہوں نے میری توقعات سے بڑھ کر مجھے نمبر دیئے، اور کوئی ہوتا تو مذکورہ بالا واقعہ کے پیش نظر مجھے فیل کر دیتا اور میرا نام تادیبی کاروائی کی خاطر یونیورسٹی کو بھیج دیتا، ڈاکٹر صاحب کی اس شرافتِ نفس کا سکہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات بہت صمیمانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد میرا لاہور جانا ہوا جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُن کی طرف سے وہی پہلی سی محبت و شفقت کا اظہار ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ جب میں نے ۱۹۱۸ء میں انجمن حضرات کے لیے "کلید انجمن" لکھی اور اسے ان کے اسمِ گرامی سے منسوب کرنا چاہا تو انہوں نے کمال مہربانی سے ڈیڈیکیشن منظور فرمایا، اسی طرح جب ۱۹۲۱ء میں میری کتاب "جہانِ آرا بیگم" شائع ہوئی تو انہوں نے مجھے ذیل کی رائے سے سرفراز فرمایا:۔

"لاہور - ۲ر اپریل ۱۹۲۲ء

مکرمی بندہ، السلام علیکم ..... آپ نے "جہانِ آرا بیگم" کی سوانحعمری بہت اچھی لکھی ہے اس کی زندگی واقعی ایک نیک مسلم عورت کا نمونہ ہے ..... والسلام

محمد اقبال"

ایک ملاقات میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اپنی ایک نظم میں جو یہ شعر لکھا ہے ؎

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ سر محمد شفیع جیسے اُستاد کی موجودگی میں آپ کو یہ شعر نہ لکھنا چاہیئے تھا۔ ہنس کر فرمایا کہ "شعر اسی لیے کہا گیا ہے تاکہ لوگ وہی سوال کریں جو آپ نے کیا ہے"، اسی

سوال میں پورا جواب مضمر ہے۔"

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی جب کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس ہوئے تھے اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ انہی دنوں ایک سہ پہر کو محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے دولت کدہ "ایوانِ رفعت" میں انہیں چائے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر ہائیکورٹ کے جج مرزا علی اکبر خاں، مولانا محمد عرفان، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اور بہت سے دوسرے اکابر و فضلاء موجود تھے، یہ ٹی پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پُر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دلآویزی پیدا ہو گئی تھی۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا تاکہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹاؤں۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ بیگم صاحبہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ "موٹر لے کر جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔" ابھی چند ہی فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آ رہے ہیں، میں اُن کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ "آپ کا وہاں بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا کہ "یہ کام تو آپ پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں اُنہیں آپ کس مد میں ستا رہے ہیں؟" بہر حال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضامند ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم "ایوانِ رفعت" پہنچ گئے جہاں دروازہ پر بیگم صاحبہ اور فیضی رحمین صاحبہ نے انا کا استقبال کیا۔ بیگم صاحبہ کے شکوہ و شکایت کے بعد ہم سب لان میں پہنچے، ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا اتنا کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ عطیہ بیگم سے ہنس ہنس کر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مذاقیہ جملے بھی کستے جاتے تھے، مجھے ایک جملہ یاد رہ گیا ہے، دورانِ گفتگو میں عطیہ بیگم نے کہا:۔ "اقبال! یاد رکھو، بچہ کے لیے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا:۔ "اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟" عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کر دیا۔

چائے نوشی سے فارغ ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے معزز مہمان کا تعارف کرایا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ کچھ پیغام دیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ہی اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ "یہی میرا پیغام ہے۔" وہ شعر یہ ہے:۔

؎ چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا زکردۂ خود شرمسار تر گردد

جو لوگ فارسی سمجھتے تھے وہ اس لافانی شعر سے اور پیغام کی عظمت سے گہرے طور پر متاثر ہوئے، لیکن جو لوگ فارسی سے نابلد تھے اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا اور اصرار کیا کہ وہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ لکھوا دیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے اُس کا ترجمہ لکھوا دیا، وھو ھذا:۔

"LIVE SO BEAUTIFULLY THAT IF DEATH IS THE END OF ALL GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME FOR HAVING ENDED THY CAREER"

لان سے سب حاضرین کو باں میں لے جایا گیا جہاں رقص و سرود کا انتظام تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا، تھوڑی دیر تک موسیقی ہوتی رہی اور اس کے بعد رقص ہوا۔ ایک کاں کلوٹی عیسائی عورت نے اپنے "کمالات" دکھائے۔ رقص کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے اشعار لکھ کر انہیں عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کیا:۔

؎ ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب، اندر
برکشت و بیاباں ہیچ برکوہ و بیاباں ہیچ
برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں تورے نالد بہ رباب اندر

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا مزاحیہ شعر ایک کاغذ پر لکھ کر عطیہ بیگم کو دیا:۔

"پرائیویٹ

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ!
کہیئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

(محمد اقبال) بمبئی ۱۰ ستمبر ۳۱ء"

تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہاتھ ملائے اور "ایوانِ رفعت" سے رخصت ہو گئے۔

میں نے نومبر ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس کا جواب اُن کے رفیق چوہدری محمد حسین نے دیا۔[۵۹] اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اُن کی حالت اب ایسی ہو گئی ہے کہ وہ اب خطوں کا جواب بھی نہیں لکھ سکتے حالانکہ تندرستی کے زمانہ میں وہ سونے سے پہلے اُس دن کے تمام خطوط کا جواب دے دیا کرتے تھے۔

لاہور کے انٹرمیڈیٹ کالجوں کے طلباء کی اپیل کے جواب میں ہم نے بھی بمبئی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو "یومِ اقبال" منایا تھا، یہ دن سارے ہندوستان میں منایا گیا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے حضور میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے اور اُن کی صحت کے لیے دُعائیں مانگی جائیں۔ اس جلسہ میں جو کاؤسجی جہانگیر ہال میں منعقد کیا گیا تھا، مسز نائیڈو نے بھی معرکۃ الآراء تقریر کی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہم سب سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔

اقبالؒ کی وفات سے اسلام کا ایک فقید المثال مُفکر، مُجتہد، فلسفی اور شاعر دنیا سے اُٹھ گیا ؎

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک "دانائے راز" آید بروں

حواشی

۱ "ترجمانِ حقیقت" کا خطاب دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں دیا گیا تھا۔ تحریک علامہ شبلی نعمانی کی طرف سے ہوئی تھی جس کی تائید خواجہ کمال الدین نے کی تھی۔ (عظمتِ رفتہ ص ۱۰۵)

۲ یہ نظم سب سے پہلے "مخزن" اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

۳ مکمل خط "انوارِ اقبال" ص ۱۴۱ پر شائع ہوا۔

۴ مکمل خط "انوارِ اقبال" ص ۱۴۶ میں موجود ہے، تاہم "انوارِ اقبال" میں اس خط کی تاریخ محررہ ۱۲ اپریل درج ہے۔

۵ وفات ۴ جنوری ۱۹۶۷ء

۶ فیضی رحمٰن، عطیہ بیگم سے شادی کرنے سے پہلے یہودی تھے۔ عطیہ بیگم کے اثر سے مسلمان ہوئے، عبرانی زبان کے ماہر تھے، نامور آرٹسٹ (مصور) تھے، تاریخ اور شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔

۷ مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے، ضیاء الدین احمد برنی کا مضمون "اقبال، دیگر مشاہیر اور عطیہ فیضی" مطبوعہ ماہ نو اپریل ۱۹۶۷ء

۸ اقبال کا یہ خط تاحال کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔

۹ مسز سروجنی نائیڈو ۱۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئیں اور ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو انتقال کر گئیں۔

میں ہر وقت اُن کے قریب ہی رہتا تھا۔ رات کو میری چارپائی اُن سے زیادہ دور نہیں ہوتی تھی، چنانچہ جونہی ان پر شعر کی کیفیت طاری ہوتی وہ پکار کر کہتے: —
"علی بخش! کاغذ پنسل لاؤ بھئی!"
اور میں فوراً دونوں چیزیں انہیں مہیا کر دیتا۔ عام طور پر شعر کہتے وقت ان کا چہرہ تھوڑا سا سُرخ ہو جاتا اور آنکھوں میں عجیب چمک سی پیدا ہو جاتی، مگر جب وہ شعر لکھ لیتے تو تکیے پر سر رکھ کر بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیتے، گویا سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

(علی بخش) ملازم اقبال

(مطبوعہ: قندیل، ۳ مئی ۱۹۵۳ء — صفحہ ۱۳)

ڈاکٹر اقبالؒ سے پہلی ملاقات

سید ذوالفقار علی بخاری

میری زندگی کے طوفان کی منجدھار ریڈیو ہے، جی چاہتا ہے کہ داستان کا آغاز اسی منجدھار سے کروں، لیکن پہلے اجازت دیجئے کہ شملے کا ذکر کردں کیونکہ میرا اور ریڈیو کا معاملہ شملے ہی سے شروع ہوتا ہے۔

کلکتے کا فورٹ ولیم کالج ٹوٹا تو اس کے بدلے انگریزوں نے شملے کے آرمی ہیڈ کوارٹرز کے جنرل سٹاف میں ایک چھوٹا سا محکمہ بورڈ آف ایگزامینرز کے نام سے قائم کر لیا، مشرقی زبانوں میں امتحان دینے والے فوجی اور انتظامیہ کے افسروں کا امتحان لے کر ان کو سند دینا اس محکمے کا کام تھا۔ مجھے اس محکمے میں بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اس وقت میری عمر اکیس برس کی تھی، کلکتے کے کالج آف فورٹ ولیم کے زمانے میں میری آسامی پر شمس العلماء خان بہادر محمد یوسف رنجور اور خان بہادر برکت علی صاحب فائز تھے، اس ملازمت کے لیے درخواست بھیجنے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔

میں پشاور کے ایک قہوہ خانے سے باہر نکلا کہ ایک دوست قاضی صاحب مل گئے ان کے ہاتھ میں لاہور کے اخبار "ٹریبون" کا تراشہ تھا، جسے پڑھ پڑھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے کیفیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بکس نمبر فلاں معرفت ٹریبون لاہور کی طرف سے ایک اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی جانتا ہو۔ قاضی صاحب تو برابر مسکرا رہے تھے کہ لو بتاؤ اتنی ساری زبانیں جاننے والا ان کو کون ملے گا، لیکن میں سوچ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ ان سب زبانوں میں تھوڑی بہت شُد بد تو رکھتا ہوں، اگر میں اس آسامی کے لیے درخواست دے دوں تو حرج ہی کیا ہے، اور کچھ نہیں تو ذرا مذاق ہی رہے گا۔

میں نے قاضی صاحب سے اشتہار لے لیا اور ایک ٹائپ کرنے والے کی دوکان میں گھس گیا وہاں بیٹھ عرضی ٹائپ کی اور ڈاک میں ڈال دی، میں نے عرضی میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر میرے متعلق مزید معلوم کرنا ہو تو پروفیسر محمد سعید دہلوی اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو زحمت دی جائے۔

اس بات کو مہینہ ڈیڑھ گذر گیا اور میں محض دشت نوردی کے لیے لاہور آیا، اس زمانے میں میرے مرحوم بھائی احمد شاہ بخاری سنٹرل ٹریننگ کالج میں پروفیسر تھے، اور دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں مقیم تھے، میں بھی ان کے ساتھ دہلی مسلم ہوٹل میں فروکش ہوا۔ عجیب مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے دو تین دن گذر گئے تو انہوں نے مجھ سے کہا عجیب نالائق ہو، کب کے آئے ہو اور ابھی تک نہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سلام کے لیے حاضر ہوئے نہ مرزا صاحب کے یہاں، ملازمت کی درخواست میں ان کے نام کا حوالہ دینے دینے میں ہیں باک نہیں لیکن ان کی خدمت میں حاضر ہونے میں تساہل برتتے ہو۔

بھائی اس قدر برہم تھے کہ ان سے مزید تفصیلات پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی، سیدھا مرزا صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا۔ پائجامہ، کرتا اور رلی کی صدری پہنے باہر تشریف لائے، سرکنڈے کے ایک مونڈھے پر مجھے بیٹھنے کا حکم دیا اور خود دوسرے مونڈھے پر تشریف فرما ہوئے، میں خاموش بیٹھا تھا، مرزا صاحب بھی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا:۔

آپ شملے کب جا رہے ہیں؟

مرزا صاحب ہمیشہ چھوٹوں کو آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے، ایک دن میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ آپ کا جواب آپ، تم کا تم اور تو کا تو ہے، اب چھوٹوں سے تم، اور تو کون سنے، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔

مرزا صاحب نے شملے کا جو پوچھا تو سکتے میں رہ گیا، رک رک کر کہا قبلہ میں شملے جا کر کیا کروں گا میرا تو وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں، مرزا صاحب کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ وہ اشتہار جو ٹریبون میں کسی بکس نمبر کے حوالے سے چھپا تھا دراصل شملے کے بورڈ آف ایگزامینرز جنرل اسٹاف کی طرف سے تھا، وہاں اُن کو بورڈ کے ممبر کی ضرورت

ہے، مرزا صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے استفسار پر میری سفارش کر دی ہے۔
مرزا صاحب سے رخصت ہو کر میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجور کا ذکر کیا، کالج آف فورٹ ولیم کا ذکر کیا، گل کرسٹ وغیرہ کے کارنامے کا ذکر کیا۔ جانسن، فورلس، فلاٹ وغیرہ کا تذکرہ کرتے رہے اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑا گیا، میں نے سوچا میں کیا اور میری بساط کیا، جہاں ایسے ایسے لوگ کام کر چکے ہیں، جا کر کیا کروں گا، یقین مانیے میں کچھ دل برداشتہ سا ہو گیا، بس ایک ہی بات دل کو تقویت پہنچاتی تھی اور وہ یہ کہ انگریز کا محکمہ ہے، سمجھے گا کہ مرزا صاحب نے اور ڈاکٹر صاحب نے محض محبت کی بناء پر لکھ دیا، ورنہ ایک اکیس برس کا نوجوان اور وہ بھی کج مج زبان، رنجور کی جانشینی کرنے کے قابل کہاں، لیکن قدرت کو میری آزمائش منظور تھی، لاہور سے پشاور گیا تو گھر پر ایک خط پڑا پایا، جس میں لکھا تھا کہ تمہاری درخواست منظور کی گئی ہے تم کو عنقریب شملہ بلایا جائے گا، اور آزمائشی طور پر ملازم رکھا جائے گا، تیار رہو، کچھ دن کے بعد ایک اور خط ملا، جس میں لکھا تھا کہ ملازمت کے لیے شملہ آؤ، خط کے ساتھ ریل کا ایک فوجی پاس بھی تھی تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۲۵ء کا تھا (علامہ اقبال سے یہ میری پہلی ملاقات تھی)[۳]

حواشی

۱ ؎ پروفیسر مرزا سعید دہلوی — گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور استاد اور علامہ کے ہمعصر۔ پیدائش ۱۸۸۶ء

۲ ؎ احمد شاہ پطرس بخاری — سید ذوالفقار شاہ بخاری کے بڑے بھائی مشہور مزاح نگار۔ (پیدائش ۱۸۹۸ء پشاور) — (وفات ۱۹۵۸ء امریکہ)

۳ ؎ مصنف کی کتاب "سرگذشت" سے ماخوذ؛ شائع شدہ ۱۹۶۶ء

اقبالؒ اور طلبِ علم

(یادداشتیں)

حاجی سردار محمد

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نہ صرف علماء و فضلا، خاص و عوام بلکہ طلبہ میں بھی مقبول تھے۔ عزیز طلبہ کو میں ذیل میں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔ ایک میں تو اُن کی علمی جستجو کا بیان ہے کہ آپ طلبِ علم میں کس طرح سرگرداں رہتے تھے کہ جب تک کسی بات کی تہہ تک نہ پہنچ جاتے، چھوڑتے نہ تھے خواہ کتنی ہی محنت کرنا پڑے۔ غالباً آپ کے مندرجہ ذیل شعر میں مسلمانوں کو اپنے اس ادبار کے زمانے میں کئی علم کا احساس دلایا گیا ہے ؎

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی خزف چیں لب ساحل ہوں میں

اس شعر میں نیوٹن کے قول کی جزوی ترجمانی بھی معلوم ہوتی ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ میری حالت اُس شخص یا بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے کنکریاں چُن رہا ہو حالانکہ سمندر کی گہرائیوں میں موتی چھپے ہوئے ہیں۔

۱۹۲۴ء میں جب میں میڈیکل میں سیکنڈ ائیر کا سٹوڈنٹ تھا، میڈیکل کالج کے ہوسٹل کے لڑکوں نے عید میلاد النبیؐ کی تقریب منائی، اُس وقت ابھی نیو ہوسٹل تعمیر نہ ہوا تھا۔ حضرت علامہ اقبال کو صدارت کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمالی۔ ڈاکٹر باٹ (مشہور سرجن) بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے، حضرت علامہ اقبالؒ نے صدارتی تقریر میں حضرت مولانا رومیؒ کا شعر

پڑھا (وہ اِس وقت یاد نہیں رہا) اور فرمایا کہ میں اُس وقت تک اس کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا جب تک میں نے طبّ کی فلاں کتاب (نام اب یاد نہیں رہا) کا مطالعہ نہ کر لیا۔

اس واقعہ سے میں طالب علموں کی توجہ دو باتوں کی طرف دلاتا ہوں۔ اوّل ہمارے بزرگوں میں بے شمار ایسے لوگ گذرے ہیں جن کے اشعار میں بھی طبّ یا اس قسم کے دوسرے علوم کے استعارے شامل ہوتے تھے جن کے علم کے بغیر معانی تک رسائی نہ ہوتی تھی۔

دوم حضرت علامہ باوجود اپنے علم و فضل کے حصولِ علم کے لیے ہمہ وقت مصروف رہتے، دراصل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مشہور حدیث: اطلبوا العلم من المھد الی اللحد (علم کی جستجو اور طلب پنگھوڑے سے قبر کی لحد تک جاری رکھو) کی عملی جھلک مسلمانوں کے ایسے ہی واقعات میں نظر آتی ہے۔

۱۹۲۸ء میں مَیں جب فیروز پور چھاؤنی، اسلامیہ ہائی سکول میں سائنس ٹیچر تھا، اپنے کسی کام سے لاہور آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اُسی روز رات کو "سیرت النبی رحمۃ للعالمین" کے مصنّف قاضی سلمان منصور پوری (مرحوم) کی تقریر جیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں ہے اور صدارت حضرت علامہ اقبال کریں گے، میں بھی پہنچ گیا، تقریر کا موضوع تھا ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسٰے یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق ہی کہا گیا ہے کہ دیگر انبیاء کرام میں علیحدہ علیحدہ جو خوبیاں تھیں وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم میں تن تنہا جمع تھیں۔

قاضی صاحب (مرحوم) نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السّلام کی علیحدہ علیحدہ خوبیاں گنوائیں اور پھر واقعات و شواہد کی روشنی میں ثابت کیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم میں تن تنہا وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو علیحدہ علیحدہ تمام انبیاء کرام میں ایک ایک کر کے موجود تھیں۔ اس سے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے علو مرتبت اور افضل الانبیاء بلکہ افضل البشر ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ اقبال صدارتی تقریر کے لیے اُٹھے اور قاضی صاحب کی تعریف

تو کی کہ انہوں نے موضوع کو خوب نبھانے کی کوشش کی ہے لیکن حضور کی علو مرتبت پوری طرح واضح نہیں ہوتی حقیقت یہ ہے کہ انبیاء سابقین میں جو صفات جمع ہو گئی تھیں وہ درجۂ کمال میں نہ تھیں، وہ صفات الگ الگ بدرجۂ کمال پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوئیں۔ اس طرح بشریت اپنے انتہائی کمال کو پہنچی۔

بعینہٖ یہی مضمون حضرت سید عبدالعزیز دباغ مغربی نے بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے مرید علامہ احمد بن مبارک سجلماسی کی کتاب "ابریز" میں دیا گیا ہے جس کا اردو ترجمہ "خزینۂ معارف" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

(شائع شدہ رسالہ اقبال (اقبال ہاسٹل) اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

برطانوی حکومت کی طرف سے ۱۹۲۳ء میں "سر" کا خطاب اور اس اعزاز سے وابستہ تلوار اور بگل ملنے پر علامہ اقبال نے گورنر ہاؤس لاہور میں اپنے پڑوسی مسٹر نذیر احمد کے والد سے کہا کہ یہ "تلوار اور بگلوس (بگل) میرے کس کام آئے گی؟ دراصل مجھے ضرورت تو روپے اور رہنے کے لیے ایک مکان کی ہے تاکہ میں اپنے گھر میں سکون کے ساتھ بیٹھ کر شاعری کر سکوں۔"

(راوی نذیر احمد: امروز: ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء)

اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات

یوسف حسین خان

یوسف حسین خان کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے، انکی کتاب "روح اقبال" اقبال پر لکھی جانے والی بہترین تین کتابوں میں سے ایک ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حسین خان، محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۱۵ء میں کوہاٹ سے ہجرت کر کے قائم گنج میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے والد فدا حسین خان کا شمار حیدرآباد کے کامیاب وکیلوں میں ہوتا تھا، قانون پر ان کی تصانیف کی تعداد بیس کے قریب ہے۔ یوسف حسین خان ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے، ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ اسکول میں داخلہ لیا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ کے قیام کے اعلان کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر دہلی چلے گئے، مئی ۱۹۲۶ء میں جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس روانہ ہوئے، دسمبر ۱۹۲۶ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اسی اثنا میں اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی سیر بھی کی، جنوری ۱۹۳۰ء میں واپس ہندوستان آگئے اور حیدرآباد میں مولوی عبدالحق کے ساتھ انگلش اردو ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے، اکتوبر ۱۹۳۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں باقاعدہ ملازم ہو گئے، دسمبر ۱۹۳۱ء میں شادی ہوئی۔ حیدرآباد کا قیام ۲۸ برسوں پر محیط ہے، اس دوران میں متعدد علماء و فضلاء سے ذاتی روابط پیدا ہو گئے، ۱۹۵۶ء میں حکومتِ ہند نے آسٹریلیا کے سفر پر بھیجا، وہاں انہوں نے "ہندوستانی تہذیب" پر لیکچر دیئے، عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں پنشن حاصل کی، ۱۹۵۸ء میں آپ کو علی گڑھ کالج کا پرووائس چانسلر مقرر کیا گیا، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں (۱) تاریخ ہند (۲) تاریخ دکن (۳) مبادی عمرانیات (۴) نظام الملک آصف جاہ (۵) روحِ اقبال (۶) اردو غزل (۷) حسرت کی شاعری (۸) فرانسیسی ادب (۹) روحِ غالب (۱۰) یادوں کی دُنیا۔ (۱۱) حافظ اور اقبال (۱۲) غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات

"یادوں کی دُنیا" یوسف حسین خان کی آپ بیتی ہے جسے آپ نے دسمبر ۱۹۶۵ء میں لکھنا شروع کیا اور ایک سال کے عرصہ میں مکمل کیا "علامہ اقبال سے ملاقات" کا حال الگ عنوان کے تحت بھی درج ہے، اقبال کے متعلق بعض اشارے کتاب میں بکھرے پڑے تھے، مرتب نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ خیالات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے مرتب نے کہیں کہیں اپنی طرف سے بھی عبارت شامل کی ہے، تاہم اس اضافی عبارت کو قلابین میں درج کر دیا گیا ہے۔[۱]

بچپن ہی سے اقبال نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور بڑی قوت سے کھینچا۔ میں جب جامعہ میں تھا تو "بانگِ درا" مجھے تقریباً پوری یاد تھی اور "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی" اور "پیامِ مشرق" بھی میں نے بڑی توجہ سے پڑھی تھیں اور ان کے بھی بعض حصے مجھے یاد تھے[۲] (اقبال سے عقیدت کی وجہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت تھی جو جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے) انہوں نے جمعوں میں اپنے درس کا سلسلہ شروع کیا، ان درسوں کا موضوع تھا "اسلام اور اسلامی زندگی" جب بولتے تو فصاحت و بلاغت کا دریا بہا دیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے، چار چار گھنٹے متواتر تقریر کا سلسلہ جاری رہتا سننے والے ہیں کہ کوئی اپنی جگہ سے اُس سے مس نہیں ہوتا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سُننے سے سیری ہوتی ہی نہیں، صبح ناشتے کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا تو ڈیڑھ دو بج جاتے، لیکچر دینے والے اور لیکچر سننے والے ایسا لگتا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں، یہ دُنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علی جوہر لیکچر کے دوران میں اقبال کی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کے اشعار کی توضیح کرتے[۳] (یہ اکتساب علمی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور مولانا محمد علی گرفتار ہو گئے)

۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی قیدِ فرنگ سے چھوٹ کر جامعہ تشریف لائے تو محمد علی ہال میں انجمنِ اتحاد کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا، یہ جلسہ جامعہ کے نہایت شاندار جلسوں میں شمار ہوتا ہے۔ جامعہ والوں کے علاوہ اس میں باہر کے بہت سے لوگ بھی شریک ہوئے تھے، ہم لوگوں نے محمد علی ہال کو پھولوں پتیوں سے خوب آراستہ کیا تھا، اس موقع پر اقبال کی نظم "اسیری" ایسی

خوش الحانی سے پڑھی گئی کہ سماں بندھ گیا۔ ہر مصرعہ جب پڑھا جاتا تو طالبعلم لَے میں لَے ملاتے جس سے سارے مجمع پر کیفیت طاری ہوگئی، یہ نظم اقبال نے اُس وقت کہی تھی جب پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے پانچ سال چھندواڑہ میں نظر بند رکھا تھا۔ نظم کے اشعار یہ ہیں:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ از خر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے — مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت فطرت نہیں کرتی مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
"تشہ پرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

مجھے اور میرے چھوٹے بھائی محمود میاں کو ڈاکٹر اقبال سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، چنانچہ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں ہم دونوں نے پہلے کشمیر جانے اور واپسی پر لاہور ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔ نذیر نیازی کے توسط سے سرینگر میں ہاؤس بوٹ میں رہنے کا انتظام ہوگیا۔ سرینگر میں نذیر نیازی کے بھائی جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا ہمیں منشی سراج الدین سے ملانے لے گئے، جو بسلسلۂ ملازمت عرصے سے سرینگر میں مقیم تھے، یہ بڑے دلچسپ شخص تھے، اقبال کے پرستاروں میں تھے۔ بڑے خلیق، ملنسار، بامروّت اور بافیض۔ ہم دونوں سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ہم سرینگر میں ایک ماہ ٹھہرے۔ اچھابل، ویری ناگ، گل مرگ اور سون مرگ کی بھی سیر کی۔ گئے تھے راولپنڈی کے راستے، واپسی جموں کی طرف سے ہوئی۔ ویری ناگ میں حفیظ جالندھری سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں وہاں اپنا کلام بھی سنایا تھا، بعد میں جب کبھی وہ حیدرآباد آتے تو ملاقات رہتی تھی۔

لاہور میں ہم دونوں اسٹیشن کے قریب ایک معمولی، ہوٹل میں ٹھہرے تھے، شام کے وقت ڈاکٹر اقبال سے ملنے گئے، ان کے یہاں لوگوں کا مجمع تھا۔ ہم نے جب ان سے کہا کہ خاص طور سے ان سے ملنے لاہور آئے ہیں تو بہت متاثر ہوئے، اوروں کو چھوڑ کر ہم دونوں سے جامعہ سے متعلق گفتگو کرتے رہے، مولانا محمد علی کا بار بار ذکر کرتے تھے، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا محمد علی کی خواہش تھی کہ وہ جامعہ کی پرنسپلی قبول کریں، لیکن وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے معذور رہے[۵۶] میری

ڈاکٹر اقبال سے یہ پہلی ملاقات تھی ۷ھ

(اس کے بعد میں) مئی ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹریٹ کے لیے فرانس چلا گیا اور پیرس یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا..... فرانس میں میرا قیام ساڑھے تین سال سے کچھ زائد رہا، دسمبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی..... میں فرانس سے جنوری ۱۹۳۰ء کے آخری ہفتے میں ہندوستان واپس آیا اور مارچ کے شروع میں حیدرآباد چلا گیا..... اکتوبر ۱۹۳۰ء میں جب ابن حسن مرحوم دو سال کی تعلیمی رخصت پر انگلستان گئے تو میرا ان کے قائم مقام کی حیثیت سے تقرر ہوا، (جوش ملیح آبادی ان دنوں وہیں تھے) وہ ناظر ادبی کی خدمت پر مامور تھے، ان کا کام یہ تھا کہ ترجموں پر ادبی لحاظ سے ایک نظر ڈال لیں، جو ترجمے وہ دیکھ چکے تھے اُن میں سے بعض میرے پاس فنی نظر ثانی کے لیے آئے، میں نے دیکھا کہ جوش صاحب نے ان پر بڑی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی، مجھے ان ترجموں کے ادبی استقام پر بھی رائے دینی پڑی۔ بعض ترجموں میں چالیس پچاس صفحوں پر کہیں دو ایک جگہ جوش صاحب پنسل سے نشان لگا دیتے اور کبھی اپنی رائے بھی لکھ دیتے تھے، جہاں کہیں انہوں نے اپنی رائے لکھی تھی مجھے اس سے اتفاق تھا، لیکن انہوں نے اپنا فرض جس محنت سے ادا کرنا چاہیئے تھا نہیں ادا کیا، یہ شکایت میرے علاوہ اور دوسرے پروفیسروں کو بھی تھی۔ ویسے میں جوش صاحب کو اعلیٰ پائے کا شاعر سمجھتا تھا لیکن مجھے ان سے اقبال کی شاعری کے متعلق اختلاف تھا اور یہ اختلاف ہمیشہ قائم رہا، وہ اقبال کو بڑا شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے اور میں اسے اپنے دور کا اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کو غالباً یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ اقبال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں، یہ حق تو ان کا ہے، میں اسے ان کی سادہ لوحی پر محمول کرتا ہوں۔ دیرپا اور سچی عظمت نہ کسی کے پروپیگنڈے سے مانی جاتی ہے اور نہ دبائی جاتی ہے۔ اگر کسی میں جوہر قابل ہے تو وہ خود چمک اٹھتا ہے، جوش صاحب کے ہاں لفظوں کا خزانہ بہت وسیع ہے اور وہ ان کے استعمال پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ لفظوں کی بہتات اور معانی کی کمی کے باعث ان کے کلام میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ اخلاص لفظوں کی غیر ضروری بہتات اور ان کی گھن گرج کا متحمل نہیں ہو سکتا ۹ھ

..... ۱۹۳۷ء میں جب لاہور میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کا اجلاس ہوا تو میں عثمانیہ یونیورسٹی

کے نمائندے کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا، اس موقعہ پر مجھے ڈاکٹر اقبال کے پاس دو مرتبہ حاضری کا موقعہ ملا اور ان سے تفصیلی گفتگو بھی رہی، اب مجھ میں اتنی پختگی آگئی تھی کہ میں ان سے استفادہ کرسکوں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی طرف سے بے حد متفکر تھے اور کہتے تھے کہ جب تک ان کی علیحدہ مملکت نہ ہوگی ان کا دین و تمدن خطرے میں رہے گا۔ اس بات کو بھی انہوں نے بار بار دہرایا کہ مسلمان اپنی تقدیر کی تشکیل خود ہی کرسکتے ہیں، اگر دوسرے کریں گے تو انہیں دوسروں کا رنگ اختیار کرنا پڑے گا، ان ملاقاتوں سے مجھے اقبال سے جو عقیدت تھی اس میں اور اضافہ ہوگیا۔[10]

[جوش ملیح آبادی کے بارے میں اپنا تاثر پہلے ہی بیان کرچکا ہوں، ان کی اقبال دشمنی قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری رہی] قیامِ پاکستان کے بعد ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے وہ لکھنؤ آئے، میں ان دنوں لکھنؤ میں تھا۔ [اس مشاعرے میں] انہوں نے چند نظمیں سنائیں جو انہوں نے پاکستان میں لکھی تھیں، اور جن کے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے نئے وطن میں خوش نہیں ہیں۔ صدیق حسن خان نے بھی غزل پڑھی۔ ایک شعر میں انسان دوستی کے جذبات کا اظہار تھا، سب نے خوب تعریف کی، جوش نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "بھئی اللہ والے ہو کر بھی انسانوں سے اتنی ہمدردی رکھتے ہو"! اس پر میں نے کہا کہ "اللہ والے ہی کو انسان سے سچی محبت ہوتی ہے"۔ اس محفل کے خاتمے پر جوش میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کی "روحِ اقبال" کے پورے حاشیے کو اپنی تنقید سے سیاہ کردیا ہے، جب کبھی آپ کراچی آئیں گے تو آپ کو دکھاؤں گا، آپ لوگ اقبال کو کیوں اتنا بڑھاتے ہیں"؟

میں نے سوچا کہ اس وقت جوش سے بحث کا موقع نہیں ہے، میں نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ جب کراچی آؤں گا تو آپ کی تنقید سے استفادہ کروں گا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صدیق حسن خان ادھر بڑھ کر آگئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ جوش نے خود ہی ساری بات دہرا دی، اس پر صدیق حسن خان نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور جوش کو مخاطب کرکے کہنے لگے "آپ تو ہمیشہ سے اقبال کے مخالف رہے ہیں"۔[11] ..... بایں ہمہ اُردو والوں نے جوش صاحب کی قدردانی ان کی زندگی میں جتنی کی ہے اتنی سوائے اقبال کے اور کسی کی نہیں ہوئی، وہ یقیناً اسی کے مستحق ہیں اور انہیں اس پر قانع رہنا چاہیے۔

[آخر میں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اقبال کی شخصیت سے کیا تاثر لیا۔ اقبال کی شاعرانہ شخصیت کا اہم جزو اُن کا شعری انہماک تھا اور یہ اُس وقت بھی جاری رہتا جب کہ بظاہر وہ دوسروں سے باتیں کرتے تھے] جب وہ دوسروں سے باتیں کرتے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی اندرونی ہمکلامی جاری ہے، اس پر خارجی حالات کا کوئی خاص اثر نہیں، ان کی اندرونی اور بیرونی دونوں گفتگوئیں بیک وقت جاری رہتی تھیں، اس سے ان کی انتہائی محویت کا پتہ چلتا تھا[۱۲]

حواشی

[۱] یہ کتاب مجھے مجتبیٰ رشید اختر (حضرو) کی عنائتوں کے طفیل دستیاب ہوئی۔

[۲،۳] یادوں کی دنیا ص ۸۸،۱۹۳

[۴] جامعہ ملیہ کی چانسلرشپ قبول نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ علامہ تعلیمی میدان میں انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کے خلاف تھے، گاندھی نے حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور علی برادران کی ایماء پر ۲۹ مئی ۱۹۲۰ء کو علامہ کو خط لکھا تھا جس کے جواب میں علامہ نے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ [مزید ملاحظہ کیجئے اقبال اور گاندھی کا خط مشمولہ "جامعہ" اقبال نمبر مضمون عبداللطیف اعظمی]

[۵] یادوں کی دنیا ص ۱۸۴

[۶] مشمولہ کلیات اقبال ص ۲۵۳ بعنوان "اسیری" کلیات میں تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے ع ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر

[۷] یادوں کی دنیا ص ۱۹۴

[۸] پیدائش ۱۸۹۴ء وفات ۱۹۸۲ء

[۹ تا ۱۲] یادوں کی دنیا ص ۲۱۳، ۱۹۵، ۴۶۹، ۴۱۸ [بالترتیب]

یادِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

جلیل قدوائی

یہ نہیں کہ حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے ساتھ میرے اس قسم کے روابط تھے جنہیں "تعلقات" کا نام دیا جا سکتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ موصوف سے بالکل ہی غیر متعارف یا بے تعلق تھا۔ ہاں شاید اس نسبت کو کسی خاص عنوان کے تحت نہیں لایا جا سکتا، یوں بھی جب خود "اقبالؒ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے" تو میں کس شمار و قطار میں ہوں۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کو پہلے پہل میں نے سکول کی طالبعلمی کے زمانہ میں اپنے محترم بزرگ عمومی خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم وکیل و اسپیشل مجسٹریٹ اناؤ کے کتب خانہ میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" کی پرانی جلدوں میں تلاش کیا - اس وقت میرا ادبی ذوق و شعور نکھر چلا تھا۔ مگر اب یاد آتا ہے کہ علامہ کے کلام سے اس احساس کے بغیر کہ نظم کو شاعر سے بھی کوئی تعلق ہوتا ہے اس سے بھی بہت پہلے کم سنی ہی میں متعارف ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ میرے ایک دوسرے بزرگ اور مندرجۂ بالا خان بہادر صاحب کے برادر خورد جناب قاضی حمید احمد قدوائی مرحوم سب رجسٹرار نے جن کا سینہ تمام عمر درد اسلامی سے خاص طور پر معمور رہا، اقبالؒ کا قومی ترانہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہم بچوں کو ایک خاص انداز پر زبانی یاد کرایا تھا جسے وہ ہمارے گھر آنے والے خصوصی

لہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تسخر نہیں واللہ نہیں ہے۔ (مصنف مضمون ہٰذا)

مہمانوں کو بڑے اہتمام سے سنوایا کرتے تھے۔

پھر میں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کے مشہور نصاب "کلک اُردو" میں علّامہ کی "پرندے کی فریاد" سے

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

پڑھی جس میں اس نظم کے موجودہ متن کے مقابلے میں کہیں زیادہ شعر تھے، شاید اسی کتاب میں یا کہیں اور نظم "نیا شوالہ" سے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تُو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

نظر سے گذری اور پھر "ترانۂ ہندی" سے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بھی پڑھا۔

غرضیکہ اسی طرح چھوٹی چھوٹی کتابیں اور نظمیں بھی پڑھیں جو بے حد پسند آئیں۔ بڑھتی ہوئی عمر، اردگرد کے حالات اور زندگی کے سربند ماحول کو سمجھنے کی نئی نئی ترنگ، شعر و شاعری کے نشہ کی ابتداء ان کے کلام سے دلچسپی ایسی بڑھی کہ وہ میرے خوابوں کی دُنیا بننے لگا۔ ان منازل سے گذرنے کے بعد کہیں یہ ہوا کہ "مخزن" میں ان کا کلام نظر سے گذرا۔

یہ ابتدائی تجربات اور تاثرات لے کر ۱۹۲۲ء میں علیگڑھ پہنچا، اور اگرچہ ان کی بہت سی پسندیدہ نظمیں پہلے ہی زبانی یاد ہو چکی تھیں، مگر ۱۹۲۴ء میں "بانگِ درا" کے اشاعت پذیر ہونے تک مختلف رسائل مثلاً زمانہ، الناظر، صوفی، مخزن (جس کے اُس زمانہ میں دل شاہجہانپوری ایڈیٹر تھے) ہزار داستان وغیرہ نیز اپنے ہم مذاق دوستوں خواجہ منظور حسین و صاحبزادہ عبدالجلیل خاں کی ذاتی بیاضوں سے بڑے شوق سے تلاش کر کر کے اُن کی زیادہ سے زیادہ نظمیں اپنی بیاضوں میں نقل کرتا رہا۔[۲]

---

[۲] ان بیاضوں سے پاکستان آکر میں نے ایک مفید کام لیا، بہت سی نظموں کے میرے نقل کردہ اور مروّجہ متنوں میں اختلاف تھا۔
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۱۹۲۵ء میں علامہ سے بالواسطہ مخاطبت کا موقع مہیا ہوگیا۔ اس سال علیگڑھ یونیورسٹی کی شاندار اور تاریخی جوبلی منعقد ہوئی تھی۔ یہیں یونیورسٹی کے طلبا کے رسالہ "علی گڑھ میگزین" کا نائب مدیر تھا، اس موقع پر رسالہ کے خاص نمبر کے لیے علامہ کے کلام اور تصویر کی ضرورت تھی جس کے لیے میں انہیں رسمی مراسلہ بھیج چکا تھا۔ علی گڑھ کی روایات کے نامور علم بردار اور اردو کے مشہور صاحبِ طرز ادیب سید سجاد حیدر یلدرم ان دنوں یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، میرے حال پر اُن کی خصوصی عنایات تھیں۔ یلدرم اور علامہ کے درمیان بے تکلف دوستی تھی جس پر وہ برملا فخر کیا کرتے تھے۔ میری عرض پر موصوف نے علامہ کو ایک تعارفی اور سفارشی خط لکھا اور بھیجنے سے پہلے مجھے پڑھ کر سنایا، یہ خط انگریزی میں تھا اور "مائی ڈیئر سر محمد"[۳] کے الفاظ سے شروع کیا گیا تھا، یہ القاب جس وقار اور افتخار کے ساتھ ایک مخصوص لہجے میں سجاد صاحب نے پڑھ کر سنایا تھا اس کا لطف آج تک دل سے محو نہیں ہوا۔[۴]

علامہ اقبال نے فوراً جواب لکھا اردو میں مگر "مائی ڈیر سجاد" کے القاب[۵] سے، جس میں موصوف کلام اور تصویر طلب کرنے پر میرا نام لے کر شکریہ ادا کیا گیا تھا، اپنی ایک چھوٹی سی تصویر بھی عطا کی تھی، وہی جس میں کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے اور سوٹ پہنے، بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ عینک لگائے مصروفِ مطالعہ ہیں، فارسی کی مشہور غزل بھی جس کا مطلع ہے ؎

بقیہ حاشیہ صابقہ صفحہ: اسی میں نے مضمون کی بنیاد بنایا اور انجمن کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں شائع کرایا۔ (مصنف مضمون ہٰذا)

[۳] بر سبیل تذکرہ اسی وقت سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہوا کہ انگریزی میں "سر" کے لفظ کے ساتھ ہمیشہ مخاطب کا پہلا نام (جو عیسائیوں میں اصلی نام ہوتا ہے) لیتے ہیں، چنانچہ سر محمد کے بجائے سر اقبال کہا جائے تو غلط ہوگا۔ ہاں ہمارے ہاں اصلی نام کی رعایت سے سر محمد اقبال پورا لکھا جائے تو صحیح ہوگا۔ (مصنف مضمون ہٰذا)

[۴] یوں بھی سجاد حیدر مرحوم کے بات کرنے کا انداز بے حد البیلا، عام لوگوں کی طرز سے بالکل جدا تیکھا اور منفرد تھا جس کا مزہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جسے ان سے شرفِ ہمکلامی حاصل ہوا ہو، ان کا لہجہ اور ان کی چال، ان دو خصوصیات میں مجھے آج تک کوئی ان کا معمولی سا ہمسر بھی نہیں ملا، چال کے بارے میں تو غالب کا مصرع ؎ چال جیسے کڑی کمان کا تیر! کچھ مفہوم ادا کر سکتا ہے، لیکن گفتگو کے انداز کو بیان کرنے کے لیے مجھے نہ اپنے نہ کسی اور کے الفاظ میسر آتے ہیں۔ مگر غیر سجاد پر علیحدہ مضمون درکار ہے۔ (مصنف مضمون ہٰذا)

نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را
بخود گم شو، نگہدار آبروئے عشق بازی را

خط کے ہمراہ اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر روانہ فرمائی، یہ پوری غزل بھی سجاد مرحوم نے مجھے عنایت کرنے سے پہلے بلند آواز میں اور اپنے منفرد تیوروں کے ساتھ پڑھ کر سنائی تھی اور ان اشعار پر تو جھوم جھوم گئے تھے ؎

من ایں علم و فراست با پرکاہے نمی گرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہ ہر زخمے کہ ایں کالا بگیری سود مند اُفتد
بہ زور بازوئے حیدر بہ وہ ادراکِ رازی را

اس خط اور اس تصویر نیز اس غزل کا عکس پورے صفحہ پر نہایت آب و تاب کے ساتھ ہم نے "میگزین" کے جوبلی نمبر میں شائع کیا تھا، افسوس کہ اس رسالہ کی کوئی نقل اب میرے پاس موجود نہیں، مگر اس زمانے کے علیگڑھ کے بہتیرے پڑھے لکھے آج پاکستان میں موجود ہیں، کسی نہ کسی کے پاس ضرور ہو گی۔ اقبال اکادمی کو تلاش کر کے اُسے محفوظ کر لینا چاہیئے۔ تصویر مجھ سے بعد میں حکیم یوسف حسن مُدیر "نیرنگ خیال" لاہور نے منگا کر اپنے رسالے میں بھی شائع کی تھی اور اب بڑے سائز پر عام دستیاب ہے اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطلعے والی تصویر کہلاتی ہے، شاید "میگزین" کے پورے ہی صفحہ کا بلاک چھاپا تھا۔

کئی برس گذر گئے، اب میں گریجویٹ ہو کر یونیورسٹی کے دفتر رجسٹرار میں ملازم ہو چکا تھا کہ علامہؒ علیگڑھ تشریف لائے اور اپنے مشہور خطبات ارشاد فرمائے[۵۶] ایک بار مجھے بھی حاضری نصیب ہوئی، تقریر اعلیٰ درجے کی انگریزی میں تھی۔ یونین کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں رات کے وقت بجلی کی روشنی میں ایک ہمہ گیر سناٹا چھایا ہوا تھا جس میں انگریزی لباس میں مزین ڈائس پر کھڑے ہوئے ایک بلند و بالا انسان کی نقرئی کہوں یا طلائی تنہا آواز ایک کھنکھناہٹ کے طور پر فضا میں گونج رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر، رُک رُک کر رس گھول رہی تھی۔ یہ شاعری یا مبالغہ نہیں ہے، آپ یقین مانیں جو سمجھ سکتے تھے سمجھ کر اور جو نہیں سمجھ سکتے تھے احتراماً صرف آواز سے، اُس کے پاٹ سے، اُس کے

زیر و بم سے، اُس کے لہجہ سے، اُس کی گونج سے مست ہو رہے تھے، اگرچہ علامہ موصوف عالمِ جذب و مستی میں علم و عرفان کے دریا بہا رہے تھے مگر مجھے اعتراف ہے کہ میرے ساتھ زیادہ تر مؤخر الذکر صورت ہی پیش آئی تھی۔ ناگہاں ایک طرف سے کسی نے خارج از آہنگ نعرہ بلند کیا یعنی اسلامی ادب و ثقافت کے تذکرہ پر علامہ سے اپنا کلام سُنانے کی فرمائش کر دی۔

اتنا سُننا تھا کہ علامہ نے تقریر بند کر دی، چہرہ کا رنگ سُرخ ہو گیا اور چند لمحہ سکوت کے بعد نہایت تند و تلخ لہجے میں نہ صرف اس فرمائش پر سرزنش کی بلکہ بتایا کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں نیز معاصر شعر و ادب سے اپنی مایوسی اور بیزاری کا اظہار بھی فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ اُن کی اس ادا میں بھی ان کے مشتاقوں کے لیے دلنوازی کا پہلو تھا۔ موصوف نے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ہماری شاعری کوئی امید افزا پہلو نہیں رکھتی اور ہمارے لیے اس سے بالکل کنارہ کش ہو جانا ہی بہتر ہے! ظاہر ہے کہ علامہ اپنی شاعری کی طرف اشارہ نہیں کر رہے تھے۔

علی گڑھ کے اس دورانِ قیام میں ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم پروفیسر فلسفہ کے ذریعہ جن کے ہاں موصوف اقامت پذیر تھے اور پھر کچھ دن بعد علامہ کی علیگڑھ میں دوبارہ تشریف آوری کے موقع پر میرے محبوب اور عزیز دوست خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے دولت کدہ پر مجھے موصوف کے ساتھ ملاقاتوں اور ہم نشینی کا شرف حاصل ہوا۔ کم سخنی اور متفکرانہ انداز طبیعت کے ساتھ ساتھ زندہ دلی اور شگفتہ طبعی بھی ان کے مزاج کی خصوصیت معلوم ہوئیں۔ علماء و مفکرین کے ان مجمعوں میں میری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی سی تھی، چنانچہ نیاز مندانہ بیٹھا رہا۔ مؤخر الذکر ملاقات موسم سرما میں سیدین صاحب کی ذاتی کوٹھی کے باہری چھوٹے چبوترہ پر ہوئی تھی جہاں ہم لوگ دھوپ کھانے بیٹھے تھے، ان دنوں موصوف کا گلا بیٹھا ہوا تھا اور زیادہ تر گفتگو موسم اور بیماری کے بارے میں رہی۔ موصوف کی طبعی کم سخنی نے اس علالت کے سبب کم و بیش بعیری خاموشی کی صورت اختیار کر لی تھی اس لیے بڑی مشکل سے بولتے تھے یا اشاروں سے کام لیتے تھے۔[۵]

ان سرسری ملاقاتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک بار میں نے علامہ کو لاہور خط لکھا جس کے ساتھ اپنی تعلیم، تصانیف، نثر و نظم نیز ادبی و تنقیدی کاموں کی تفصیل انگریزی میں ٹائپ کرا کے خدمت میں روانہ کیں، میں ان دنوں دفتر کی ملازمت ترک کر کے تدریسی کام سنبھالنا چاہتا تھا، اردو اور فارسی میں

پی ایچ ڈی (P·H·D) بلکہ کہیں کہیں ایم اے کی ڈگریاں بھی اُس وقت تک ہندوستانی یونیورسٹیوں نے عام نہیں کی تھیں، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں میں بھی فارسی تعلیمیافتہ اصحاب لیکچرار مقرر ہو جاتے تھے۔ میں صرف بی اے (B·A) تھا اور اپنی سادگی سے سمجھتا تھا کہ اس چھوٹی ڈگری کے ساتھ میرا علمی و ادبی کام شامل ہو کر اُردو میں ایم اے (M·A) کی ڈگری کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ سجاد حیدر مرحوم نے اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا اور میرٹھ اور بریلی کے کالجوں میں اسی بنیاد پر میرے تقرر کی سفارشیں بھی کی تھیں مگر ان کوششوں میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اب میں علامہ اقبالؒ سے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہتا تھا جس میں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہو۔ موصوف نے ازراہِ نوازشِ خاص انگریزی زبان میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ افسوس کہ میری نالائقی اور زندگی میں انتشار کے سبب وہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت علامہؒ نے میری تحسین میں روایتی انداز میں قلم توڑ دیا تھا، ہرگز نہیں! چونکہ متقن تھے، مبصر تھے، لکھنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی تھی، چنانچہ سرٹیفکیٹ کا مضمون کچھ یوں تھا کہ "آپ نے اپنے ادبی اور علمی کاموں کی جو تفصیلات مجھے بھیجی ہیں، انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں اور اگر آپ نے اپنا یہ مشغلہ جاری رکھا جس کا میں آپ کو مشورہ دوں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایسے نہ ہو جائیں اور ویسے نہ ہو جائیں"۔ وغیرہ!

ایسا کچھ ہُوا کہ کچھ دن بعد سجاد حیدر اور راس مسعود مرحومین کی امداد اور توجہات خاص سے مجھے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (M·A) (درجۂ اوّل) کرنے کا موقع نصیب ہو گیا۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے، علیگڑھ میں سرراس نے اُردو نصاب کی تنظیمِ نو کر کے آنرز اور ایم۔اے کی جماعتیں کھولیں اور ۱۹۳۴ء میں وہاں بحیثیت لیکچرار میرا تقرر ہو گیا۔ اس کا افسوس رہا کہ اس وقت تک سرراس علیگڑھ چھوڑ چکے تھے۔ میرے اس تقرر میں علامہ کا بھی ہاتھ تھا اور میں اس افتخار اعزاز نیز موصوف کے احسان اور قدر افزائی کو تا زیست فراموش نہیں کر سکتا۔ واضح ہو کہ اسامی کا اشتہار دیا گیا تھا، اور انتخاب کے لیے باقاعدہ انٹرویو ہُوا تھا، کمیٹی نے سارا معاملہ دو باہری ارکان مولانا سید سلیمان ندویؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ پر چھوڑ دیا تھا، سید صاحبؒ نے اپنی رائے میرے حق میں دی تھی، اور چونکہ بسبب علالت علامہ علیگڑھ تشریف نہیں لا سکے تھے

اس لیے سارے متعلقہ کاغذات بذریعۂ ڈاک موصوف کو لاہور بھیج دیئے گئے تھے۔ حضرت علامہؒ کی رائے بھی میرے تقرر کے حق میں آئی۔[۵]

علامہ اقبالؒ سے میری آخری ملاقات غالباً ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ میں علیگڑھ کی ملازمت ترک کر کے حکومتِ ہند کے شعبۂ اطلاعات میں شامل ہو چکا تھا، اور شملہ سے اپنے ایک عزیز کی بیماری کے سلسلے میں لاہور گیا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، شام کا وقت، اپنی میورو ڈ (موجودہ علامہ اقبال روڈ) والی کوٹھی کے صحن میں داہنے ہاتھ کے برآمدہ کے نیچے صحن میں بغیر بستر کی ایک چارپائی بلکہ ایک چھوٹے کھٹولے پر تہبند اور بنیان میں نیم دراز تھے، اس طرح کہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر اُن پر اپنا سر اٹھا رکھا تھا۔ چارپائی کے ایک طرف اُن کا پرانا حقہ رکھا تھا جس کے کبھی کبھی کش لگا لیتے تھے، بات کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہنی اعتبار سے کہیں اور ہیں یا کسی خیال میں مستغرق ہیں، نظریں نہیں ملاتے تھے اور جیسے فکر میں ڈوبے ہوئے کسی ایک ہی جگہ دیکھے جا رہے ہوں۔ مگر باتیں پوری حاضر دماغی اور اعتماد کے ساتھ کر رہے تھے، سوال کا جواب پہلے دو ٹوک "ہاں" یا "نہیں" سے دیتے تھے پھر دلائل کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ کسی اور موقع پر لکھ چکا ہوں کہ اس ملاقات میں میں نے اُردو کی ترقی کے لیے رسم الخط کی تبدیلی اور فلسطین کے مسئلے پر سوالات

۵؎ اس سلسلے میں "نقوش" (شخصیات نمبر) میں وقار عظیم کے مضمون "سرور صاحب" کا حسب ذیل اقتباس غور طلب ہے :—

"یونیورسٹی کے معاملے میں بڑی سادگی اور صفائی سے گفتگو ہوئی، مصلحت اور سیاست کے تقاضوں کا ذکر آیا اور جس خاص معاملے کے سلسلے میں علیگڑھ گیا تھا اُس کے ہر پہلو پر باتیں ہوئیں تو مجھے اندازہ اور یقین ہو گیا کہ اس اسامی پر کون لیا جائے گا!" گویا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا! واضح ہو کہ آل احمد سرور جن سے وقار صاحب نے اپنے تقرر کے امکانات کے بارے میں رائے حاصل کی، اُس وقت ایک طالبعلم تھے اور یونیورسٹی کے انتظامی امور اور تقرراتی پالیسی سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہ تھا، خورشید صاحب چونکہ ریڈری کے امیدوار تھے کمیٹی پر نہ تھے۔ سرور صاحب تو اُردو کے شعبہ میں اُس اسامی پر لیے گئے جو وسط ۱۹۳۷ء میں میرے حکومتِ ہند میں چلے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ وقار صاحب کو یہ الفاظ لکھتے وقت کم از کم یہ احساس تو ہونا چاہیئے تھا کہ وہ مسلمانوں کی اس عظیم درسگاہ میں (جو اُن کی مادرِ علمی بھی ہوئی) میں طریقِ تقررات کو مشکوک بنا کر اسکی خدمت کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں میرے بیان کی تائید کرنے والوں میں پاکستان میں پروفیسر حلیم موجود ہیں جو اُس وقت علیگڑھ میں پرووائس چانسلر اور انتخابی کمیٹی کے رکن تھے، اور نواب محمد اسمٰعیل خاں تھے جو یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر تھے۔

(مصنف مضمون ہٰذا)

کیے تھے، چنانچہ مندرجہ بالا انداز سے جواب دے کر علامہؒ نے بہ دلائل ثابت کیا تھا کہ دونوں مسئلوں کو اٹھانا محض بیکار تھا۔ میری بیماری پر اظہارِ تاسف بھی کیا تھا اور دریافت فرمایا تھا کہ ان کے شہر میں مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

میں نے شملہ میں کچھ دنوں تک غالباً ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک دوست ضیاء الدین مرحوم کے ساتھ "بالِ جبریل" کی چند منتخب غزلیات کے انگریزی ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر کام مشکل نظر آیا لہٰذا ترک کر دیا گیا۔ نمونہ کے طور پر علامہ کی خدمت میں چند ترجمے بھی روانہ کیے تھے مگر ادھر سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اُس زمانے میں ہم دونوں علامہؒ کے اس مجموعۂ کلام کو سرہانے رکھ کر سوتے تھے اور علی الصبح دفتر جانے سے پہلے بعض غزلیں پاگلوں کی طرح زور دار آواز کے ساتھ کورس میں گاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصے بعد علامہ کا وصال ہو گیا، یہ خبر وحشت اثر دل نے کیونکر سُنی، خدا ہی جانتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے والدۂ مرحومہ کو اُن دنوں کچھ اس قسم کے خطوط لکھے تھے کہ انہوں نے خاص طور پر صبرِ تلقین کی تھی اور لکھا تھا کہ اس عمر میں کسی کی موت سے مجھے اتنا گہرا اثر نہیں لینا چاہیئے، مگر وہ موت العالم کے غم سے ناواقف تھیں۔ علامہؒ کے انتقال پر نہ جانے کتنی نظمیں لکھی گئیں۔ شاید شدتِ غم میں شاعر کی زبان گنگ اور قلم کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ تمام مطبوعہ نظموں میں جن اشعار نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا ظفر علی خاں کے تھے جن سے بڑھ کر شاید سانحے پر اور اشعار لکھے بھی نہیں گئے۔ چند تھے مگر "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کی سچی مثال تھے، وہ اشعار یہ ہیں ؎

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا — اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گذرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم — اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا — سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کا اُبھرنا

ہر روز یہی اُس نے مسلمانوں کو دیا درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا

حواشی

۱ہ، ۲ہ، ۳ہ، ۴ہ اور ۸ہ کے حواشی مصنف مضمون ہٰذا کے ہیں جبکہ ۵ہ، ۶ہ، ۷ہ اور ۹ہ کے حواشی مرتب مجموعہ ہذا نے لکھے ہیں، مصنف کے حواشی مضمون کے پائین دیکھے جا سکتے ہیں۔

۵ہ یہ خط "خطوط اقبال" ص ۱۵۲ پر شائع ہو چکا ہے اگرچہ وہاں القاب "مائی ڈیئر" نہیں صرف "ڈیئر سجاد" درج ہے، خط پر تاریخ درج نہیں لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۹۲۵ء میں تحریر کیا گیا تھا۔

۶ہ علی گڑھ کا یہ سفر ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو شروع ہوا، اس سفر کے دوران علامہ نے وہی خطبات پیش کیے جو اس سے قبل مدراس میں صادر فرما چکے تھے۔ اسی سفر کے دوران آپ کو علیگڑھ کالج کی یونین کی طرف سے "لائف ممبرشپ" کا اعزاز دیا گیا، یہ اعزاز ۲۳ نومبر ۱۹۲۹ء کے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔

۷ہ علامہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں علیگڑھ گئے تھے جہاں علیگڑھ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو "ڈی لٹ" کی اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔

۹ہ شائع شدہ "قومی زبان" اپریل ۱۹۶۶ء

سیارہ ڈائجسٹ "اقبال نمبر" ص ۲۳ میں جلیل قدوائی نے ایک انٹرویو کی شکل میں کم و بیش یہی واقعات بیان کیے ہیں۔ تاہم موجودہ تحریر سے ان کے علامہ سے تعلقات کی بھرپور صورت سامنے آتی ہے۔ "سیارہ ڈائجسٹ" کے حوالے سے مذکورہ انٹرویو "اوراقِ گم گشتہ" مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۸۰ پر شائع ہو چکا ہے۔

اقبال

مشتاق احمد وجدی

علامہ اقبال کی زیارت کا مدت سے شوق تھا جلد ہی حاضرِ خدمت ہوا۔ جس نے ان کی درویش منشی دیکھی ہے کبھی بھول نہیں سکتا۔ چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، سامنے دو تین کرسیاں پڑی تھیں ایک کرسی پہ مجھے بیٹھنے کا حکم ہوا۔ مذہب اور فلسفہ کے ایسے سبق لے کر اٹھا جن کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ حضرتِ اکبر سے رشتے کا حال سُنکر ایسی شفقت برتی جس کا میں مستحق نہ تھا۔ ان کے مداح اور معتقد تھے دیر تک ذکر کرتے رہے .....

علامہ اقبال مسلمانانِ عالم کے اتحاد کے حامی تھے اور مسلمانانِ ہند کو ہمت اور شجاعت کی تلقین کرتے رہے، ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ ان کو خیال آیا کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ باقی ہندوستان کے مسلمانوں سے الگ رہیں۔ ان کی اور سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی بنیاد پڑی جس کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں علامہ اقبال نے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کو ملا کر الگ حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی، ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے انگلستان میں قیامِ پاکستان کا پروپیگنڈا شروع کیا ـــــ دروغ بر گردن راوی ـــــ سُنا ہے کہ یہ سرکارِ برطانیہ کے اشارے پر تھا، یہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کے تحفظ کی ترکیب تھی، لیکن مسلمانانِ ہند اس خوش فہمی میں رہے کہ یہ ان کی نجات کا ذریعہ ہے۔

حواشی

مشتاق احمد وجدی مصنف کتاب "ہنگاموں میں زندگی" صـ ۱۱۴

موسوف ریٹائرڈ کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف پاکستان رہے ہیں، ان کی بیوی اکبر الہ آبادی کی پوتی یعنی عشرت حسین کی لڑکی تھیں، کتاب میں ملاقات کی تاریخ مذکور نہیں لیکن بعض قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی ہوگی۔

علامہ اقبال

مولوی فیروزالدین [1]

جن دنوں میرے بھتیجے منشی دین محمد مرحوم[2] کو مشاعرے کا شوق تھا تو اس میں علامہ اقبال سر عبدالقادر[3] اور لالہ ہرکشن لال[4] بھی تشریف لایا کرتے تھے، انہی دنوں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے دیکھ لیا کہ ایک دن یہ شخص بڑا نام پائے گا اور اعلیٰ مرتبہ پر پہنچے گا، علامہ موصوف کو طالبعلمی کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا ذوق رہا ہے، فارغ التحصیل ہو کر وہ اس کی طرف پوری تندہی سے متوجہ ہوئے، اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں بھی اپنی نظمیں پڑھنے لگے، پنجاب میں نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھنا انہی کی ایجاد ہے، ان نظموں میں چونکہ سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لیے وہ عوام و خواص سب میں قبول ہوئیں اور علامہ اقبال گنج عزلت سے نکل کر دوش شہرت پر سوار ہو گئے۔

پرانے خیال کے شاعروں نے لوگوں کو راضی برضا اور قناعت گزیں ہونے کی تلقین کی ہے لیکن اقبال نے اس کی مخالفت کی اور لوگوں کو سمجھایا کہ اگر تم غفلت اور سستی چھوڑ کر تو سن ہمت پر سوار ہو جاؤ تو دنیا تمہارے زیر نگیں ہو سکتی ہے۔ حافظ شیراز ان قنوطی شعراء میں سے تھے جو صبر و قناعت کی تلقین اور شراب ناب کی تحسین کرتے رہے ہیں، عام لوگوں کو ان کی شیرینی کلام کے باعث ان کے متعلق بزرگانہ حسن ظن پیدا ہو چکا ہے، اسلئے موجودہ زمانے کے بعض شعراء اور علماء نے اقبال کے نظریے کی تحقیر کی، مگر یہ دھن کا پکا اپنے کام میں برابر لگا رہا۔ ان کی کتاب "اسرار خودی"[5] کا ترجمہ یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے بلکہ جرمنی کے نصاب تعلیم میں بھی شامل ہے، کیونکہ مشہور فلسفی گوئٹے کا نظریہ ان سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، یہ اسی شہرت اور مقبولیت کا اثر تھا کہ انگلستان کے ارباب حل و عقد نے گورنمنٹ ہند کو انہیں سر کا خطاب دینے کی تحریک کی، اس

زمانے میں سر ایڈورڈ میکلگن[۵۶] گورنر پنجاب تھے، انہوں نے ان کو بلایا اور ان کی تحریر و تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو "سر" کا خطاب دینے کے ساتھ یہ بھی پوچھا کہ اور بھی ایسا کوئی قابل آدمی آپ کی نگاہ میں ہو تو بتائیے، انہوں نے مولوی سید میر حسن صاحب کا نام لیا، جو ان کے سیالکوٹ میں فارسی کے استاد تھے، چنانچہ اسی سال یا اس کے دوسرے برس ہی انہیں "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا، اس کے علاوہ آپ نے اور بھی بہت سی کتابیں "رموزِ بے خودی"، "بالِ جبریل"، "بانگِ درا"، اور "پیامِ مشرق" وغیرہ لکھیں، جن کے ذریعہ قوم کو زندگی کا پیام دیا، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے کلام نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔

علامہ موصوف ۱۸۷۶ء[۵۷] میں سیالکوٹ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خداداد ذہانت پائی تھی، ہر جماعت میں ہمیشہ اوّل رہے، انٹرنس پاس کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج سے ایم، اے کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد کچھ عرصہ تک اورنٹیل کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر رہے اور پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۰۵ء میں انگلستان تشریف لے گئے اور وہاں قانون اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، انگلستان سے آپ جرمنی گئے جہاں "فلسفۂ ایران" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کتاب کی خوبیاں دیکھ کر میونخ یونیورسٹی نے آپ کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دی۔

انگلستان سے واپسی پر آپ نے بیرسٹری شروع کی، اس زمانے میں بھی میری ان سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں، ان دنوں آپ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر تھے، چنانچہ بغیر میرے کچھ کہے سنے آپ میری کتابوں کی منظوری میں امداد دیتے رہے، ایک دفعہ "تاریخِ پنجاب" پیش تھی، جس دن کمیٹی کا جلسہ تھا اُسی دن ایک میونسپل انجنیئر کے ریٹائر ہونے پر دعوتِ چائے بھی تھی، لہٰذا علامہ اقبال، سر فضل حسین اور اکثر دوسرے مسلمان ممبران ایجنڈے کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے اور مخالفوں نے اس کتاب کے متعلق غلط ریمارکس پاس کرا دیئے، میں نے ان سے ذکر کیا تو بہت خوب ہوئے اور پھر آئندہ اجلاسوں میں جب

بھی اس کتاب کا معاملہ پیش ہوا تو اپنی اس بے پروائی کی کافی تلافی فرماتے رہے، یہ تو میں جانتا نہیں کہ آپ نماز روزے کے کس قدر پابند تھے مگر عاشقِ رسولؐ ضرور تھے۔ سُنا ہے کہ جب آپ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے لندن گئے اور راہ میں وہ مقام آیا جہاں سے حجاز کو راستہ جاتا ہے تو بے اختیار رو دیئے۔ اقبال کے مزاج میں نمود و نمائش بالکل نہ تھی، سادہ کپڑے پہنتے اور سادہ خوراک کھاتے، کھچڑی ان کی مرغوب غذا تھی جس میں گھی وافر پڑا ہوتا تھا۔ میرے یہاں بھی کئی دفعہ تشریف لائے۔ جب افغانستان پر نادر خاں کا قبضہ ہوا تو علامہ صاحب نے افغانستان کی امداد کے لیے چندے کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں میرے ہاں بھی تشریف لائے، میں نے سو روپیہ پیش کیا، تو کہا اس پر کچھ اور بڑھایئے، میں نے پچاس روپے اضافہ کر دیئے جنہیں لے کر کہا "یہ بہت مناسب ہے"۔

میں نے گلستان کا نثر کا نثر میں اور نظم کا نظم میں اُردو ترجمہ کیا تو اس کے کچھ مسوّدات ان کو بھی سُنائے، انہوں نے "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کہہ کے کئی جگہ اصلاح کا مشورہ دیا۔

پنجاب کونسل کا ممبر ہو جانا ان کی ہر دلعزیزی کو دیکھتے ہوئے ایک بالکل معمولی بات تھی، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں وہ کونسل کے ممبر ہو گئے لیکن کونسل میں اپنے حسبِ منشا قوانین و ضوابط پیش نہ کر سکے، اگر آپ چاہتے تو وزارت میں بھی لے لئے جاتے مگر اس بات کے لیے جس قدر تملّق اور ظاہرداری کی ضرورت تھی وہ آپ کے مزاج میں نہ تھی۔

آپ کو تاریخِ اسلام پر بہت عبور تھا، کسی کے ہاں بہت کم آتے جاتے تھے، لیکن ان کی کوٹھی پر ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے گفتگو فرماتے اور بعض اوقات تو گھنٹوں ایک ہی موضوع پر اظہارِ خیالات فرماتے چلے جاتے۔

۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ کو آپ کا انتقال ہوا، بیمار تو بہت مدت تک رہے اور نواب صاحب بھوپال نے اپنے ہاں بلا کر علاج معالجہ بھی کرایا لیکن آخر مرض جان لے کر

ہی ٹلا، آپ کو شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس دفن کیا گیا۔

مرنے کے بعد اب معلوم ہوا کہ اقبال کیا کام کر گیا، اب ہر سال "اقبال ڈے" منائے جاتے ہیں۔ زندگی میں بھی اقبال کی جو قدر ہوئی وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہوگی مرنے سے ایک سال پہلے تقریباً تمام دُنیا میں یومِ اقبال منایا گیا اور مرحوم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ عوام کو ان سے کس قدر عقیدت ہے ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حواشی

۱ مولوی فیروزالدین — فیروز سنز کے بانی مبانی اور "فیروز اللغات" کے مصنف — ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲ اپریل ۱۹۴۹ کو انتقال فرمایا۔

۲ منشی دین محمد..... "میونسپل گزٹ" کے ایڈیٹر تھے، ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۳ سر عبدالقادر..... ۱۸۷۴ء میں لُدھیانہ میں پیدا ہوئے، انگلستان سے بیرسٹری کی سند حاصل کی، ۱۹۰۱ء میں لاہور سے رسالہ "مخزن" نکالا، جو علامہ کی ملک گیر شہرت کا باعث بنا، ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔

۴ لالہ ہرکشن لال..... مشہور بیرسٹر اور تاجر اور کنہیالال گابا (قبولِ اسلام کے بعد خالد لطیف گابا) کے والد تھے۔

۵ اسرارِ خودی کا ترجمہ پروفیسر آر اے نکلسن نے کیا تھا جو ۱۹۲۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔

۶ "سر" کا خطاب دینے کا واقعہ جس طرح مولوی صاحب بیان کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ علامہ کو یہ خطاب انگلستان کے ایک اخبار نویس کی تحریک کی وجہ سے ملا تھا جو لاہور آیا تھا مزید تفصیل کیلئے دیکھئے "مفکر پاکستان" مرتبہ حنیف شاہد ص ۲۲۴

۷ مولوی صاحب نے سنہ پیدائش غلط لکھا ہے، مزید برآں علامہ کی پیدائش کے وقت ان کے گھرانے کو سرگرمِ خوشحال نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۸ مشمولہ کتاب "جہادِ زندگی" از مولوی فیروزالدین، مطبوعہ ۱۹۴۵ء، صفحات ۳۰۶ تا ۳۱۰

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

میری طالبعلمی کے تاثرات

فضلِ حمید

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں طفولیت کی بے فکریوں اور لاابالی پن سے نکل کر عنفوانِ شباب کے دلچسپ اور اُمنگوں بھرے زمانے میں قدم رکھ رہا تھا، وہ بھی عجیب زمانہ تھا، عالمِ رنگ و بو کی ہر چیز رنگین اور جاذبِ نظر دکھائی دیتی تھی۔ پندار کا شیشہ تو جب بھی خالی تھا اور اب بھی خالی ہے، لیکن کیفِ خودی کے پیمانے آبِ نشاط انگیز سے لبریز نظر آتے تھے اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہمیں زندگی میں کچھ کرنا ہے اور اس لیے سوچنا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں جو "دید" کا مقام ہے وہ تو ابھی دور تھا، بہت دُور۔ اُس دید سے تو میں اب بھی محروم ہوں جس کی تعریف رُومی نے یہ کی ہے:۔

؎ آدمی دید ست باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

فکر و نظر کی بھی ابھی ابتداء نہیں ہوئی تھی، میری ہمتِ مطالعہ کتب تک ہی محدود تھی، درسِ حیات کی یہ ابجد خوانی غالبؔ کے اس شعر کی مصداق تھی ؎

لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز
یعنی یہی کہ رفت، گیا اور بود، تھا

حُسن کے معنوی جلوے روبرو نہ تھے، میری نظر بازی صورت پرستی کے حسین بت خانے میں مقید ہو کر رہ گئی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ذوق و شوق چاہے کتنی ہی اونچی سطح پر ہو، ہوسِ رنگ و بُو کا معاملہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کا فارسی اور اُردو کلام پیشِ نظر تھا مگر اس کی نکتہ آفرینی اور حقیقت سنجی تو

کیا اس کا معنوی حسن بھی دل کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ اس نظری سیر میں لغاتِ فیروزی اُردو اور لغاتِ فیروزی فارسی میری ہمسفر تھیں، الفاظ کی صورتیں جب سامنے آتی تھیں تو بولتی نہیں تھیں، کچھ مبہم سے تصورات بیدار ہوتے تھے، کچھ دھندلے سے خاکے ذہن میں آتے تھے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح جس طرح پریشان خوابوں کی پریشان سی تعبیریں ہوتی ہیں۔ بہرحال معنوی زندگی کی صبح طلوع ہو رہی تھی مگر مطلع ابر آلود تھا۔ چمنستانِ خیال کے بیل بوٹے اور رنگا رنگ پھول اس سہانے جھٹ پٹے میں ایک عجیب نیم دیدہ سے حُسن کی دلکشی کے ساتھ مجھے اپنی طرف مائل کرتے تھے۔ دل میں کچھ خوابیدہ خیال کسمسا کر پہلو بدلنا یا بیدار ہونا چاہتے تھے، دل میں ایک بے نام سی خلش بھی پیدا ہو رہی تھی، فکر کے چند گوشے اُلجھنیں پیدا کرنے لگے تھے، زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سُلجھانے کے لیے ناخنِ فکر میں کاوش بھی ہو رہی تھی۔ اِس پس منظر میں علامہؒ سے ملنے کی خواہش مجھے گُدگُدانے لگی۔ اس واقعہ سے بہت سال پہلے جب غالباً میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا مَیں نے انہیں دیکھا تھا، محسنِ اتفاق سے وہ ہمارے ہاں چند روز مہمان رہے تھے۔ اس لڑکپن کے زمانہ میں مجھے علامہ اقبالؒ کا ترانہ یاد تھا اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ لَے کے ساتھ یا بے لَے اُسے خاصے جہر سے پڑھا کرتا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ علامہؒ نے میری کم سنی کی زبان سے جب یہ شعر سُنا تھا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تو والد مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی قسمت سے مایوس نہیں ہوں، اگر اس دور کا مسلمان میرے پیغام پر توجہ نہ دے گا تو یہ بچے بڑے ہو کر اس پر کاربند ہوں گے۔ علامہ کی اس بات کو جب میں یاد کرتا ہوں تو مجھے حسرت آمیز افسوس سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم بھی اقبالؒ سے اتنے ہی ناآشنا ہیں جتنے کہ ہم سے پہلے لوگ تھے، شاید اُن سے بھی کم، اِس وقت مجھے بے اختیار علامہؒ کے یہ شعر یاد آگئے ہیں ؎

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک — بسے گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں فقیرے — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

خیر یہ تو برسبیلِ تذکرہ تھا۔ غالباً اپریل ۱۹۲۶ء کی بات ہے مَیں نے جی میں ٹھان لی کہ علامہؒ

سے ضرور ملنا چاہیئے۔ چنانچہ چند دوستوں کو جو میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے، اس بات پر آمادہ کیا کہ چلو علامہ کی زیارت کریں اور مُسلم قوم کے مستقبل کے بارے میں پوچھیں ۔ ان کی شاعری ہمارے عام شعراء جیسی شاعری نہیں ہے، وہ اس نیم جان اور درماندہ قوم کو زندگی اور زندہ دلی کی ایک نئی تعلیم دے رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم !
یہ بھی سُنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

اگرچہ ہم زوال و پستی کی انتہاء کو پہنچ چکے ہیں لیکن اُن کا کہنا ہے کہ ؎

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور دیکھو ان کی شاعری زُلف و کاکل کے پیچ و خم میں اسیر نہیں ہے، نہ خدوخال کی رعنائیوں میں گرفتار ہے، رُخِ زیبا کے آب و رنگ میں وہ حسنِ عمل کی اس حقیقت کو دیکھتے ہیں جس سے فرد اور قوم کی زندگی استوار اور بامراد ہوتی ہے، یہ خودی کیا ہے؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا ہوں، شاید زندگی کے سوز اور تڑپ کا نام ہے جو حُسن سے متاثر ہو کر حسنِ عمل کی طرف راغب ہوتی ہے۔ وہ ہم کو صحیح معنوں میں مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں اور اُن کے نزدیک اسلام میں ہی وہ زندگی کا حقیقی نور ہے جو انسانیت کو علم و اخلاق اور حسنِ عمل کے اونچے مقام پر لے جاتا ہے، تب ہی تو وہ کہتے ہیں ؎

من شکوہِ خسروی اُورا دہم
تختِ کسرای زیر پائے اُو نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن
رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

القصہ دو دوست ہمراہ ہو گئے اور ہم علامہؒ کے درِ دولت پر پہنچ گئے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بارعب و داب شخص، لباسِ فاخرہ میں ملبوس، غرورِ علم و عرفاں سے بھاری بھرکم بنا ہوا بہ صد شانِ تمکین کسی پُرتکلف صوفے پر بیٹھا ہوگا اور ہم حقیر طالبعلموں کے ساتھ بڑی بے رخی اور کم نگاہی سے پیش آئے گا، چل تو کھڑے ہوئے ہیں پر دیکھئے کیا ہو؟ وہاں کچھ عالم ہی اور دیکھا۔ درویشانہ وضع قطع، کشمیری خدوخال، دماغی ساخت میں آئن شائن سے ملتا جلتا ایک میانہ قد شخص تہبند باندھے ہوئے نہایت سادگی و بے تکلفی سے ایک بوسیدہ سی آرام کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، نشست کا طریقہ بھی پرانی وضع کے لوگوں کا ہے یعنی ٹانگیں کرسی پر اُٹھی ہوئی ہیں، برابر میں حقہ رکھا ہوا ہے جب کوئی جملہ ختم ہوتا ہے تو حقہ کا کش لگا لیتا ہے۔ اس درگاہ میں کسی حاجب و دربان کو نہ پایا، اطلاع رسانی کی رسم حاضر بھی نہیں دیکھی، محفلِ عام تھی جو آتا تھا سلام کر کے بیٹھ جاتا تھا گویا نیاز کیشوں کے لیے صلائے عام تھی۔ حُسنِ اتفاق سے خواص میں سے اُس وقت کوئی موجود نہیں تھا، اس لیے ہم نے پیشوائی اور پذیرائی کی رسمِ تکلف کو وہاں نہ دیکھا۔ اندازے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سوائے معدودے چند اشخاص کے علامہؒ کسی کے لیے اُٹھتے بیٹھتے نہ ہوں گے ــــ علامہؒ نے ہم سے پنجابی میں پوچھا کہ کس طرح آنا ہوا، آپ کالج کے طالب علم معلوم ہوتے ہیں ــــ ہم نے عرض کیا کہ آپ سے کچھ سننے اور سیکھنے آئے ہیں۔ گفتگو اوّل سے آخر تک پنجابی ہی میں ہوتی رہی جس سے یہ معلوم ہوا کہ علامہ اُردو اُن لوگوں سے بولتے ہیں جو پنجابی نہیں بول سکتے ــــ ہماری خلافِ توقع علامہؒ نے ہماری حاضری پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا اور فرمانے لگے کہ جب طالبعلم مجھ سے ملنے آتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں، میری امیدیں انہیں ہونہاروں پر لگی ہوئی ہیں، میرے کلام کی تاثیر اگر ان لوگوں کے دلوں میں داخل ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میرے اشعار اکارت نہیں گئے۔

مَیں نے سوال کیا کہ عالمِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے ایک طویل تقریر کی جس کی تفصیل مجھے یاد نہیں رہی، اجمالی طور پر یہ یاد ہے کہ انہوں نے کہا کہ عالمِ اسلامی میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے، عرب بیدار ہو رہے ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے سیّد جمال الدین افغانیؒ کی تحریک اور اُن کے جانشین مفتی محمد عبدہٗ مصری کی مساعی کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ مصر میں آزادی و خود مختاری کا ایک بے پناہ جذبہ موجزن ہے، جس سے تمام

عرب ممالک کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ روس کے مسلمانوں کے سلسلہ میں انہوں نے مفتی محمد عالم اور قازان کی یونیورسٹی کا ذکر کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ اشتراکی آمریت کی دار و گیر کے باوجود وہاں اسلامی ثقافت پھر اُبھرے گی اور اس عبوری دور کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد روسی ترکستان اور اس کے ماحول میں اسلامی تعلیم اپنے حقیقی مقام کو حاصل کرے گی، قرآن کا دیا ہوا ضابطۂ حیات قانونِ فطرت کے مطابق ہے اس لیے اس کے بقائے دوام میں کوئی شک نہیں۔ عثمانی ترکوں کے بارے میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ان کے موجودہ فکر و نظر میں اصلاح کی ضرورت ہے، وقت گذرنے کے بعد خود بخود اس کی صورت پیدا ہو جائے گی، زمانے کی مصلحتوں اور حالات کے ناگزیر تقاضوں سے جو روشِ اعتزال و جدت پسندی وہاں پیدا ہوئی ہے وہ افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے۔ قوموں کی تاریخ میں ایسے دور بھی آیا کرتے ہیں۔ ترکوں کی ترقی کے خطوط درست ہو جائیں گے کیونکہ ترک قوم کا مزاج فطرتِ اسلام کے ساتھ ایک خاص مناسبت رکھتا ہے، اس ضمن میں انہوں نے اُن اسباب و احوال کا ذکر کیا جن سے مجبور ہو کر ترکوں کو خلافت اور عالم اسلامی کی روحانی قیادت کو خیرباد کہنا پڑا، اُن کے نزدیک اس متحرک و ارتقا پذیر عالم میں اس قسم کے تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں اپنی صورتوں اور کیف و کم کے پیمانوں کو بدلتی رہتی ہے مگر معنوی و روحانی قدریں بدستور قائم رہتی ہیں صرف ان کے مظاہر تبدیل ہو جاتے ہیں، عالم اسلامی کی معنوی وحدت اور مسلمانانِ عالم کی یکجہتی جذبِ حرم کی رہینِ منت ہے، سیاست کے کسی مخصوص رنگ و بو یا شکل و صورت کی پابند نہیں ہے، اس کے عنوان بدل سکتے ہیں، اس کے طرزِ طور مختلف ہو سکتے ہیں مگر اس کی رُوح فنا نہیں ہو سکتی۔ وحدتِ اسلامی کی اس روح کو برقرار رکھنا ہمارا جزوِ ایمان ہے مگر کسی مخصوص رسم و راہ پر اصرار کرنا حق بجانب نہیں ہے۔

فلسفۂ خودی

اس کے بعد علامہ نے ہماری محدود استعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے فلسفۂ خودی کو بیان کیا اور یہ فرمایا کہ میں نے خودی کے لفظ کو خود پسندی، خود نمائی و خود طلبی کے معنوں میں استعمال نہیں کیا، خودی سے میری مراد عشق ہے اور میرے نزدیک عشق سوال کی نفی بلکہ اس کی ضد ہے۔ خودی کا تقابل و تضاد، ایثار، تواضع و فروتنی سے نہیں ہے بلکہ ان مادی خواہشات اور سفلی جذبات سے ہے جو انسان کو سوال پر مجبور کرتے ہیں اور اس

جوہرِ لطیف کو ضائع کر دیتے ہیں جو غیرتِ نفس کی صورت میں اس کے نفسِ ناطقہ میں ودیعت ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک نور ہے جو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی ایک تجلّی ذاتی انسان میں ہے، یہ نور اس میں اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ حسنہ پیدا کرتا ہے، اور اسی نور کو اُبھارنے سے انسان صفاتِ بہیمیہ پر غالب آسکتا ہے، اس نور سے انسان کے باطن میں صفائی، اخلاق و اعمال میں پاکیزگی اور سیرت و کردار میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ اسی متاعِ عزیز کو میں نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ جب تک عشق کی لگن نہ ہو انسان اپنی خودی کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور نفسِ مطمئنہ کی کیفیت اس کے ضمیر میں پیدا نہیں ہو سکتی، وہ عالمِ محسوسات اور اس کی گوناگوں خواہشات کا اسیر رہتا ہے۔ اور من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کے مقام کا لذت آشنا نہیں ہو سکتا جب تک آدمی میں عشق کی لگن نہ ہو وہ آب و گل میں مقیّد رہتا ہے اور اس کا طائرِ روح عالمِ معانی اور عالمِ حقیقت کی فضائے لطیف میں پرواز نہیں کر سکتا۔ میں اسی لیے بار بار اپنے کلام میں یہ زور دیتا ہوں کہ حُسن آئینۂ حق ہے اور حق آئینۂ حُسن۔ حُسنِ حقیقی سے لگاؤ پیدا کرو تاکہ عالمِ حیات سے ماورا اور مافوق ہو کر زندگی بسر کر سکو۔ پھر مولانا رومؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

آنکہ بر افلاک پرواز ش بُود
بر زمین رفتن چہ دشوار ش بُود

عشق آخر میں کہنے لگے، ارے یارو! مجھے تو تم سے یہ شکایت ہے کہ تم میں سب کچھ ہے مگر عشق نہیں ہے اور اس لیے تمہیں خودی کی معرفت حاصل نہیں ہے، خودی کی متاعِ عزیز اور گوہرِ نایاب کو تم بہیمی خواہشات اور سفلی جذبات کے ہاتھوں فروخت کرتے رہتے ہو اور اس کے معاوضہ میں جو تمہیں ملتا ہے اس کی حیثیت خس و خاشاک و خزف و خاک سے زیادہ نہیں ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اپنی خودی کے جوہرِ نفیس کو ذلّتِ سوال سے آلودہ نہ کرو اور اس نورِ لطیف کو ضائع نہ کرو جس کے بارے میں خدا تعالےٰ نے کہا ہے وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ۔ میں نے اپنی روح کو اس میں پھونک دیا ہے۔ پھر فرمانے لگے: یارو اگر عشقِ حقیقی کی لگن پیدا نہیں ہو سکتی تو ابتدائے کار میں عشقِ مجازی ہی پیدا کر لو، یہ بے خلش، بے آرزو زندگی جس میں نہ

لاگ ہے نہ لگاؤ کسی کام کی نہیں۔ آخر میں یہ شعر پڑھے ؎

سحر در شاخسار بوستانے
چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے نالۂ آہے فغانے

پھر پُرتپاک مصافحہ کیا اور ہم اُن کی پُرنم پُرسوز اور خمور نگاہوں کا تصور لیے ہوئے ان سے رخصت ہو گئے ــــ علامۂ مرحوم کی جس گفتگو کا خلاصہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں درج کیا ہے، اس کا مفہوم اُن کا ہے الفاظ میرے ہیں۔ اُن کے بیان کے جملے ٹھیک ٹھیک اب مجھے یاد نہیں۔ ذہن میں ماضی کے یہ مدھم سے نقوش باقی رہ گئے ہیں، ان تصورات سے میں نے ایک خاکہ آپ کے لیے کھینچ دیا ہے مگر مجھے یہ یقین ہے کہ علامہؒ کی رُوح ان پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دے گی۔

میری علامہؒ سے تیسری اور آخری مُلاقات اُس وقت ہوئی جب میں کالج کو چھوڑ چکا تھا اور کسی ضرورت سے لاہور آیا تھا اُس وقت میرا لطیفۂ قلبی قدرے بیدار ہو چکا تھا اور فکر کی بستی میں مَیں نے قدم رکھ لیا تھا، مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں دید و نظر کی منزل دور تھی اور اب بھی دور ہے مگر علم کی یورش محاذِ قلب پر شروع ہو چکی تھی ــــ منزل سے دُوری کے باوجود یہ مقام حقیقت شناسی کے لیے راہبر ہے، بقول مولانا رومؒ ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اس عالمِ تحیر میں کچھ وارفتگی و آشفتہ سری بھی پیدا ہو جایا کرتی ہے، غالباً ۱۹۳۷ء کے اواخر یا ۱۹۳۸ء کے اوائل کی بات ہے میں رات کے نو بجے کے قریب علامہؒ کے دولت کدہ پر حاضر ہوا، ملازم سے اطلاع کرائی، جواب ملا کہ میں علیل ہوں صبح کے وقت آئیے۔ ناوقت حاضر ہونے کا عذر میرے پاس نہ تھا تاہم دل نے گوارا نہ کیا کہ بے نیلِ مرام واپس ہو جاؤں، ایک کاغذ کے پُرزہ پر یہ لکھا کہ آپ کے کلام میں مُرشدِ رومیؒ کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

تو دلِ خود را چو دل پنداشتی
جستجوئے اہلِ دل بگذاشتی

اس لیے حاضر ہوا ہوں کل واپس پٹیالہ چلا جاؤں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم واپس آیا اور کہا کہ تشریف لے آئیے، علامہ مرحوم بغایت علیل تھے، نقرس کی تکلیف دردوں پر معلوم ہوتی تھی اور آواز بھی دلگیر و گلو بند تھی، میں نے عرض کیا کہ آپ کی آواز اتنی بیٹھی ہوئی کیوں ہے؟ جواب دیا کہ عرصے سے یہ تکلیف ہے، بہت علاج کیا مگر افاقہ نہ ہوا، آپ صبح آتے تو کچھ باتیں کرتا۔ بہرکیف آپ نے جو مثنوی رومیؒ کا حوالہ دیا تھا اس کے بعد میں انکار نہ کر سکا۔ بڑی دیر سکوت کا عالم رہا، میں خاموشی سے ان کے چہرے کو تکتا رہا اور ان کے نفسِ گرم سے ایک عجیب تاثر میری طبیعت میں پیدا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے اشعار میں اس پر بہت زور دیا ہے کہ صاحبِ دل کی تلاش کرو، آپ کو کوئی صاحب دل کیمیا صفت انسان ملا؟ فرمایا تلاش تو بہت کی لیکن ہمیں تو نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ اس وقت افرنگ کی ثقافت و تہذیب سے اشتراکی فلسفہ کا تصادم ہو رہا ہے اور لادینیت کا سیلاب انسانی فطرت کو بہائے لیے جا رہا ہے، آپ کے نزدیک مقتدات و افکار کی اس جنگ کا کیا انجام ہوگا؟ تھوڑے تامل کے بعد علامہ نے جواب دیا:

"میرے نزدیک مذہب و اشتراکیت کی اس جنگ میں بالآخر میدان فطرت کے دین یعنی اسلام کے ہاتھ رہے گا اور انسان کی فطرتِ صحیحہ اسی طبعی و فطری دین کو اختیار کرے گی، شک و انکار کا یہ دور بھی انسانی ارتقاء کا ایک ضروری دور ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا، فطرت کے غیر مبدل حقائق جو حقیقت اسلام سے تعلق رکھتے ہیں بدل نہیں سکتے اس لیے اسلام کا ازلی مذہب ابدیت سے ہمکنار ہے۔"[1]

---

[1] پندرہ روزہ "استقلال" لاہور ۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے مارچ ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا، اس زمانے میں میں پریس کا کاروبار کرتا تھا، ڈاکٹر صاحب مرحوم "پیامِ مشرق" کا نیا ایڈیشن چھپوانا چاہتے تھے، اور ایک دوست سید نذیر نیازی صاحب نے میرا تعارف اور میرے پریس کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور لاہور چلا گیا، اُس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان میکلوڈ روڈ پر تھا، ویسے تو مکان کا پھاٹک بھی تھا اور اپنی الگ سڑک بھی تھی، لیکن پھاٹک چند ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیوں کے بغل میں تھا اور اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر نہ زمین کی سیاہی باقی رہی تھی نہ حرفوں کی سفیدی۔ بس زنگ اور گرد کے بڑے بڑے دھبے سے تھے، اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سوا اور کسی کو ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسے بورڈ کو اپنے پھاٹک پر ننگا رہنے دے، پھاٹک کے اندر احاطہ خاصا بڑا تھا لیکن وہاں پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دیدار کے خیال نے نظر کو اِدھر اُدھر دوڑنے نہ دیا، میرے دوست نے ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کو پکارا، وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا، مگر آواز کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے دیا:۔

"آؤ جی نیازی صاحب"

ہم دونوں جلدی سے زینوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے، میرا تعارف کرایا گیا اور میں ادب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا، ڈاکٹر صاحب نے تازی پلم بھروائی اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حسن و عشق کے ذکر کا نہیں تو ردیف اور قافیہ اور بحر کے نرم کا اثر شاعر کی صورت پر پڑتا ہے اور صورت میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو تو ادا، انداز،

آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لرزش، کوئی نہ کوئی خصوصیت منظم کہنے والے کو ان لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے جو نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی وجہ سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال کی صورت، شکل، وضع قطع، لباس اور گفتگو میں ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ دینے والی کوئی صفت نہیں۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا اور پہلی نظر نے اسے اور بڑھا بھی دیا۔ نیلی قمیص، شلوار نہ میلی نہ صاف، بال مٹیالے بھورے رنگ کے جنہیں حجام نے جیسے سمجھ میں آیا کاٹ دیا تھا، رنگت بے آب، آنکھیں دھوپ میں بیٹھے رہنے سے دبی اور دھنسی ہوئی، مونچھیں پتلی اور آگے کو نکلی ہوئیں، داہنا چوڑا اور اس کے دونوں طرف گہری جھریاں، اس پر زبان ملی جلی اردو اور پنجابی، یہ شاعر کا سراپا نہ کہلائے گا اور دراصل یہ ڈاکٹر صاحب کی اصل صورت تھی بھی نہیں، بلکہ شلوار اور قمیص کی طرح روزمرہ کی صورت جو ایک پردہ کی طرح اوپر پڑی رہتی تھی اور ان کی اصل صورت کو روزمرہ کے گرد و غبار اور اس میل سے بچاتی تھی جو سبھی کے جسم پر جما کرتا ہے۔ یہ اوپر کا پردہ ادھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی اُٹھ گیا جب ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع کی، وہ تخیل اور ہمت کی اس پستی سے بیزار تھے جو مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار، سائنس اور تجارت کے میدانوں میں قدم رکھنے سے روکتی ہے اور انہیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوا اور کسی لائق نہیں چھوڑتی، ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ میں نے جرمنی جا کر پریس کا کام سیکھا تھا اور ان کی ہمت افزائی نے مجھے بھی اس کا موقع دیا کہ میرے دل میں ان کی جو عزت اور محبت تھی اُسے ظاہر کروں۔ پھر اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں، مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہیں، تاریخ ان کے مکان کی چھت ہے اور وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ دیواریں کہیں اتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ نہ سنبھال سکیں، کہیں ان کے سر سے سایہ نہ اُٹھ جائے، ان کا گھر ویران نہ ہو جائے، اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں تو ڈاکٹر صاحب کی صورت سے دوسرا پردہ ہٹا۔

ظاہر میں تو وہی ڈاکٹر اقبال اسی لباس میں اسی کرسی پر دھوپ میں بیٹھے حقے کے

کش پرکش لے رہے تھے، لیکن ان کی باتیں سنتے سنتے کبھی تو اُس کتب خانہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جہاں علم کا سارا ذخیرہ جمع ہو، جہاں عالم اور شاعر اور فقیہ مل کر بیٹھتے ہوں، ان کے دل میں ایک خیال، زبان پر ایک بات، آنکھ میں ایک نشہ ہو، اور ان کی صحبت نے ایک فضا پیدا کر دی ہو، جو آدمی کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس کے دل میں وہی ایک خیال سما جائے، زبان سے وہی ایک بات نکلے، آنکھ اسی ایک نشہ میں مست ہو جائے کہ جس نے عالم اور شاعر اور فقیہ کی تین ہستیوں کو ایک شخصیت بنا دیا تھا، کبھی نظر ہر قید سے آزاد ہو جاتی تھی، مشرق سے مغرب تک دُنیا ایک قالین کی طرح بچھ جاتی تھی اور دُنیا کا وہ کاروبار جو تخیل کو عاجز کر دیتا ہے، آنکھ سے دکھائی دینے لگتا، کبھی جہالت کی تاریکی علم کی روشنی سے چھنتی، مشکل کی گرہ شوق کے ہاتھوں کھلتی، کبھی علم اور شوق کی پیاس جذبۂ دین کے اُبلتے چشموں میں بجھتی، کبھی منزل کی دُوری ہمت کو ڈراتی، کبھی منزل پر پہنچ کر انسان زمین آسمان پر اس طرح نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کسان اپنی زمین کو دیکھتا ہے۔ اس وقت بھی ڈاکٹر اقبال اسی لہجے میں، اسی انداز سے باتیں کر رہے تھے، لیکن میرا سر جھکتا جا رہا تھا، آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

یہ دوسرا پردہ نہیں ہٹا، اس کے آگے میں اور کچھ نہیں دیکھ سکا، اس کے آگے اور کوئی جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں ڈاکٹر اقبال کی خلوت تھی جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ آسمان کی طرف کھلتا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں دو تین روز کے اندر کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، دو ایک بار میں ایسے وقت بھی گیا جب وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور اُن سے ڈاکٹر اقبال کی جو گفتگو ہوتی تھی وہ بھی میں نے سُنی، پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کو تہہ در تہہ کیوں رکھتے ہیں، لاہور کے شہری بن کے کیوں رہتے ہیں، ملّتِ اسلامی کا آفتاب ہوتے ہوئے بادلوں کے نقاب کیوں ڈالے رہتے ہیں، میں سمجھ گیا کہ وہ بے پروائی جو شاعرانہ مزاج کے

لوگ بکھرے بالوں اور بے ڈھنگے کپڑوں سے ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس طرح سے برتی کہ اپنے آپ کو ہر امتیاز سے محروم کر دیا، وہ خوش مذاقی جو دوسرے اچھے کپڑوں، سلیقے کے رہن سہن، نفاست اور تکلفات میں تلاش کرتے ہیں۔ انہیں ملنساری، ہنسی مذاق اور دریائی پرند کی طرح پانی میں رہ کر پرِ پرواز کو خشک رکھنے کی صفت میں ملی، انہوں نے اس ادنیٰ وضعداری کو نظر انداز کیا، جس کی رسائی لباس اور آدابِ صحبت کے آگے نہیں، اور اس اعلیٰ وضعداری کو اختیار کیا جو مسجد ہار میں چٹان کو قائم رکھتی ہے، یا زمین آسمان کی گردش میں قطب ستارے کو، وہ دُنیا میں دُنیا والوں کی طرح رہتے تھے، دل میں صاحب دلوں کی طرح گفتگو جلوت میں کرتے تھے، شعر خلوت میں کہتے تھے وہ خود بالکل سچ فرما گئے ہیں کہ ؎

باچنیں زورِ جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

"جنون کے اس زور میں بھی میرا گریبان کبھی چاک نہ ہوا، یہ ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں کہ جنون میں بھی آپے سے باہر نہ ہو"

اُن کی ظاہری صورت دراصل ضبط کا ایک پردہ تھا، اور اس میں خوبی یہ تھی کہ یہ پردہ قدرتی تھا، جیسے ہیرے کے لیے پہاڑ کا آنچل، موتی کے لیے سیپ کا سینہ ہوا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی بڑی قدر تھی، یہ شکایت کرتے تھے کہ اُن سے مل کر وہ اس طرح محظوظ نہ ہوئے جیسا کہ ان کا کلام سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں بیٹھ کر ہر شخص اُن کا جلوہ دیکھ سکتا تھا، ڈاکٹر اقبال نہ رہتے یا اُن کا جلوہ نہ رہتا، ان کی صحبت دراصل صحبت میں بیٹھنے والوں کا امتحان تھا، وہاں جا کر دوسرے یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کتنے بڑے آدمی ہیں، ڈاکٹر اقبال خود یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ ملنے والا کس ذہنیت اور مذاق کا آدمی ہے، اور اسی کے لحاظ سے گفتگو ہوتی، ڈاکٹر اقبال کے

اپنے ذہن میں بڑی لوچ تھی، وہ نہ عقاب کی طرح بلندی کے پابند تھے، نہ چوپایوں اور آدمی کی طرح پستی میں گرفتار، سچے شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے ڈاکٹر اقبال اپنی نظموں میں اپنے متعلق جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے، اب یہ اُن کے قدردانوں کا فرض تھا کہ اُن کی شخصیت کو سمجھیں، اس سے اثر لیں، اور روزمرہ زندگی میں انہیں باتوں کے چرچے کریں جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے دل اور ان کے کلام میں رہتے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا.... اور اس کا دُکھ سب سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا اُن کی مایوسی کا جو عالم تھا وہ اُن کی اُن بے مثل نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں انہوں نے اپنی بے قدری اور تنہائی کی کیفیت بیان کی ہے اور اس کی پرچھائیں سی میں ایک مرتبہ ان کے چہرے پر دیکھ بھی چکا ہوں۔ لوگوں نے انہیں سیاست میں اُلجھایا، ان کی بات نہیں سمجھے، اُن کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے، ان کی بڑی غرض کو اپنی حقیر اغراض کا رُوپ دے کر اسے رُسوا کیا، اُن کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کر انہیں اور ساری دُنیا کو دھوکا دیا۔ جنہوں نے یہ نہیں کیا وہ بھی عمل کا کام کر کے دکھلانے کا، تحریکیں اٹھانے کا شور مچاتے رہے، ڈاکٹر اقبال سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنی آنکھیں بند کر کے اور دل خاموش کر کے ان میں آ کر مل جائیں، اُجالے سے فائدہ نہ اٹھایا، آفتاب کو اپنے پاس بلاتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے اُن کا دل اپنا بڑا کام کر بھی گیا، جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے، اُس کے اور ان کے درمیان بس موقع کا فرق تھا، جس عمل کو وہ سچا عمل سمجھتے تھے، وہ غور کیجیے تو اُن کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رُخ ہے۔ انہوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دُنیا میں ایمان پھیلاتا ہے اور زندگی کا

سارا بوجھ سنبھالتا ہے اور اُن کے ذہن میں انسانیت کا جو تصوّر تھا وہ وہی ہے جس نے دنیا کو بارہا ایک نئی دُنیا بنا دیا ہے، اور ان کے کلام میں ایک نئی دُنیا بنائی ملتی بھی ہے، انہوں نے بہتیرے بھید بوجھ لیے تھے جو یقین کی جان اور انسانیت کی آبرو ہیں اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچّے یقین، سچّی انسانیت، سچّے علم کی پہچان ہے، یعنی ایک پوری ملّت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل و صورت دینے والے جذبات سمٹ کر ان کے دل میں آگئے تھے اور اُسے ایک نمونہ بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے کہ ہاں صحیح ہے، مذہب کہتا ہے کہ ہاں یہی چاہیئے، اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں، چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دلعزیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے، سستانے اور پناہ لینے کے لیے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں، وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دَم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا، آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا، اُسے ساحل سے عداوت ہوتی، وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے اُسے کہیں جانا نہیں ہوتا، اس کے لیے اُٹھنا اور تڑپنا بس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالمِ اسلام تھا، میں اس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتلا سکتا ہوں کہ موج اٹھی اور اس نے سمندر کو تہہ تک ہلا دیا، تڑپ کر آسمان کا منہ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی، تو اس میں موج اور موج کو پیدا کرنے والے کی کیا مصلحت تھی، وہ کچھ اور کیوں نہ تھی، اس نے کچھ اور کیوں نہ کیا، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج نہ ہوتی تو کوئی نہ تھا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں، دونوں جہان پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کیلئے سمجھوں کہ قطرہ کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے۔

حواشی

۱؎ جامعہ ملیہ کے مشہور استاد

۲؎ "پیامِ مشرق" کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ جامعہ ملیہ کے تحت شائع ہونے والا ایڈیشن دوسرا تھا جو غالباً ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

۳؎ شائع شدہ "آثارِ اقبال" (حیدرآباد دکن) مصنفہ غلام دستگیر رشید)

میں علامہ اقبالؒ کی علمیت، شخصیت، فضیلت اور علوِ مرتبت سے اس قدر مرعوب تھا کہ ان کی خدمت میں جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جب میں نے دارالعلوم السنۂ شرقیہ لاہور کی بنیاد رکھی تو اپنے بہنوئی مولوی دین محمد مرحوم ایڈیٹر میونسپل گزٹ کا سفارشی خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس درسگاہ کا افتتاح فرمائیں۔ حضرت علامہ نہایت تشفقت سے پیش آئے مگر ناسازیٔ طبع کی بناء پر میری درخواست تو منظور نہ کر سکے البتہ اُسی وقت دعا فرمائی کہ خدائے عزّ وجل اس درسگاہ کو کامیابی سے ہمکنار کرے، اور اس حقیقت کا میں بڑے فخر سے اعتراف کرتا ہوں کہ دارالعلوم نے جس طرح کامیابی کے مراحل طے کیے وہ حضرت علامہ کی اس پُرخلوص دُعا کی برکت کا نتیجہ تھے۔

انٹرویو: آقا بیدار بخت: از ثریا احمد
شائع شدہ رسالہ "کرن"
مجلہ لاہور کالج برائے خواتین: ۱۹۷۷ء

اقبالؒ سے ملاقات

خان عبدالغفار خان

خان عبدالغفار خان اتمان زئی (چارسدہ) کے خان بہرام خان کے ہاں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم میونسپل بورڈ ہائی اسکول میں حاصل کی، اس کے بعد مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک کے امتحان سے پہلے ہی فوج میں ڈائریکٹ کمیشن مل گیا لیکن انکار کر دیا، تعلیم کی تکمیل کے لیے کیمبلپور اور قادیان گئے لیکن تسلی نہ ہوئی، چنانچہ علیگڑھ چلے گئے اور باقی تعلیم وہیں مکمل کی، ۱۹۱۲ء میں شادی ہوئی، ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے ضمن میں گرفتار ہوئے، تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ہجرت بھی کی۔ ۱۹۲۱ء میں اتمان زئی میں ایک آزاد ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی، ۱۹۲۶ء میں حج کیا، سیاست میں کانگرس کے ہمنوا رہے۔ علامہ اقبالؒ کے متعلق ان کے یہ تاثرات اُن کی آپ بیتی سے ماخوذ ہیں۔ (مُرتّب)

ہمارے صوبہ میں کوئی قومی اخبار نہیں تھا، اس لیے میں نے ارادہ کر لیا کہ پختونوں کے لیے اپنی زبان میں ایک پشتو اخبار جاری کیا جائے جو صحیح معنوں میں قومی اخبار ہو، چنانچہ بڑی جدوجہد کے بعد مئی ۱۹۲۸ء میں میں نے "پشتون" کے نام سے اخبار شائع کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ پختونوں کو اپنی زبان سے کوئی محبت نہ تھی، لیکن جلد ہی یہ اخبار پشتونوں میں ہر دلعزیز ہو گیا اور دنیا کے ہر حصہ میں جہاں بھی پشتون رہتے تھے اسے منگواتے تھے۔ افغانستان کے امان اللہ خان کو پشتو سے بڑا ربط پیدا ہو گیا تھا

لیکن وہاں کے مُلّا، مُلّائوں نے اسے کافر قرار دیا اور اسے افغانستان سے نکال کر ہی دم لیا۔

افغانستان کی تباہی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصوّر کرتے ہیں۔ ہم نے اس مصیبت میں مال اور جائی طور پر افغانستان کی مدد کی اور اس وقت تک امداد جاری رکھی جب تک نادر خان کامیاب نہ ہو گیا۔ افغانستان کے انقلاب کے وقت اس کے حق میں پروپیگنڈا کرنے اور امداد فراہم کرنے کے لیے میں ہندوستان گیا تھا۔ پنجاب میں میں نے ڈاکٹر اقبال، ظفر علیخان اور دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔ لاہور میں ڈاکٹر اقبال سے ملنے پر میرے خلافت کے ساتھیوں نے میری بڑی مذمت کی، وہ کہتے تھے کہ میں ان سے کیوں ملا، وہ تو کسی کام کا آدمی نہیں، وہ تو ایک شاعر ہے[1] اس میں عمل کا مادہ نہیں لیکن آج میں پنجاب کے اخباروں اور لیڈروں کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ اسی اقبال کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے اس کے ہی دل و دماغ میں آیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی گناہ نہیں ہے، دنیا بھر میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ زندہ قومیں زندوں کی قدر کرتی ہیں ہمارے ہاں زندہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔

لاہور سے میں لکھنؤ چلا گیا، وہاں کانگرس کا جلسہ تھا، اس میں مجھے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے اس سے پہلے ان دونوں سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی۔ جواہر لال نہرو ڈاکٹر خانصاحب کے ساتھ ہی انگلینڈ میں ایک جگہ رہ چکے تھے، ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط ان کے نام لکھ دیا تھا، جلسے کے بعد میرے اور نہرو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔

وہاں سے میں دہلی چلا آیا، جمعہ کے روز مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہو گئی وہ بہت اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے لیکن ان کے بڑے بھائی شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے، مگر ان کا محمد علی پر بڑا اثر تھا، لہٰذا وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں محمد علی سے ناراض تھا اور ان سے میں نے قدرے پہلو بچایا مگر انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا وہ خود میرے پاس چلے آئے اور مسکرا دیئے اور ہنسی خوشی میں مجھ سے کہہ دیا "ہم پٹھانوں کی کچھ پروا نہیں کرتے"، پھر میری اُن کی قدرے نوک جھونک رہی،

اس کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ امان اللہ خان جس وقت یورپ جا رہے تھے اس وقت شوکت علی صاحب نے انہیں ایک سپاسنامہ پیش کیا تھا اور اُن کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے، میں بھی اس تقریب میں موجود تھا، لیکن وداع کے بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ شوکت علی کو جس قدر توقع تھی امان اللہ خان نے اتنے پیسے اُنہیں نہیں دیئے اِس لیے وہ امان اللہ خان سے ناراض تھے۔

کچھ دنوں بعد نادر خان کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا، اِس پر ہم نے بڑی خوشی منائی اور عظیم الشان جلسہ کیا، میں نے بھی اس موقعہ پر ایک تقریر کی۔

حواشی

لہ خان صاحب نے اپنی پہلی ملاقات میں علامہ سے اپنی بات چیت کی تفصیل بیان نہیں کی، حیرت ہے کہ وہ نادر خان کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے ضمن میں علامہ کے رول کو بھول گئے، اس ضمن میں مزید تفصیلات اللہ بخش یوسفی کی کتاب "سرحد اور جدوجہد آزادی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اقبال

[کرنل بشیر حسین زیدی]

علامہ اقبال ۲۲ نومبر ۱۹۲۹ء کو میرے ہاں تشریف لائے تھے، سر راس مسعود اور ولس چانسلر اور خواجہ غلام السیدین بھی کھانے پر شریک تھے، باقی حضرات کے نام یاد نہیں، کھانے کے بعد میں نے عرض کیا آپ جہاں جاتے ہیں لوگ آپ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے ہیں، میری ایک مختلف درخواست ہے اور وہ یہ کہ آپ میرے سکول میں تشریف لاکر میرے بچوں سے اپنا کلام سنیں، انہوں نے مسکرا کر اس درخواست کو قبول کر لیا، میں نے کئی دن تک بہت محنت کر کے چند لڑکوں کو علامہ کی کئی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھنا سکھائیں۔ ان میں مرثیہ مسدس خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس کی لے ایسی پُراثر اور دردناک تھی کہ علامہ اقبالؒ زار و قطار روتے رہے دیگر حاضرین پر بھی بہت اثر ہوا، یہ جلسہ بہت کامیاب رہا.....

اقبالؒ اور میں ۳۲ء کے آخر اور ۳۳ء کے شروع میں لندن میں مقیم تھے، میں تیسری گول میز کانفرنس میں رامپور کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، علامہ شام کو کئی مرتبہ تنہا ہوتے تھے۔ میں بہت دفعہ انہیں اپنے ساتھ کسی تفریح کے مقام پر لے جایا کرتا تھا۔ راؤنڈ ٹیبل ختم ہوئی تو انہوں نے ایک دن فرمایا کہ میں سپین جانا چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو، میں نے معذرت کی کہ نواب صاحب رامپور میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ وہاں جا کر "مسجدِ قرطبہ" جیسی نظم لکھیں گے۔ آج تک افسوس ہے کہ نواب صاحب کی ذرا سی ناراضگی کا خیال کر کے میں نے سنہری موقعہ ضائع کر دیا۔

ضائع شدہ رسالہ "اقبال" سرینگر، شمارہ ۱ ستمبر ۸۱ (خط بنام آل احمد سرور ۲۵ جون ۸۱ء)

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ سے

چند مُلاقاتیں

سیّد بادشاہ حسین

عُثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر علامہ اقبال اسلامیات پر تقاریر کرنے کے لیے حیدرآباد آئے ہوئے تھے[۱]۔ تقاریر سننے کے لیے علامہ کے درشن کیلئے ٹاؤن ہال میں ہزاروں کا مجمع تو ہوتا تھا لیکن مطالب اتنے ادق تھے کہ صاحبانِ علم کے سوا دوسرے سامعین پوری طرح استفادہ نہ کر سکتے تھے، پھر بھی شائقین کا ہجوم برابر ہوتا تھا۔

میں اُن دنوں کالج میں پڑھتا تھا اور یونین کا ایک چھوٹا سا عہدہ دار بھی تھا، طے پایا کہ یونین کا ایک وفد علامہ سے ملاقات کرے اور کالج میں تقریر فرمانے کی دعوت دے۔ سرکاری مہمان خانے میں ان کا قیام تھا، پانچ چھ طلباء ایک وفد کی صورت میں علامہ کی خدمت میں پہنچے، تقریر کی دعوت دی مگر انہوں نے عذر فرما دیا۔ ہم نے دوسری تجویز پیش کی:۔

"تقریر نہ سہی کوئی طویل نظم کالج میں سنا دیجیے، سارے طالبعلم آپ کا کلام سننے کے بے حد مشتاق ہیں۔"

"ایک عرصہ سے میں نے نئی نظم اُردو میں نہیں کہی۔" علامہ بولے۔

"پرانی نظم ہی سہی۔" ہم نے اصرار کیا۔

"چھپی ہوئی نظمیں تو مجموعہ میں پڑھی جا سکتی ہیں۔"

"مگر آپ سے سننے کی بات ہی کچھ اور ہے۔"

"نہ ـــــ نہ ـــــ میں نظم خوانی پسند نہیں کرتا ـــــ مجھے معاف کریں۔"
ایک منچلے لڑکے نے بلا سوچے سمجھے فرمائش کر دی:
"اچھا کالج میں نہ سہی یہیں سنا دیں۔"
ان کے ابرو پر بل پڑ گئے، بات طبیعت پر گراں گذری، بولے: "میں ان شاعروں میں نہیں ہوں اور نہ قوال ہوں ـــــ میرا کلام پڑھنے کے لیے ہے نہ کہ سننے کیلئے۔"
ایک اور طالبعلم نے مداخلت کی: "ہم آپ سے خودی کا فلسفہ اور مردِ مومن کا تصور سمجھنا چاہتے تھے۔"
"آپ اپنے پروفیسروں سے رجوع کریں۔"
"مجھے شعر گوئی کا شوق ہے، آپ سے اصلاح چاہتا ہوں۔" ایک طالب علم دل کی بات زبان پر لایا۔
"میں یہ کام نہیں کرتا ـــــ یہاں بڑے بڑے اُستادانِ فن موجود ہیں، آپ اُن سے مشورہ کریں۔"
"مثلاً؟"
"علامہ علی حیدر نظم طباطبائی[۲]، حضرت جلیل[۳]"
"مگر میں نئی طرز کی نظمیں کہتا ہوں۔"
"مولانا نظم قدیم اور جدید رجحانات پر کامل عبور رکھتے ہیں، ان کی "گورِ غریباں" نئی طرز کی نظموں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے"
"آپ اجازت دیں تو میں ایک آدھ اپنی نظم سناؤں۔" لڑکے نے کہا۔
"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات صاف کہنا چاہتا ہوں ـــــ اوّل تو شعر گوئی کو ایک تفریحی مشغلہ سمجھنا غلط ہے ـــــ دوسرے یہ ہر شخص کو شعر نہیں کہنا چاہیے، اس کے لیے فطری صلاحیت اور علمی و فنی استعداد ضروری ہے ـــــ تیسرے یہ کہ زمانۂ طالب علمی میں طالبعلموں کو پوری توجہ تعلیمی نصاب پر دینی چاہیئے۔"
ہم نے سمجھ لیا کہ علامہ اب ہم سے چھٹکارا چاہتے ہیں، ہم نے آٹوگراف کی خواہش کی

اور اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ ایک ایک شعر تحریر فرما دیں تو بڑا کرم ہوگا، یہ خواہش انہوں نے سب کی پوری کی۔

علامہ کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے میں چند روز کے لیے لاہور میں تھا، موقع سے فائدہ اٹھا کر میں حاضرِ خدمت ہوا، کچھ لوگ بیٹھے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں تھوڑی دیر بعد میں چلا آیا، دوسرے دن پھر گیا، لوگ کم تھے، پوچھا "آپ کل بھی آئے تھے کہیئے کیا کہنا ہے"؟ میں نے عرض کیا "دس بارہ روز کے لیے لاہور آیا ہوا ہوں، اگر بار خاطر یا مصروفیات میں مخل نہ ہوں تو دل چاہتا ہے کہ حاضرِ خدمت ہوتا رہوں"۔

فرمایا "بار خاطر ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا البتہ آپ کو زحمت ہوگی"۔ حیدرآباد کے بعض لوگوں کے بارے میں پوچھا، پھر میرے بارے میں کچھ تفصیلات پوچھیں۔

تیسرے دن میں گیا تو ایک مولوی صاحب سے مذہبیات پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا، اسلام اور روحِ موضوعِ بحث تھے، متقدمین سے لے کر متاخرین تک... اکثر مفکرین کا ذکر آیا اور علامہ ہر موضوع پر اور ہر مکتبۂ خیال پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اظہارِ رائے فرما رہے تھے اور فلسفہ اور حکمت کے دریا بہا رہے تھے۔

چوتھے دن میں پہنچا تو کوئی نہ تھا، وہ کہنے لگے "سید تم تین روز سے مسلسل آ رہے ہو، ان گفتگوؤں میں کوئی حصہ نہیں لیا"۔

"میں حاضر اس لیے ہوتا ہوں کہ آپ کی گفتگو سنوں، آپ کے سامنے اپنی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا"۔

"اپنی نجی زندگی میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں، تکلفات کا عادی نہیں، خواہ مخواہ پیچیدہ طرزِ اختیار نہ کرو، اس سے بیگانگی کا اظہار ہوتا ہے، گفتگو دو آدمیوں کے درمیان ہونی چاہیئے، برملا اور بے تکلف ——— اچھا چھوڑو ان باتوں کو ——— مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کچھ عرصہ ہوئے "بٹنہ لائبریری" پر تمہارا کوئی مضمون پڑھا تھا ———"

"جی ہاں" ادبی دنیا" کے لیے میں نے چند قسطوں میں خدا بخش لائبریری اور اس کے بعض نادر مخطوطات پر لکھا تھا"۔

"ہاں ہاں وہی ——— تمہیں پرانی کتابوں کا شوق ہے؟ مذہبیات کا مطالعہ کرتے ہو؟ فلسفہ پڑھا ہے؟ ———"

"میرے مضامین کالج میں معاشیات، سیاسیات اور تاریخ تھے، اُردو ادب کی طرف طبیعت کا ذاتی رجحان زیادہ ہے، تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے اور کرتا رہتا ہوں۔"

شعر و ادب کی باتیں ہوتی رہیں، موجودہ رجحان کا ذکر بھی چھڑا، نعت گوئی کا قصہ چھڑا، میں نے عرض کیا: "آپ کی نعت اور منقبت خصوصاً فارسی میں مجھے بے حد پسند ہے۔"

وہ دفعتاً گنگنانے لگے، پھر بآوازِ بلند ایک نعت سنائی، وہ مجسم تاثر تھے اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کس قدر عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں، یکایک پڑھنا بند کر دیا اور کہنے لگے "تمہیں نعت سننے کا شوق ہے تو چلو میرے ساتھ، تمہیں نعت سناؤں کہ دل خوش ہو جائے۔"

جلدی سے کپڑے پہنے اور مجھے ساتھ لے کر باہر نکلے، میں حیران تھا، کہاں جا رہے ہیں۔ راستہ میں خود ہی بتایا کہ نعت کا بادشاہ تو ظفر علی خاں ہے، اس سے سنیں گے۔

مولانا ظفر علی خاں کے پاس پہنچے اور فوراً ہی نعت پڑھنے کی فرمائش کر دی۔ سنانے لگے، ایک کے بعد دوسری، ویسے تو ظفر علی خاں بھی متاثر تھے لیکن علامہ اقبال پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی، آنکھوں میں آنسو تیرتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

پانچوں ملاقات کے وقت علامہ کے ایک بے تکلف دوست بھی تھے، ان سے صاف صاف اور بے تکلفانہ انداز میں باتیں ہو رہی تھیں اور کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹتی تھیں۔ پہلے تو لاہور کی بعض شخصیتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا پھر سیاسیات پر بحث شروع ہوئی، مسلمانوں کی سیاست خصوصاً ایک کالائحہ عمل موضوعِ بحث بنا رہا۔

علامہ اقبال نے اس موضوع پر گفتگو کرتے وقت نہایت سنجیدہ اور بہت ہی دردمندانہ لب و لہجہ اختیار کیا، انہیں یقین تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نجات دہندہ ہے اور اسی کے پرچم تلے سارے مسلمان جمع ہو کر منزلِ مقصود کی طرف جا سکتے ہیں، اس وقت کے

سیاسی حالات کا علامہ نے بڑا اچھا جائزہ لیا اور پھر تجزیہ کر کے بتایا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں، ان کے دست مسلم لیگ کے طرفدار تو معلوم ہوتے تھے لیکن بعض طریقہ ہائے کار سے اختلاف ظاہر کرتے تھے۔ بعض صوبائی لیڈروں کے ذاتی حالات پر بھی انہوں نے ناخوشگوار تبصرے کیے، علامہ اس پر بگڑ گئے اور کہنے لگے "بس ان ہی میں تمہیں عیب نظر آتے ہیں دوسروں میں نہیں ——— تم جن کے طرفدار ہو اُن کے عیب میں گناؤں، سنو گے؟ ایسی ایسی باتیں کہ تم دانتوں میں انگلی پکڑ لو گے ——— اقبال کی آنکھوں کے آگے سبھی ننگے ہوئے ہیں ——— مگر میں نہ عیب جو ہوں اور نہ نقص بین"!

بڑی دیر تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ جب وہ گئے تو کہنے لگے: "لوگ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر قوم کا مفاد پسِ پشت ڈال دیتے ہیں ——— بلکہ لائف میں یہ حرکتیں زیادہ نازیبا معلوم ہوتی ہیں ———"

"جی ہاں، ہمارے ہاں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان، دونوں میں کردار کا فقدان ہے" میں نے عرض کیا۔

"سید! میں تو اپنی قوم کا رونا روتا ہوں، مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟ ایسی ایسی ریشہ دوانیاں کہ خدا کی پناہ، تو پھر جو کام ہی سیاست رکھ لیا ہے ——— اپنے اصلاح بین نے دوسروں کے عیب نمایاں کرتے پھرتے ہیں ——— کیا ہو گیا مسلمانوں کو ——— (اب آہ کی اور چہرہ پر رنج و ملال کے آثار رونما ہوئے اور گہری سوچ میں پڑ گئے) ——— سید! کیا ہو گا اس قوم کا؟"

"اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، وقت کی بات ہے" میں نے کہا، "جناح صاحب کی ذات میں انشاء اللہ مقصد حاصل اور مراد پوری ہو گی"!

"خدا کرے تمہارا کہا پورا ہو ——— میری ساری کوششیں یہ ہیں کہ جناح کے ہاتھ مضبوط رہیں اور ان کی تحریک ساری کی ساری ہندوؤں اور انگریزوں کے محاذ کی طرف رہے ——— بڑا سخت جان مجاہد ہے، دونوں فرنٹ پر وہ خوب لڑتا ہے، ہتھیار

استعمال کرنا جانتا ہے اور بڑا جری ہے ——— مسلمان قوم کی ساری اُمیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔"

"مسلمانوں کی پستی کے اسباب کیا ہیں؟" میں نے پوچھا "ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ ساری دُنیا کے مسلمانوں کی حالت یکساں ہے۔"

"اسباب؟ اسباب ظاہر اور واضح ہیں، ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ بیسیوں ——— علم سے بے بہرہ، صحیح فکر کا فقدان، بے عملی، افلاس، کردار کی پستی ——— کیا کیا کہا جائے، کن کن باتوں کو گنایا جائے ———"

"ارے تم نے تو وہی کہا جو شکوہ لکھنے کے بعد لوگوں نے کہا تھا ——— اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے تو میں نے جوابِ شکوہ لکھا۔"

اس موقع پر ایک ملاقاتی آ گئے اور بات رہ گئی، میں نے اجازت حاصل کی اور چلا گیا۔

آخری ملاقات اس کے اگلے دن ہوئی، شعر و شاعری کا موڈ طاری تھا، پرانے شعراء کے افکارِ عالیہ زیرِ بحث آئے، کہنے لگے "شاعر اگر پیغامبر ہے تو اس کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہونا چاہیے، بغیر اس کے بات نہیں بنتی، جذبات کے سوا شاعر کو فکر سے بھی کام لینا چاہیے۔"

اسی سلسلے میں بات یہاں پہنچی کہ بعض مخالف مکتب خیال کے لوگ علامہ کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ کہنے لگے "اگر ہمارا مطلب اس پروپیگنڈے سے ہے کہ میں فرقہ پرست ہوں، تو میں خود برملا کہتا ہوں کہ ہاں ہوں اور ضرور ہوں، میں مسلمان پہلے ہوں اور شاعر بعد میں۔ مسلمانوں کی خدمت میرا نصب العین ہے، فکر کے ذریعہ بھی اور اظہارِ خیال کے ذریعہ بھی، اسلام جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہے۔ وہ عظیم تر دنیا کو دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے اور اسی رشتہ میں تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو پروتا ہے۔ ہندو مجھ سے ناراض ہیں کہ میں دھرتی کو دیوتا نہیں سمجھتا، عیسائی اس لیے خفا ہیں کہ میں اسلام کا بہتر تصور پیش کرتا ہوں، مغرب کی شیشہ گری سے میں مسحور نہیں ہوتا

حیات و ممات کے بارے میں مغربی فکر پر اسلامی تصوّر کو فوقیت دیتا ہوتا ہوں ــــ
ہیں مغرب سے نالاں ہوں تو مغرب مجھ سے بیزار کیوں نہ ہو ــــ سیّد! یہ اختلافات
بنیادی ہیں، ہیں مغرب سے داد طلب ہوں بھی نہیں، میری نظر تو دُنیائے اسلام کی طرف ہے،
ان کو میری باتیں سمجھنا چاہیئے اور ان کی سمجھ میں آئیں گی بھی "

علّامہ اقبال کا یہ خیال درست ثابت ہوا، چنانچہ آج اسلامی دنیا میں وہ شاعرِ اسلام کی حیثیت سے روشناس ہیں اور ان کے افکارِ عالیہ کے چرچے روز بروز زیادہ ہی ہوتے جاتے ہیں [۱]

حواشی

[۱] علامہ مدراس کے سفر کے بعد ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد پہنچے تھے جہاں انہوں نے ۱۵ جنوری کو "اوثمان ہال میں مہاراجہ کشن پرشاد کی صدارت میں ایک لیکچر دیا۔ (شاد اقبال ص ۲۸)

[۲] علامہ علی حیدر نظم طباطبائی: سید علی حیدر اصل نام تھا، ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد آئے اور نظام کالج حیدرآباد کے پروفیسر مقرر ہوئے، ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو انتقال کیا۔ نظم گوئی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

[۳] حضرت جلیل: جلیل حسن اصل نام تھا، ۱۸۶۹ء میں مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ داغ کی وفات کے بعد نظام حیدرآباد کے استاد مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔

[۴] ظفر علی خاں: روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر؛ پیدائش ۱۸۷۰ء ضلع سیالکوٹ، وفات ۱۹۵۶ء

[۵] شائع شدہ روزنامہ "انجام" ۲۲ اپریل ۱۹۶۴ء

علاّمہ اقبالؒ

مُلاقاتیں • یادیں • تاثرات

نواب مشتاق احمد خاں!

پنجاب کے دیہاتی معاشرے میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت ہر گھرانے میں اللہ اور رسولؐ کا ذکر ہوتا تھا۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسولؐ ہر گھر کی مصروفیات کا ایک اہم جزو تھا۔ جب میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا تو مجھے ایک منظوم دعا یاد کرائی گئی جسے میں ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں اپنے والد صاحب کو سنایا کرتا تھا۔ اس معاشرے کے اسلامی مزاج کے پیشِ نظر نہ معلوم کتنے بچے میری طرح ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوں گے۔ توتلی زبان میں پڑھی ہوئی یہ دعا میرے والد صاحب سُن کر خوش ہوتے تھے اور ہر شعر کے بعد بآواز بلند آمین کہتے تھے۔

میرے والد صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ دعا سیالکوٹ کے شیخ محمد اقبال صاحب نے لکھی ہے۔ (ابھی وہ علاّمہ اقبال کے نام سے خطاب نہیں کیے جاتے تھے) جو حُسنِ اتفاق سے سیالکوٹ میں ان کے ہم مدرسہ تھے۔ عمر کے اس معصوم دور میں اس دعائیہ نظم نے میرے قلب و ذہن پر ایک مستقل اثر چھوڑا اور اس کے لکھنے والے سے نامحسوس طریقہ سے ایک عقیدت سی پیدا ہو گئی۔ میں والد صاحب سے ان کے حالات معلوم کرنے کے لیے لگاتار سوالات کیا کرتا تھا۔ شاید اسی تعلق خاطر کی وجہ سے اپنی زندگی میں جن لوگوں سے میرا زیادہ میل جول ہوا اُن میں ہر ایک اقبال کا عقیدت مند اور مدّاح تھا۔

اس زمانے میں مولانا حالی کی مسدس کا بڑا چرچا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا اس کے بند پڑھتا تھا اور پڑھ کر دوسروں کو سناتا تھا۔ پھر اقبال کا "نالۂ یتیم" علمی دنیا کی فضا پر چھا گیا۔ اُس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ہر محفل میں وہ پڑھا جانے لگا۔ بچوں میں ان کی نظم "پرندے کی فریاد" بڑی مقبول تھی۔ اسی طرح علامہ کی دوسری نظمیں ہر بچے اور بڑے کی زبان پر تھیں۔ مبارک علی فتح علی قوالوں سے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" قوالی کے رنگ میں پہلی بار میں نے جالندھر ہی میں سُنا۔ اس کے بعد تو وہ ہر قوالی کی محفل میں سُنایا جانے لگا۔

حیدرآباد میں جب میں مدرسے میں داخل ہوا، تو وہاں کلاس شروع ہونے سے پہلے علامہ کی مناجات ؎

"یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے"

پڑھوائی جاتی تھی۔ اُسے پڑھ کر قلب پر بہت اثر ہوتا تھا۔

حیدرآباد سے میں ہر سال کم از کم ایک بار اپنے عزیزوں سے ملنے جالندھر آیا کرتا تھا۔ وہاں میرے پھوپھا خان نیاز الدین صاحب کے پاس بستی دانشمنداں میں بھی پابندی سے حاضری ہوتی تھی۔ پھوپھا جان کے علامہ سے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور بستی میں ان کی محفل میں ڈاکٹر صاحب کا کسی نہ کسی عنوان سے ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ان دوستانہ تعلقات کی تصدیق علامہ کے ان ۹۷ خطوط سے ہوتی ہے جو بزمِ اقبال لاہور نے مکاتیبِ اقبال کے نام سے شائع کیے ہیں۔ ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو اعلیٰ نسل کے کبوتروں کا بہت شوق تھا اور وہ پھوپھا جان سے ان کے جوڑے منگواتے رہتے تھے۔ بستی میں ان کی حویلی میں کبوتر خاص حدود میں گھومتے غٹرغوں کرتے ہوئے گذرتے تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ پھوپھا جان کو خود ان کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے نوبہار خاں کو بہت دلچسپی تھی اور وہ ان کے بارے میں ماہرانہ رائے بھی دے سکتے تھے۔ علامہ کو اعلیٰ نسل کے

جوڑے بھی انہی کے تعاون اور مشورہ سے بھیجے جاتے تھے۔

اپنے خطوط میں کبوتروں کے ضمن میں علامہ نے بعض بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں:

"کبوتر بہت اچھے ہیں، مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بیزار ہیں۔"

ان خطوط میں علمی مباحث کی بھی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے جس سے علامہ کی سوچ کی رسائی ہوتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا۔۔۔۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی عملی روایات پر قائم رہ سکے گی۔

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا جو اپنی راہ پر قائم ہے اور یکتا اپنی ہٹ کا ہے۔"

علامہ اور پھوپھا جان میں محبت اور یگانگت کا باعث مولانا غلام قادر گرامی کی ذات تھی۔ دونوں کو ان سے بہت تعلق خاطر تھا۔ علامہ کے خطوط میں بار بار ان کا ذکر آتا ہے اور پھوپھا جان کی اپنی محفل میں بھی علامہ کے ساتھ مولانا گرامی کا ذکر نا گزیر تھا۔ ایک بار مولانا گرامی پھوپھا جان کے پاس بستی میں مقیم تھے۔ دونوں نے کچھ اشعار لکھ کر بھیجے۔

علامہ نے جواب میں فرمایا:

"مولانا گرامی کے اشعار جواہر ریزے ہیں۔ سبحان اللہ! ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے کہ برائے خدا غزل پوری کر دیں۔ آپ کے اشعار سے مجھے تعجب ہوا۔ معلوم نہ تھا کہ آپ چھپے رستم ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر مولانا گرامی کے ہموطن ہیں۔"

۱۹۲۹ء میں مدراس میں توسیعی لیکچروں کے بعد واپسی میں علامہ حیدرآباد تشریف لائے۔ اس وقت علامہ کی شہرت عروج پر تھی اور ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں

کا بڑا دھوم تھا۔ جامعہ عثمانیہ قائم ہو کر بھی کئی برس ہو گئے تھے۔ "گیسوئے اردو" کو سنوارنے کے لیے علامہ کو جس "شانہ" کی تلاش تھی وہ جامعہ نے مہیا کر دیا تھا، اس کی علمی فضا میں اقبال کے رمز شناس پیدا ہو چکے تھے، اس لیے حیدرآباد کے ہر طبقہ کی طرف سے وزرائے حکمت، اکابر ملت، اساتذہ، طلباء اور علامہ کے مداحوں کے جم غفیر نے ان کا شاندار استقبال کیا اور اسٹیشن پر علامہ کے مشہور ترانے ہی سے ان کو خوش آمدید کہا گیا۔ شاہی مہمان کی حیثیت سے ان کی پذیرائی ہوئی۔ اس موقعہ پر علامہ کی نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔

میرے والد صاحب جب شاہی مہمان خانے میں ان سے ملنے گئے، تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ میرا تعارف کراتے وقت والد صاحب نے علامہ سے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! یہ لڑکا بچپن ہی سے آپ کی دعائیہ نظم پڑھا کرتا ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے علامہ کی زیارت کی۔ میرے ذہن میں ایک شاعر کا جو روایتی تصور تھا، علامہ اس سے بہت مختلف تھے، وہ شاعر سے زیادہ فلسفی اور مفکر معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو کے دوران کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے عالم میں سیر کر رہے ہیں۔ خود میرے پھوپھا جان کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

"میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغلِ ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیل میں قرونِ اولیٰ کی سیر۔"

علامہ اور میرے والد قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ اُن کی گفتگو کا رُخ سیالکوٹ کے مدرسے کی یادوں سے شروع ہو کر علمی موضوعات کی طرف مڑ گیا۔ اسی دوران جب والد صاحب نے پھوپھا جان کا ذکر کیا جن کے ذریعہ سے انہیں علامہ کی مصروفیات اور مشاغل کا پتہ لگتا رہتا تھا، تو اس گفتگو کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ پھوپھا جان کے ذکر کے ساتھ مولانا گرامی کا ذکر آنا ناگزیر تھا۔ علامہ نے مولانا گرامی سے متعلق بہت سے لطیفے بھی سنائے۔ اور ان کی طبیعت اور مزاج کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا۔ گرامی صاحب سے میرے والد کے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ جب تک وہ حیدرآباد میں رہے۔

ہمارے ہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ اُن کی زبان پر بھی علامہ اقبال کا ہی ذکر رہتا تھا۔ میرے والد کی جب حیدر آباد کی ملازمت میں پہلی ترقی ہوئی تو گرامی صاحب نے انہیں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

زمعنی باخبر صدر مجاسب نکتہ داں آمد
رئیسِ اعظم پنجاب فخر الدین خاں آمد
گرامی آرزوہائے مرا گر در حساب آمد
تواں گفتن کہ ہاں کامل عیار امتحاں آمد

علامہ کو آموں کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک خط میں انہوں نے میرے پھوپھا جان کو لکھا :

"آموں کی کشش کششِ علم سے کچھ کم نہیں۔ یہ بات میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں آم ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے مجھے محبت ہے۔"

آموں کا ذکر آیا تو علامہ نے وہ شعر سنایا جو انہوں نے آم کے پارسل کی رسید کے طور پر اکبر الہ آبادی کو بھیجا تھا ؎

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

یہ سن کر میرے والد نے فرمایا :

"ڈاکٹر صاحب آپ نے حیدر آبادی لنگڑا نہیں دیکھا وہ یقیناً اپنے الہ آبادی بھائی سے زیادہ تنومند ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا :

"آپ دکھائیں گے تو دیکھ لوں گا۔"

والد صاحب نے جواب دیا :

"اگر الہ آبادی لنگڑا لاہور تک پہنچ سکتا ہے تو مجھے حیدر آبادی لنگڑے کے

وہاں تک پہنچ جانے میں کوئی شبہ نہیں۔"

چنانچہ حیدر آبادی لنگڑے جس کی اردل میں ملغوبہ۔ الفانسو، شاہ ثمر وغیرہ بھی تھے کا بارسل علامہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ علّامہ نے اس کی وصولی کی اطلاع بھی ایک شعر میں دی تھی۔ افسوس کہ وہ خط حیدر آباد ہی میں رہ گیا۔

اس کے بعد علامہ کو میں نے علی گڑھ میں اپنے عزیز دوست خواجہ غلام السیدین کی قیام گاہ پہ دیکھا۔ علامہ سیدین کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں کی بہت نذر کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو بڑے تکلفانہ انداز میں علمی موضوعات پر ہوتی تھی۔ انہی دنوں دوسری بار میں نے انہیں سر راس مسعود کے ہاں دیکھا۔ راس مسعود صاحب علامہ کے عاشقِ زار تھے اور علامہ کو بھی ان سے بہت لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس مرثیہ سے ہوتا ہے، جو راس مسعود کی موت پر انہوں نے لکھا تھا۔

۱۹۳۵ء میں آخری بار میں نے علامہ کو حالی میموریل سکول کی ایک تقریب میں پانی پت میں دیکھا۔ جلسے میں ان کی زیارت ہوئی اور غلام السیدین کے ہاں بھی جن کا میں مہمان تھا۔ اس موقعہ پر حمید اللہ خاں، نواب بھوپال بھی موجود تھے۔ علّامہ نے ان کی موجودگی میں چند اشعار بھی سنائے۔

علامہ کو حیدر آباد سے بحیثیت ایک مرکز اسلام اور اسلامی تہذیب کے گہوارے کے بہت لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ یک طرفہ نہیں تھا، بلکہ اہلِ حیدر آباد کو بھی اُن سے بے حد عقیدت تھی اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ علامہ کی زندگی میں انہوں نے نہ صرف یوم اقبال بڑی شان سے منایا، بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے اس کے منانے میں پہل کی۔ یہ جلسہ ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد کے سب سے بڑے باغ میں ٹاؤن ہال کی پرشکوہ عمارت میں منعقد ہوا۔ اس میں حاضرین اور اقبال کے مداحوں کی اس قدر کثیر تعداد تھی کہ یہ عظیم الشان عمارت بھی اپنی تنگ دامانی کی شکایت کرنے لگی۔ میں خود اس جلسے میں موجود تھا اور اس کا روح پرور نظارہ میری زندگی کی خوشگوار ترین یادوں میں سے ہے۔

سٹیج پر علّامہ کی ایک قدِ آدم تصویر رکھی ہوئی تھی۔ میرے والد فخر یار جنگ نے

جو اس وقت وہاں وزیرِ مالیات تھے۔ بحیثیت صدر مسلم کلچر سوسائٹی کے، سپاسنامہ پڑھا اور صدارت کی تحریک کی۔ جلسے کی دو نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست میں شہزادہ برار ولیعہد سلطنت آصفیہ نے صدارت کے فرائض انجام دیئے اور اپنی تقریر میں شاہی خاندان اور حیدرآباد کی طرف سے قوم کے اس عظیم فلسفی، شاعر اور مفکر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر نوابین بھوپال اور رامپور۔ آغا خاں۔ سروجنی نائڈو۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ جواہر لعل نہرو اور دیگر اکابر نے پیغامات تہنیت بھجوائے۔ ڈاکٹر عبداللطیف جنہوں نے اپنی کتاب غالب کی وجہ سے علمی دنیا میں بڑی شہرت پائی، مشہور ادیب ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور سید ہاشمی فرید آبادی نے بڑے پر مغز مقالے پڑھے۔ دوسری نشست کی صدارت علامہ کے دوست مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ نے کی۔ اس میں اقبال کے مردِ مومن بہادرِ یار جنگ نے اپنے مخصوص انداز میں علامہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور ڈاکٹر یوسف حسین خان اور دیگر اہلِ علم حضرات نے مقالے پڑھے۔

اقبال کے نوجوان عقیدتمندوں نے بعض بڑی عمدہ نظمیں پڑھیں۔ یوں تو ہر نظم بڑی معیاری تھی، مگر مخدوم محی الدین کی نظم کے دو شعر ایک عرصہ تک حیدرآباد کی فضاؤں میں گونجتے رہے۔

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صورِ اسرافیل ہے دنیا تے پہچانا نہیں
حسن کی قندیل ہے، اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پاتک عشق کی اک آگ ہے

اقبال کے کلام اور فلسفہ کو متعارف کرنے کے لیے حیدرآباد میں ایک بزمِ اقبال قائم ہوئی جس کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے اور ہر سال یوم اقبال منایا جاتا تھا۔ اس ادارے نے بہت سی کتابیں اور مقالات شائع کیے۔ اس طرح حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں اور شعراء کی ایک بڑی کھیپ علامہ سے متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ اقبال کے مردِ مومن بہادر یار جنگ کی قیام گاہ پر درس اقبال ہوتا تھا۔ جہاں علامہ اقبال کے اشعار کی تشریح میں خود بہادر یار جنگ

پیش پیش ہوتے تھے۔ اس مجلس میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور دیگر اہلِ علم شریک ہوتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی وہاں جاتا تھا اور مستفید ہوتا تھا۔ بہادر یار جنگ کو علامہ سے اتنی عقیدت تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری سانس بھی اقبال کے شعر سے

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یوم اقبال منائے جانے کے ٹھیک چار ماہ کے بعد جب علامہ کے انتقال کی رُوح فرسا خبر ملی، تو حیدر آباد میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئی ایسا گھر نہ تھا، جہاں اُن کا سوگ نہ منایا گیا ہو، ایصالِ ثواب نہ کیا گیا ہو۔ ہر ادارہ اور ہر مسجد میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ٹھیک اسی مقام پر منعقد ہوا جہاں چار ماہ قبل ان کی زندگی میں ان کا یوم منایا گیا تھا۔ یومِ اقبال کے موقع پر ان کے عقیدت مندوں کے دلوں سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا، آج ان کی آنکھوں سے رنج و ملال کے آنسو بہہ نکلے تھے اور تھمنے نہیں پاتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب لوگ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر ہچکیاں لے رہے تھے۔

پاکستان کے تصور کے خالق کے تعزیتی جلسے میں رنج و یاس اور محرومی کی وہی فضا محیط تھی جو دس برس بعد میں نے پاکستان کے معمار (قائدِ اعظمؒ) کے جنازے پر دیکھی۔ اس جلسے میں حیدر آباد کے ہر طبقے نے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ سر وجنی نائیڈو اور نواب بہادر یار جنگ کے درد بھرے الفاظ نے حاضرین کو رُلا رُلا دیا۔ اور شعرا نے انہیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ علی اختر اہلِ دل کو سمجھاتے تھے کہ

ہستیٔ فانی کو جس نے جاودانی کر دیا
موت اسکو چھین لے ہم سے، نہیں ہرگز نہیں
وہ بھی زندہ، اس کا پیغامِ عمل بھی زندہ ہے
زندگی کے نور سے اسکی جبیں تابندہ ہے

سکندر علی وجد نے جو مرثیہ پڑھا اس کا آخری شعر تھا۔

تا قیامت تجھ پہ ابرِ فضلِ گل روتا رہے
تو یونہی آغوشِ رحمت میں سدا سوتا رہے

لہ شائع شدہ ماہنامہ ضیائے حرم، نومبر ۱۹۷۷ء

علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

چراغ حسن حسرتؒ

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنش کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سینما ہے، سینما سے ادھر ایک مکان چھوڑ کے ایک پرانی کوٹھی ہے، جہاں آجکل آنکھوں یا دانتوں کا کوئی ڈاکٹر رہتا ہے[۲] کسی زمانے میں علامہ اقبال یہیں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہیں پہلی مرتبہ اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب بھی میں اس طرف سے گذرتا ہوں تو اس کوٹھی کے قریب پہنچ کر قدم رُکتے معلوم ہوتے ہیں اور نظریں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

کوٹھی اچھی خاصی تھی، صحن بھی خاصا کشادہ، ایک طرف شاگرد پیشہ کے لیے دو تین کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں علاّمہ اقبال کے نوکر چاکر علی بخش رحمٰن، دیوان علی وغیرہ رہتے تھے۔ لیکن کوٹھی کی دیواریں سیلی ہوئی، پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا، چھتیں ٹوٹی پھوٹی، منڈیر کی اینٹیں اپنی جگہ سے اس طرح سرکی ہوئی تھیں کہ ہر وقت منڈیر کے زمین پر آرہنے کا اندیشہ تھا۔ میر کا مکان نہ سہی، بہرحال غالب کے بلّی ماراں والے مکان سے ملتا جلتا نقشہ ضرور تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی، چارپائی پر اُجلی چادر، اس پر علامہ اقبال ململ کا کُرتہ پہنے تہبند باندھے تکیہ سے ٹیک لگائے حُقّہ پی رہے تھے۔ سُرخ و سپید رنگت، بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید، داڑھی گھٹی ہوئی۔ چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں، اُن پر دو تین آدمی بیٹھے تھے، دو تین اُٹھ کے جا رہے تھے۔

سالک صاحب[۳۵] میرے ساتھ تھے، علامہ اقبالؒ نے پہلے اُن کی مزاج پُرسی کی پھر میری طرف توجہ فرمائی۔

ان دنوں نمک کی ستیاگرہ زوروں پر تھی، ڈانڈی کے مارچ کے چرچے جگہ جگہ ہو رہے تھے، لاہور میں روز جلوس نکلتے، جلسے ہوتے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگتے تھے۔ میں نے پہلے کبھی کھدر کا لباس نہیں پہنا تھا مگر یہ تو کھدر کا خاص موسم تھا، کچھ رواج عام کا اثر، کچھ کفایت کا خیال، میں نے بھی یہی لباس پہننا شروع کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا ذہن میرے کھدر کے لباس سے چرخے، چرخے سے گاندھی اور گاندھی سے کانگریس کی جانب منتقل ہو گیا، کیونکہ اس رسمی تعارف کے بعد انہوں نے جو گفتگو شروع کی اُس کی لپیٹ میں گاندھی، کانگریس اور اہنسا سب کے سب آ گئے تھے۔

موضوع روکھا پھیکا تھا مگر بیچ بیچ میں لطیفے بھی ہوتے جاتے تھے، میں تو ہُوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا مگر سالک صاحب کب رُکتے تھے، جہاں موقع ملتا تھا کوئی لطیفہ، کوئی چٹکلہ، کوئی پھبتی ضرور کہہ دیتے تھے۔ ہم جب گئے تھے تو سورج چھپنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا، مگر اُٹھے تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ مجھے لاہور آئے ہوئے سوا سال سے اوپر ہو چکا تھا لیکن زیادہ لوگوں سے ربط نہیں تھا، یا تنہا گھر میں بیٹھا ہوں یا سالک صاحب کے ہاں، ہفتہ میں ایک دو مرتبہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتیؒ کے ہاں بھی چلا جاتا تھا، لیکن اب جو علامہ اقبال کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا تو ایک اور ٹھکانا ہاتھ آ گیا، کچھ دنوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ اوّل تو دوسرے تیسرے ورنہ ساتویں آٹھویں روز اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا، کبھی کسی دوست کے ساتھ کبھی اکیلا۔ مگر جب جاتا تو گھنٹہ دو گھنٹہ ضرور بیٹھتا تھا، کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارہ بجے تک برابر محفل جمی ہے، لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ادب، شاعری، سیاست، مذہب پر بحثیں ہو رہی ہیں، لیکن ان محفلوں میں سب سے زیادہ علامہ اقبال باتیں کرتے تھے، دوسرے لوگوں کی حیثیت زیادہ تر "سامعین" کی ہوتی تھی۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقعہ نہیں دیتے تھے یا بات کاٹ کے بولنا شروع کر دیتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

ہر مسئلہ کے متعلق اُن کی معلومات دوسروں سے زیادہ ہوتی تھیں اور اہلِ محفل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چند جملے کہہ کے چپکے ہو رہیں۔

ان کے مکان کے دروازے غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ، سب پر کھلے تھے، نہ کوئی حاجب نہ دربان، نہ ملاقات کے لیے کارڈ بھجوانے کی ضرورت، نہ تعارف کے لیے کسی واسطہ کی حاجت، جو آتا ہے کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا ہے۔ اور یا تو خود اپنا تعارف کرا دیتا ہے یا چپ چاپ بیٹھا باتیں سنتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے رُکتے ہیں تو اُس کی طرف توجہ فرماتے ہیں، اور پوچھتے ہیں "فرمایئے کہاں سے آنا ہوا؟" وہ اپنا نام بتاتا ہے، کوئی حاجت ہوتی ہے تو بیان کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے کہ ایک شخص جس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور کچھ بدحواس معلوم ہوتا تھا، آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ علامہ اقبال کچھ دیر کے بعد اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "فرمایئے کہاں سے تشریف لائے؟" وہ کہنے لگا "یوں ہی آپ سے ملنے چلا آیا تھا۔" خدا جانے علامہ اقبال نے اس کے چہرے سے معلوم کر لیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا یا کوئی اور بات تھی۔ بہرحال انہوں نے پوچھا "کھانا کھائیے گا؟" اُس نے جواب دیا "جی ہاں کھلا دیجئے"، علامہ اقبال نے علی بخش کو بُلا کے کہا "انہیں دوسرے کمرے میں لے جا کے کھانا کھلا دو۔" یہ سن کر وہ کہنے لگا "میں کھانا یہیں کھاؤں گا۔" غرض علی بخش نے وہیں دسترخوان بچھا کے اُسے کھانا کھلایا، وہ کھانا کھا کے بھی نہ اُٹھا اور وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات ابھی خاصی جا چکی تھی، اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کے گھر چلا آیا، دُوسرے دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ کیوں ڈاکٹر صاحب! رات جو شخص آیا تھا اُس کا کیا ہوا؟ کہنے لگے "تمہارے جانے کے بعد میں نے اُس سے کہا کہ اب سو جائیے، لیکن وہ کہنے لگا، کہ آپ کے کمرے میں ہی پڑا رہوں گا۔ چنانچہ علی بخش نے میرے کمرے کے دروازہ کے ساتھ لگے

چارپائی بچھادی، صبح سویرے اٹھ کر وہ کہیں چلا گیا۔"

اُن سے جو لوگ ملنے آتے تھے اُن میں کچھ تو روز کے آنے والے تھے، کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہیں عمر بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ اُن سے ملنے کا موقع ملا، پھر بھی اُن کے ہاں ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا۔ جب جاؤ دو تین آدمی بیٹھے ہیں، کوئی سفارش کرانے آیا ہے، کوئی کسی شعر کے معنی پوچھ رہا ہے، کسی نے آتے ہی سیاسیات کے متعلق بحث چھیڑ دی ہے، اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے۔

اکثر لوگ جو باہر کے کسی شہر سے لاہور کی سیر کرنے آتے تھے، اُن کی کوٹھی پر حاضر ہونا واجبات میں سے سمجھتے تھے، کیونکہ لاہور آ کے ڈاکٹر اقبال کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا؟ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا دیکھ کر اُن سے علاج کرانے آجاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص اُن سے دانت نکلوانے چلا آیا تھا، جب اُسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اقبال علاج کرنا نہیں جانتے، تو وہ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کیسے ڈاکٹر ہیں جنہیں دانت نکالنا بھی نہیں آتا۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں علامہ اقبال سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق عمر بھر رہا، مگر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو اُن کی طبیعت کا حال معلوم نہیں تھا، وہ ان کی عظمت کے ذکر اذکار سن کر اور ان کے نام کے ساتھ سر جیسا پُر رعب خطاب دیکھ کر دل میں سمجھتے تھے کہ اُن کے حضور میں ہم ایسے غریب لوگوں کی رسائی کہاں؟

میرے ایک عزیز دوست جو علامہ اقبال کے سچے عقیدتمند ہیں، اُن کی وفات سے کوئی دو مہینے بعد مجھ سے ملنے آئے، اور جب تک بیٹھے رہے انہیں کا ذکر کرتے رہے جب انہیں میری زبانی معلوم ہوا کہ علامہ اقبال سے ہر شخص مل سکتا تھا، تو انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ مجھے کئی سال سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی مگر حوصلہ نہیں پڑتا تھا، جی میں سوچتا

تھا کہ کسی تقریب کے بغیر کیسے ملوں! کیا عجب ہے کہ وہ ملنے سے انکار ہی کر دیں، کئی دفعہ اس شوق میں ان کی کوٹھی تک گیا، مگر اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی، اس لیے باہر سے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ آیا۔"

علامہ اقبال بہت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے، گھر میں تو وہ ہمیشہ تہبند اور کرتے میں نظر آتے تھے، البتہ باہر نکلتے تو کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے، کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے، یعنی کبھی مشہدی لنگی کے ساتھ فراک کوٹ اور شلوار، کبھی سپید ململ کی پگڑی، وہ شروانی اور چست گھٹنا بھی پہنتے رہے ہیں مگر بہت کم۔ میں نے اس لباس میں انہیں دیکھا تو نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ شروانی اور چست گھٹنا اُن کے جسم پر بہت کھلتا ہو گا۔

وہ کھانا کم کھاتے تھے، مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے، مدت سے اُن کا یہ دستور تھا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے، صرف نمکین کشمیری چائے پر اکتفا کرتے تھے دسترخوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے، پلاؤ اور کباب انہیں بہت مرغوب تھے، شبدیگ بھی بہت پسند تھی، جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ سے شبدیگ پکواتے اور خشکہ کے ساتھ کھاتے تھے، پھلوں میں صرف آموں سے رغبت تھی، آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے، خود کھاتے، احباب کو کھلاتے، لطیفے کہتے، آپ ہنستے دوسروں کو ہنساتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں اُن کا معمول یہ تھا کہ صبح اُٹھ کے نماز پڑھتے، قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے، پھر ورزش کرنا شروع کر دیتے، ڈنڈ پیلتے، مگدر ہلاتے، اور جب سارا جسم عرق عرق ہو جاتا تو مگدر ہاتھ سے چھوٹتا۔ سن زیادہ ہو گیا تو ورزش چھوٹ گئی، البتہ قرآنِ کریم کی تلاوت آخر تک جاری رہی۔

عام طور پر پنجابی بولتے تھے، کبھی کبھی اثنائے گفتگو میں انگریزی بولنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ یو۔پی کے جو شاعر اور ادیب اُن سے ملنے آتے تھے انہیں علامہ اقبال

کے ڈیل ڈول، لب ولہجہ اور گفتگو کے انداز پر حیرت ہوتی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کے ذہن میں شاعر کا تصور یہ ہے کہ تیکھے تیکھے نقش، جسم دھان پان بلکہ بالکل مشتِ استخواں کلے میں گلوری جس کی پیک بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچی ہے، سر پر پٹے اور ان پر دو پلڑی ٹوپی، بات بات پر تسلیمات بجالاتا اور دُہرا ہُوا جاتا ہے۔ بغل میں کاغذوں کا پلندہ، جس میں کچھ ادھوری، کچھ پوری غزلیں، مخاطب کے مذاق اور خیالات کا لحاظ نہیں کرتا جو ملنے آتا ہے اُسے اپنا کلام سُنانا شروع کر دیتا ہے، اور اس وقت تک خاموش نہیں ہوتا جب تک سننے والا اکتا نہیں جاتا۔

مجھ سے یو۔پی کے ایک شاعر نے جو علامہ اقبال سے مل چکا تھا، استعجاب کے انداز میں کہا: "جی صاحب! ڈاکٹر اقبال اپنے لب ولہجہ اور ڈیل ڈول سے بالکل پنجابی معلوم ہوتے ہیں"۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک اچھے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لب ولہجہ اور ڈیل ڈول سے پنجابی معلوم نہ ہو۔

ایک دفعہ یو۔پی کے ایک شاعر صاحب آئے اور تھوڑی دیر کے بعد علامہ اقبال سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ انہوں نے ٹالنا چاہا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یو۔پی کا شاعر سُننے اور سُنانے کے معاملہ میں ہمیشہ "بے پناہ" ہوتا ہے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کے انکار کو شاعرانہ انکسار سمجھا اور برابر تقاضا جاری رکھا، جب بول کام نہ نکلا تو اپنی ایک غزل سُنانی شروع کر دی۔ علامہ اقبال کچھ دیر تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے، لیکن جب دیکھا کہ مُدعی سامعہ خراشی پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ داد کا بھی طالب ہے، تو ان سے فیصلہ نہ ہو سکا۔ صاف کہہ دینا اس فیصلے کو جانے دیجیے میں شعر سُننے سُنانے کا قائل نہیں۔ وہ تھوڑی دیر چپکے بیٹھے رہے پھر اُٹھ کے چلے گئے۔ مگر اُن کے تیوروں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے نکلتے ہی خودکشی کر لیں گے، اور اس معاملہ میں وہ حق بجانب بھی تھے، انہیں یقیناً عمر بھر میں کبھی اس قسم کے شاعر سے سابقہ نہیں پڑا ہوگا، جی میں کہتے ہوں گے کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو نہ شعر سنتے ہیں نہ سُناتے ہیں نہ داد لینے کا شوق ہے نہ داد

دینے کا سلیقہ۔

علامہ اقبال جوانی میں کبھی کبھار مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ انہیں اس قسم کے اجتماعات سے نفرت سی ہو گئی۔ ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا تو فرمایا اردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا، میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگے "مشاعروں میں بُرے بھلے سب شریک ہوتے ہیں، اور داد کو شعر کے حسن و قبح کا معیار سمجھا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنا لیا"۔ میں نے عرض کیا "ان مشاعروں نے تو اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے"۔ فرمایا "ہاں زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا"۔

مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی، خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی وہ لطیفوں اور پھبتیوں سے ایسا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ جی چاہتا تھا بہروں بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہیں۔ یوں تو ہر روز دو تین لطیفے ہو جایا کرتے تھے لیکن جو پھبتیاں انہوں نے سر شہاب الدین کے متعلق کہی ہیں انہیں تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دیکھ کر علامہ اقبال کو لطیفوں اور پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سر شہاب الدین کی رنگت سیاہ ہے، ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لے آئے، علامہ اقبال نے انہیں دیکھا تو ہنس کے فرمایا "چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے"۔

چودھری صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ لباس کے انتخاب کا معاملہ نظر ثانی کا محتاج ہے، سیاہ رنگت پر سیاہ سوٹ واقعی بھلا معلوم نہیں ہوتا، لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ کوٹ کا کالر کہاں ہے؟ اور ٹھوڑی کہاں؟ یہ سوچ کے سیاہ سوٹ کے بجائے سپید سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ سپید پتلون، سپید کوٹ، سپید قمیص، سپید پگڑی، چونکہ وہ خود بھی پنجابی کے شاعر ہیں، اس لیے سپید سوٹ زیب تن کر کے سمجھ لیا کہ اب حریف کے لیے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ سپید لباس میں سیاہ چہرہ اسی طرح معلوم ہو گا جس طرح گورے گالوں پر سیاہ تل۔

اور خال رُخِ یار کی تعریف میں تو دیوانوں کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ علامہ اقبال نے انہیں دیکھا تو سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ چودھری صاحب نے جھنجھلا کے کہا "آپ ہنستے کیوں ہیں"؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں ارنا بھینسا"۔ ایک مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا تو مرحوم نے اُن بزرگ ہوئے سگریٹ کی پھبتی کہی۔

ایک مرتبہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ چودھری شہاب الدین کا ذکر چھڑ گیا، کہنے لگے "میں نے عالمِ مثال میں ایک بڑھیا دیکھی جو اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی، میں نے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی "میں طاعون ہوں"۔ میں نے کہا "تو بھاگ کے کہاں جا رہی ہے"؟ کہنے لگی میں شہر کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن وہاں شہاب الدین پہلے ہی موجود ہے، میری کیا ضرورت رہ گئی"!

ایک دن سر شہاب الدین سے کہنے لگے "چوہدری صاحب آپ سچے مسلمان ہیں"! چودھری صاحب نے پوچھا "آپ کو کیونکر معلوم ہوا"؟ کہنے لگے "مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، اور بحمداللہ کہ آپ کا ظاہر و باطن یکساں ہے"!

جن دنوں ابھی چودھری شہاب الدین نہ سر تھے، نہ کونسل کے صدر، بلکہ صرف لاہور میونسپلٹی کی صدارت فرماتے تھے اور نرے چودھری جی کہلاتے تھے۔ مہتر صاحب چترال لاہور تشریف لائے اور یہاں کے معززین نے اُن کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی۔ چونکہ علامہ اقبال کے سوا مہتر صاحب سے کسی کی شناسائی نہیں تھی، اس لیے مہمان سے میزبانوں کا تعارف کرانے کی خدمت انہیں کے سپرد ہوئی۔ چودھری شہاب الدین کی باری آئی تو علامہ مرحوم نے فرمایا — اعلیحضرت مہتر چترال ۔۔۔۔ چودھری شہاب الدین۔

اتنا کہہ کے بڑی متانت سے فرمایا "ایں ہم مہتر لاہور است"۔ اور اس ایک فقرہ میں چودھری صاحب کی تمام صوری اور معنوی جسمیتیں، اُن کا طول و عرض اور عمق یعنی

پورے ابعاد ثلثہ آگئے۔

اس قسم کے لطیفے جو صرف چودھری سر شہاب الدین سے متعلق ہیں ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں ضرور ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا اور چودھری صاحب بتاتے نہیں۔ دوسرے لوگوں کو جو لطیفے یاد رہ گئے ہیں اُن میں سے بعض حاضر ہیں، کچھ اور بھی ہیں، لیکن انہیں اس لیے نہیں لکھتا کہ میں تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دیوانی دونوں سے بہت ڈرتا ہوں، تعزیراتِ ہند تو خیر کچھ زیادہ ڈرنے کی چیز نہیں لیکن ضابطہ دیوانی کی زد میں آنے کے لیے ذرا جیب میں "زور" ہونا چاہیئے۔ آپ کو ممکن ہے اس موقع پر غالب یاد آجائے اور آپ فرمائیں کہ ؎

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

لیکن میں عرض کروں گا کہ یوں ہی سہی، بلا سے ڈگری اور قرقی کا خطرہ تو نہیں ؎

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اُن سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے تھے اور وہ سب کی باتیں غور سے سُنتے اور اُن کا جواب دیتے تھے، دوسرے تیسرے (روز) کالجوں کے کچھ طلباء بھی آجاتے تھے، اُن میں سے کوئی اُن کے اشعار کے معنی پوچھتا تھا، کوئی مذہب کے متعلق سوالات کرتا تھا، کوئی فلسفہ کی بحث لے بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالبعلم اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہے، پوڈر اور سُرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ابروؤں کو خم دینے، زلفوں میں بل ڈالنے، ہونٹوں کو سُرخی کے استعمال سے "لعلین" بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جارہا ہے، ایک تو یہ چاروں پانچوں گل چہرہ اور نازک اندام، اس پر بناؤ سنگھار کا خاص اہتمام، انہوں نے آتے ہی پردہ کی بحث چھیڑ دی، اور ایک نوجوان کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب اب مسلمانوں کو پردہ اُٹھا دینا چاہیئے"!

ڈاکٹر صاحب مسکرا کے بولے "آپ عورتوں کو پردہ سے نکالنا چاہتے ہیں، اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردہ میں بٹھا دیا جائے"!

علی بخش اُن کا پرانا نوکر ہے اور کوئی چالیس سال تک برابر اُن کے ساتھ رہا ہے، ملازمت اختیار کی تو مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، اب داڑھی مونچھیں سپید ہو چکی ہیں، داڑھی تو خیر منڈا دی اور پردہ ڈھک گیا، مونچھوں کو خضاب کیا مگر چند دنوں میں خضاب اُڑ گیا اور مونچھوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ انتقال سے ایک دو مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اردگرد کچھ بے تکلف احباب بیٹھے تھے۔ علی بخش پاس کھڑا تھا کہ اس کی مونچھوں کی رنگت کا ذکر چھڑ گیا، ایک صاحب کہنے لگے "یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے"؟ دوسرے بولے خاکستری؟ ایک اور صاحب نے کہا خاکستری نہیں، اگرنی۔ ڈاکٹر صاحب بھی سن رہے تھے، مسکرا کے بولے "نہ اگرنی نہ خاکستری، مچھی کہو مچھی"!

علامہ اقبال کے ملنے والوں میں دو شخص بہت دلچسپ تھے، مولانا گرامی[۵۸] اور عبداللہ چغتائی[۵۹]۔ گرامی ہوشیار پور کے رہنے والے اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، لیکن ان کی صورت شکل، چہرے مہرے سے قطعاً ذہانت کے آثار نظر نہیں آتے تھے، سر پر بڑا پگڑ، جس کے پیچ کھلے ہوئے، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، ہاتھ میں ڈنڈا۔ علامہ اقبال سے انہیں سچی محبت تھی، لاہور آتے تھے تو مہینوں انہیں کے ہاں رہتے تھے، کبھی وہ دیر تک نہ آتے تھے تو علامہ اقبال انہیں خود بلوا بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ گرامی جالندھر آئے ہوئے ہیں، حضرت مرحوم نے علی بخش کو جالندھر بھیجا کہ گرامی کو لے آؤ۔ گرامی نے اُسے دیکھ کے کہا "ارے علی بخش تم کہاں"؟ کہنے لگا "آپ کو لینے آیا ہوں"۔ ارشاد ہوا "میں تو خود لاہور چلنے کی تیاری کر رہا ہوں، ارے کوئی ہے تانگہ لاؤ ہم اسٹیشن تک جائیں گے، اچھا سا تانگہ ہو، لاہور جا رہے ہیں، لاہور وقت پر اسٹیشن پہنچ جائے"!

تانگہ والا آیا اور تانگہ والے نے اُسے دھوپ میں کھڑا کر دیا، تھوڑی دیر میں مولانا گرامی گھر سے نکلے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے، لیکن لمحہ بھر بیٹھ کے اُتر گئے اور علی بخش سے کہنے لگے "تم لاہور چلے جاؤ میں نہیں جاتا"، اُس نے پوچھا "وہ کیوں؟" کہنے لگے "تانگہ گرم ہو گیا، ڈاکٹر کو میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا اس لیے نہیں آئے، اگلے مہینے آئیں گے، اگلے مہینے، ہاں یہ ضرور کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا"۔

گرامی کے لطیفے تو بے شمار ہیں لیکن اس خیال سے نہیں لکھتا کہ یہ مضمون کہیں "لطائفِ گرامی" بن کے نہ رہ جائے۔ عبداللہ چغتائی، گرامی کو نہیں پہنچتے، البتہ وہ بھی اپنے انداز کے ایک ہی بزرگوار ہیں، جتنا تیز بولتے ہیں اُتنا ہی تیز چلتے ہیں اور لکھنے میں بولنے اور چلنے دونوں سے تیز، آدھا فقرہ ذہن میں ہے آدھا کاغذ پر، یہی وجہ ہے کہ اُن کی نثر غالب اور بیدل کی نظم سے زیادہ مشکل ہوتی ہے، ڈاکٹر اقبال انہیں چھیڑ چھیڑ کے اُن کی باتیں سنتے اور لطف اُٹھاتے تھے۔

مرحوم زندگی کے بعض معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے، وہ گھر کا سارا حساب کتاب باقاعدہ رکھتے تھے، اور ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص اُن سے کوئی سند یا کسی تصنیف پر اُن کی رائے لینے آتا تھا، تو کہتے تھے خود لکھ لاؤ میں دستخط کر دوں گا، اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے بلکہ جو کچھ کوئی لکھ لاتا تھا اُس پر دستخط کر دیتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی، ایک ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے، پلنگ کے پاس ایک تپائی پر پنسل اور کاغذ پڑا رہتا تھا، جب شعر گوئی پر طبیعت مائل ہوتی تھی لکھنا شروع کر دیتے تھے، کبھی خود لکھتے تھے کبھی کسی کو لکھوا دیتے تھے۔ عشقِ رسولؐ نے اُن کے دل کو گداز کر رکھا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے وقت اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں، اور قرآن پڑھتے پڑھتے بے اختیار رو پڑتے تھے۔ غرض اُن کی شخصیت

بیحد دلآویز تھی، جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے اور اُن سے ملے نہیں وہ اقبال کے اعلیٰ کمالات سے بے خبر ہیں۔

موت سے کوئی ڈھائی سال پہلے وہ میو روڈ پر اپنی نو تعمیر کوٹھی میں اٹھ گئے وہاں گئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ اُن کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا[۱۰]، انہیں اس واقعہ کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس حالت میں انہیں دیکھا کہ مرحومہ کی قبر کھودی جا رہی ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پاس ہی بیٹھے ہیں، اُس وقت وہ بہت بوڑھے معلوم ہو رہے تھے، کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد۔ اس واقعہ کے بعد اُن کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا اور شاہی مسجد کے باہر دفن ہوئے[۱۱]

حواشی

۱۔ چراغ حسن حسرت کاشمیری ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے۔ سندباد جہازی کے قلمی نام سے بھی مشہور ہیں، امروز اخبار میں "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے تھے۔

۲۔ رتن سینما (میکلوڈ روڈ) کے قریب اس کوٹھی میں جہاں علامہ ۱۹۳۵ء تک قیام پذیر رہے آجکل عارضی طور پر اقبال اکادمی کا دفتر ہے۔

۳۔ عبدالمجید سالک (پیدائش ۱۳ دسمبر ۱۸۹۳ء وفات ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء) "ذکر اقبال" ان کی مشہور تصنیف ہے۔

۴۔ حکیم فقیر محمد چشتی — علامہ کے مشہور دوست تھے جن سے علامہ کی صحبتیں رہتی تھیں۔

۵۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر — ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا۔ مقالاتِ تاثیر کے نام سے حال ہی میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

۶۔ چوہدری شہاب الدین — لاہور کے مشہور ایڈوکیٹ — علامہ کے بیشمار لطیفے ان سے منسوب ہیں۔

۷ مہتر چترال .... محمد ناصر الملک چترالی علامہ کے دوست تھے، "صحیفۃ التکوین" نامی کتاب کے مصنف تھے، اس کتاب کا موضوع تخلیقِ کائنات اور اس کا ارتقاء ہے۔

۸ مولانا گرامی .... غلام قادر گرامی ۱۸۹۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے، فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۹ عبداللہ چغتائی .... مرقع چغتائی کے مصنف عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی اور مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ۔

۱۰ اشارہ جاوید اقبال کی والدہ سردار بیگم کی طرف ہے جن کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۴۵ء کو ہوا۔

۱۱ ماخوذ از مردم دیدہ از چراغ حسن حسرت

پسِ تحریر

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اُن دنوں وہ میکلوڈ روڈ پر قیام پذیر تھے، گرمیوں کے دن تھے، شام کا وقت تھا، کوٹھی کے صحن میں وہ ململ کا کرتہ پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے، سامنے کرسیاں بچھی تھیں، جو آتا کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا۔ اہلِ محفل میں ہر قسم کے لوگ تھے، شاعر، ادیب، اخبار نویس، مدرس، کلرک، پہلوان، گفتگو سیاسیات سے شروع ہوئی اور پھبتیوں پر ختم ہوئی، علامہ اقبال کا حصہ سب سے زیادہ تھا، انہوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کئے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی اور کبھی کبھی طبیعت لہراتی تو پھبتیوں پر پھبتیاں کستے.... ایک صاحب جو علامہ کے خاص نیاز مندوں میں تھے سب سے زیادہ نظرِ عنایت تھی، سب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کسی جاتیں۔ ایک دفعہ اُن کے بعض اقرباء نے ان سے کہا "تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں سمجھتے

ہو لیکن اُن کے ہاں جو تمہاری حیثیت ہے وہ ہمیں معلوم ہو گئی ہے"۔ یہ طعنہ سُننے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے، علامہ اقبال کو معلوم ہوا تو انہیں منانے کے لیے اُن کے گھر جانے کا ارادہ کیا، اُنہیں جب خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے منانے کے لیے میرے ہاں آنا چاہتے ہیں تو وہ بے تاب ہو کر خود علامہ کے ہاں پہنچے۔ علامہ اقبال نے پہلے تو ان سے معافی مانگی اور کہا کہ افسوس میری زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس پر آپ مجھ سے ناراض ہو گئے، پھر ایک آدھ پھبتی ایسی کہہ دی کہ وہ بے اختیار ہنس دیئے۔

علامہ کے پُرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریق سے ناواقف تھا، ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہہ دیا جاؤ بازار سے تباشوں کا مُربّہ لے آؤ، سارے شہر میں پھرا لیکن تباشوں کا مربّہ کہاں سے ملتا، دوکاندار علی بخش سے مذاق کرتا رہا۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ منادی میں لکھا میں ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا شاعرِ اعظم نہیں سمجھتا۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پاس فاسفورس کا تیل بھیجا، ڈاکٹر صاحب کے گھٹنے میں درد تھا وہ کم ہو گیا، انہوں نے خواجہ صاحب کو لکھا "آپ نے جو تیل بھیجا تھا میں نے اُسے استعمال کیا اور مفید پایا"۔ دوسرے دن منادی میں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط چھپ گیا، اس کے ساتھ جلی حروف میں چار کالمی عنوان تھا:۔

"فاسفورس کے تیل کے متعلق ہندوستان کے شاعرِ اعظم کی رائے"

ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی، لیکن میں نے منادی کے یہ دونوں پرچے انہیں دکھائے تو ہنس کے کہنے لگے، خواجہ صاحب بھی سچے! اس فاسفورس کا تیل استعمال کرنے سے پہلے میں کچھ نہیں تھا اس تیل نے مجھے شاعرِ اعظم بنا دیا۔

ایک مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک علامہ اقبال کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے

اثنائے گفتگو میں کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں "علامہ اقبال کے جانور" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ڈالوں۔" علامہ مرحوم نے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ سالک صاحب کہنے لگے "آپ نے اپنے کلام میں جا بجا مختلف جانوروں کا ذکر کیا ہے، میں ایک مضمون لکھ ڈالنا چاہتا ہوں، جس میں ان سب کا ذکر آجائے گا۔" علامہ نے فرمایا "بہت اچھا خیال ہے۔"

حرف و حکایت از چراغ حسن حسرت : امروز: ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۰ء
۲۲ر اپریل ۱۹۴۹ء

علامہ اقبال بڑے شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بزرگ تھے، کبھی کبھی خوش طبعی کی طرف جھک پڑتے تو مسلسل پھبتیاں کہتے چلے جاتے تھے۔ اُن کے نیاز مندوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہیں انہوں نے مایۂ تفریح بنا رکھا تھا۔ ان میں ایک صاحب ایسے تھے جنہوں نے مجددیت اور مہدویت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ وہ لاہور آئے تو سب سے پہلے علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اُن کے پاس اپنے دعوے کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ میں کانگڑہ کے زلزلہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں، اور قرآن میں اس زلزلہ کا ذکر آیا ہے اور اسے قربِ قیامت کی علامت قرار دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اُن کی یہ دلیل سُنی تو بہت لطف اندوز ہوئے اور کہنے لگے.... پھر تو آپ "ابنِ زلزلہ" ہوئے، اور یہ ظاہر ہے کہ مہدویت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

(سندباد جہازی: امروز، حرف و حکایت ۲۲ر اپریل ۱۹۵۰ء)

اقبالؒ

۱۸۷۳ء ——— ۱۹۳۸ء

عبدالماجد دریاآبادیؒ

اقبالؒ سے واقفیت اُس وقت ہوئی جب میں اسکول کے کسی نیچے درجہ میں پڑھتا تھا غالباً سنہ ۱۹۰۳ء میں، اور اقبالؒ اُس وقت تک سندِ ڈاکٹریٹ سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، لیکن فلسفہ میں شہرت پائے ہوئے تھے، شہرت ان کے نام کو اس وقت بھی اچھی بھلی شاعری میں حاصل ہو چکی تھی اور مولانا حسرت موہانی کے ماہنامہ "اُردوئے معلّٰی" میں ان کی غزلوں پر کبھی کبھی تنقید چھپا کرتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر زبان کے اعتبار و معیار سے، بچپن کا زمانہ بھی کسی درجہ جہالت و نادانی کا ہوتا ہے، وہ تنقیدیں بڑے شوق سے پڑھ کر یاد کر لیتا تھا اور نادانفوں کے سامنے بڑے فخر و پندار سے انہیں اپنی جانب منسوب کر کے اقبالؒ پر اعتراض کیا کرتا تھا، گویا میں اتنا بڑا نقاد و سخن فہم ہوں کہ اقبالؒ تک کو خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی دھجیاں اڑا دیتا ہوں۔

جب سن اور آیا، اُردو شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت تمیز آچلی (وہ بھی زیادہ تر مولانا شبلی اور حضرت اکبر الہ آبادی کے فیضِ صحبت سے) تو اپنی اس طفلانہ عادت پر خود بڑی نفرین کی اور اقبالؒ کا کلام بڑے لطف و عقیدت سے پڑھنے لگا خصوصاً ان کی فارسی مثنویاں "اسرارِ خودی" "رموزِ بے خودی"۔ "اودھ پنچ" (لکھنؤ) میں اب بھی ان پر سخت گردہ گیریاں چھپتی رہیں، لیکن اب انہیں خرافات کے درجہ میں سمجھنے لگا۔ اقبالؒ کا ملّی ترانہ اب گراموفون میں بھر لیا گیا تھا، اور بعض خوش آوازوں کے گلے سے اس کے سُننے کا اتفاق ہونے لگا تھا۔ محمد علیؒ ان نظموں سے بڑے ہی متاثر تھے اور ان کے تاثر سے حلقہ میں بے علم و بے ذوق بھی پُورا لینے لگا تھا "ضربِ کلیم" "پیامِ مشرق" "بالِ جبریل" "جاوید نامہ" ایک کے بعد دوسری شائع ہوتی رہیں، ایک ایک چیز شوق سے منگا کر بڑی بے قراری سے پڑھی، بعض پر خوب رویا بھی اور بعض پر دل کٹ کر رہ گیا۔

فارسی کلام میں مولانا رُومؒ کی مثنوی میرے لیے ایک شمع ہدایت تھی، اس سے کچھ ایسا کم مرتبہ اقبالؒ کی بھی مثنویوں و نظموں کا نہ رہا۔ ایک دور میرے اوپر کئی سال کا قوالی اور سماع کا بھی رہا۔ کلامِ اقبالؒ کے اچھے خاصے ٹکڑے اپنے قوال کو بھی یاد کروا دیئے تھے اور جب جی چاہتا اپنے قوال سے اُن کو سُنا کرتا۔

ملاقات ایک بار لکھنؤ میں تو ۱۹۱۲ء میں بالکل سرسری، اقبال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں آئے تھے، میں اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے نہ کچھ آگے بڑھ سکا نہ کچھ زیادہ استفادہ کر سکا، پھر شاید ۱۹۳۰ء میں اُن سے ملاقات حیدرآباد میں ہوئی، وہ مدراس سے اپنے انگریزی لیکچر دے کر واپس ہو رہے تھے، اور میرا جانا حُسنِ اتفاق سے اُس وقت حیدرآباد کا ہو گیا، ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں اور اس کے بعد مراسلت کا سلسلہ اُن کی وفات کے وقت تک جاری رہا۔

حضرتِ اکبرؒ کو علّامہ اقبالؒ نے اپنے خط میں (میرے نشۂ فلسفیّت کے زمانہ میں لکھا کہ "آپ کے ماجد صاحب تو برگسان کی جیب میں رہتے ہیں"۔ حضرتِ اکبرؒ نے جواب دیا کہ "انشاء اللہ وقت آئے گا جب برگسان ماجد صاحب کی جیب میں رہا کرے گا"۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں بزرگوں کے مرتبے بڑھائے، کیسا کیسا اپنے چھوٹوں کو بڑھاتے تھے۔

اقبالؒ دینی اور اسلامی شاعر شروع ہی سے تھے، سن کے ساتھ ساتھ یہ رنگ پُختہ سے پختہ تر اور شوخ سے شوخ تر ہوتا گیا، بعض نظمیں تو سو فیصدی سوزِ جگر کی ترجمان ہیں البتہ اقبالؒ کی نثر خصوصاً انگریزی نثر میں جہاں انہوں نے جدید فلسفہ کی شرح و ترجمانی کی ہے وہ اسلامی رنگ سے بار بار ہٹ ہٹ گئے ہیں ـــــ اقبالؒ میں رندی شروع میں پائی جاتی تھی، رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی گئی اور وہ توبہ و انابت کے خوگر ہوتے گئے۔ پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھے لیکن طبیعت و مزاج کے لحاظ سے اس کام سے کچھ زیادہ اہل نہ تھے۔

محمد علی، یہ بھی ولایت پلٹ ہو کر ٹھیٹھ مسلمان بنے رہے اور وفاقِ اسلامی کے قیام کے داعی۔

محمد علی کے بعد شاید سب سے بڑے یہی تھے، وطنیت و وطن پرستی کے دورِ مذمت میں ان کی متعدد نظمیں یادگار بن گئی ہیں۔ قیامِ پاکستان ایک بڑی حد تک انہیں کی تخلیقِ فکری کا نتیجہ تھا، مصطفیٰ کمال اتاترک کے قطعِ منصبِ خلافت کو انہوں نے محمد علی ہی کی طرح کبھی معاف نہیں کیا تھا۔[۲]

◉

حواشی

[۱] محمد علی جوہر [۱۸۷۸ء — ۱۹۳۱ء]

[۲] مشمولہ "اقبالیاتِ ماجد" اقبال اکیڈیمی حیدر آباد ص ۹۷۸

وہ انتہا درجے کے سخن فطرت تھے اور خدا تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ ترین نائگی اور معاشرتی نیکیاں ودیعت فرما رکھی تھیں۔ وہ ایک محبت کرنے والے بیٹے، محبت کرنے والے باپ، محبت کرنے والے شوہر، ایک ذہین وکیل اور حساس ادراک رکھنے والے سیاست دان تھے۔ وہ بیرسٹری اور سیاسی کانفرنسوں پر یکساں طور خوب چمکتے رہے۔

(سر محمد شفیع : سول ملٹری گزٹ: لاہور: ۹ جنوری ۱۹۳۲ء)

اقبالؒ

محمد علی علویہ پاشا

علامہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس سال قبل بیت المقدس میں ہوئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہم دونوں موتمر اسلامی میں نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ یہ موتمر فلسطین کی حفاظت اور دفاع کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ مرحوم کے نام نامی سے میں پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ کیونکہ عربی ممالک میں اقبال ایک فلسفی شاعر اور مفکر اسلام کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے، ڈاکٹر اقبال کے متعلق میری معلومات بس اسی قدر تھیں۔ کیونکہ مرحوم کی شاعری کو جو کہ ان کے افکار خیالات، حکمت و موعظت کی آئینہ دار ہے اور اردو یا فارسی زبان کے قالب میں تھی، سمجھنے سے قاصر تھا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے اور ان کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے وہ معلومات کافی نہ تھیں جو عرب ممالک کے علم دوست حضرات تک پہنچتی تھیں۔ ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و حکمت کے انمول موتی بازارِ مصر میں گوہر نایاب تھے اور اقبال کی شاعرانہ عظمت اور ان کے پیام کو سمجھنے کے لیے ان کے تمام افکار کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ نیز ان کی شاعری کی تحلیل اور اس کے وسیع مطالعے کے بعد ہی ان کے متعلق صحیح فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ اقبال کی شاعری محض عشق و محبت اور مناظر طبعی کی محاکات کا ایک دلکش گلدستہ ہے یا مدح و ستائش، ہجو و مذمت، شجاعت و بسالت کے وہی پامال مضامین ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں؟ یا اقبال کا کلام دوسرے شعراء کے کلام سے مختلف ہے اور اقبال کی شاعری میں گہرائی سنجیدہ حقائق گوناگوں جدید مضامین ہیں؟ مجھے اعتراف ہے کہ اپنی محدود معلومات کی بنا پر اقبال کی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا اور محض ذاتی تعارف و

معمولی گفتگو کی بنا پر یا ایسے لوگوں کی تعریف و توصیف کی بنا پر جنہوں نے اقبال کے کلام کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تھا کوئی رائے قائم کرنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔

اقبال سے میں بیت المقدس میں ملا تھا مرحوم کی تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، خوش قامت متوسط قد دوہرا بدن نہ زیادہ بھاری جسم کے نہ دبلے تھے، بادقار کم سخن، افکار میں ڈوبے ہوئے چہرہ سے علمار کی تواضع و سنجیدگی نمایاں تھی مرحوم نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اتنا تقریر میں ایک حدیث نبوی بھی عربی میں بیان کی تھی اس حدیث کے متعلق میں آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔

اقبال کی تقریر کو اپنے بعض دوستوں کی وساطت سے سمجھنے کی کوشش کی اس ملاقات کے بعد مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اس ملاقات کے کچھ دنوں بعد میں ہندوستان آیا اور تقریباً ساڑھے چار مہینے تک رہا اس اثنار میں مرحوم سے آپ کے اسی حسین و جمیل شہر لاہور میں دوبارہ ملاقات ہوئی ہماری گفتگو کا موضوع بدنصیب فلسطین کا دفاعی مسئلہ تھا۔

آج میں آپ کے اس اجتماع میں دائیں بائیں مڑ کر دیکھتا ہوں کہ شاید میرے قدیم صدیق جسم نظر آجائیں اور میں پند و موعظت سے لبریز ان کی شیریں گفتگو سے بہرہ اندوز ہو سکوں مگر افسوس میری نگاہ ناکام پلٹ پڑتی ہے غم سے میرا دل لبریز ہے اور مرحوم کی جدائی کی چبھن دل میں محسوس کر رہا ہوں کسے معلوم تھا کہ ایک دن یوم اقبال میں شریک ہو کر تعزیت کے فرائض انجام دوں گا۔ آہ آج میں مرحوم کی تعزیت کے فرائض انجام دے رہا ہوں حسن و خوبی، پاکیزگی و شرافت کی تعزیت کر رہا ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم المرتبت شخصیت کو اس دنیا فانی سے اس لیے اپنے پاس بلا لیا کہ وہ اس گندہ اور خواہشات پرست دنیا کے دردناک منظر کو نہ دیکھے، نہ ان کی نگاہیں المناک مناظر کا مشاہدہ کریں اور نہ ان کے کان فلسطین کی تکلیف دہ داستانِ غم والم کو سنیں۔

آج ہمیں صرف اس تصور سے سکون حاصل ہوتا ہے کہ مرحوم کی پاک روح

جنت سے ہمیں جھانک کر دیکھ رہی ہے، پاکستانی قوم کے حق میں برکت وفلاح کی دعا کر رہی ہے اور اہل پاکستان کو دعوت دے رہی ہے کہ مرحوم کی دیرینہ تمناؤں کو اس پاکستان میں بار آور کر دکھائیں جس کی خاطر اقبال نے اپنی دنیا اور اپنا سکون وچین سب سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

اقبال سے ملنے اور دوستانہ تعلقات کے بعد ان کے شاعرانہ افکار اور ان کے پیام کے بعض پہلوؤں کو میں سمجھ سکا۔ میں حیران تھا کہ اس جسم خاکی اور مختصر سے دماغ میں اعلیٰ افکار، شاداب مضامین، قیمتی خیالات اور فلسفۂ حیات کا کیسا گنج گراں مایہ چھپا ہوا ہے۔ اس کے جسدِ خاکی میں ایک بے چین روح اور سکون ناآشنا جان مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے بے تاب ہے اقبال کو قدرت نے ایک نہ تھکنے والی طبیعت عطا کی تھی جو مسلمانوں کی رہنمائی میں حدود وقیود سے بلند تھی مرحوم مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ پر چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ اقبال کے پیام کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام میں اسلام کا فلسفۂ حیات پایا جاتا ہے۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور بلند اخلاقی قدر یعنی شجاعت، عفت، پاکدامنی، جہاد، قربانی، اور ایثار کے بلند اصول جو اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لیے ناگریز ہیں اقبال کے کلام میں دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

اقبال کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا، ریڈیو پر ان کے کلام کو شیریں دلکش نغمہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی سنا۔ عوام وخواص کی محفلوں میں لوگوں کو پڑھتے ہوئے بھی دیکھا، اقبال کے گلدستہ کلام میں بہت سے پھول مجھے پسند آئے اس گلشن بے خار اور بہار بے خزاں سے لطف اندوز ہونے کے لیے عربوں کے لیے عربی ترجمہ ہی بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ ترجمہ خواہ کس قدر بہتر ہو اصل کلام کی بلاغت کو ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے اور ترجمہ سے اصل مضامین کی شگفتگی، اور بیان اور اسلوبِ ادا کی دل کشی کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اقبال کی شاعری زماں ومکاں اور جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے وہ ایک پیامِ حیات اور فلسفۂ زندگی

ہے۔ اقبال عالم اسلام کا مایہ ناز شاعر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا بیش بہا سرمایہ فخر و مباہات ہے۔[1]

حواشی

[1] شائع شدہ "فاران" نومبر ۱۹۸۱ء

مشہور ہندو صوفی سوامی رام تیرتھ سے علامہ صاحب کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ علامہ صاحب سوامی جی کی روحانیت کے مداح تھے، سوامی جی کی وفات کے کئی سال بعد ان کا بڑا صاحبزادہ جو ولایت سے ابھی واپس آیا تھا، علامہ صاحب سے ملنے آیا، علامہ صاحب نے کہا "آپ کا مشغلہ"؟

انہوں نے جواب دیا "میں ولایت سے کان کنی کا کام سیکھ کر آیا ہوں"، علامہ صاحب نے مسکرا کر برجستہ کہا "آپ کے والد تو آسمان کھودا کرتے تھے اور آپ زمین کھودیں گے"۔

(قندیل: ۲۶ر اپریل ۱۹۵۹ء)

سی آر داس کی والدہ اور نماز

علامہ اقبال کا انکشاف

مُمتاز حسن

اقبالؒ نے ایک دفعہ گفتگو کے دوران مجھے آر، سی، داس کا ایک واقعہ سنایا کہنے لگے کہ سی آر، داس سے میری ذاتی دوستی تھی وہ ایک بے تعصب ہندو تھا اور مسلمانوں سے عناد نہیں رکھتا تھا۔ وہ ملک کے چوٹی کے وکلاء میں سے تھا۔ ایک بار کسی بہت بڑے مقدمے میں فارسی زبان کی دستاویزات پیش کی گئی تھیں۔ سی، آر، داس نے جو یہ مقدمہ لڑ رہا تھا۔ مجھے ان دستاویزات کے ترجمے اور تشریح کی خاطر ایک جونیئر کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی۔ سفر اور اقامت کے اخراجات کے علاوہ میرے لیے ایک گرانقدر یومیہ فیس بھی مقرر ہوئی۔ میں گیا، دو تین دن میں میرا سارا کام ختم ہوگیا تو میں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ سی، آر، داس نے بہت کہا کچھ روز اور ٹھہریے، یہ تو ملنے کا بہانہ تھا جتنی دیر آپ قیام کریں گے آپ کو فیس ملے گی۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ جس کام کے لیے آپ نے مجھے بلایا وہ ختم ہوگیا، تو اب مجھے جانا ہی چاہیئے۔ چنانچہ میں چلا آیا اور مقدمے پر غیر ضروری اخراجات کا بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔

اقبال اس کے بعد سی، آر، داس کی ذاتی خوبیوں کا ذکر کرتے رہے، یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں سے سیاسی مفاہمت کا جو جذبہ اس کے دل میں تھا اس کی تہہ میں اس کی اسلام دوستی تھی جس کے لیے اس کے خاندان کی فضا سازگار تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے یہ فرمایا کہ سی، آر، داس نے ان سے بیان کیا تھا کہ اس کی والدہ نماز پڑھا کرتی تھی۔

دستخط : ممتاز حسن

۱۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء

علامہ اقبالؒ ـــــ چند یادیں

تحریر ـــــ نجم الدین عشرت

سنہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ ہے۔ تحریکِ حریت کشمیر نے ریاست کے ہر ایک متنفس کو جھنجھوڑ کر رکھا ہے۔ کشمیر کا تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ پورے طور پر اس سے وابستہ ہے اور ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق اس میں حصہ لینے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ میرا شمار اگرچہ ردِ میں نخفانہ تین میں، میری حیثیت محض ایک طفیلی کی تھی۔ پھر بھی رفتارِ زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ تحریک حریت کے زعماء کے ساتھ میرے گھریلو روابط تھے اور حضرت مولانا مسعودی صاحب نوجوان طبقہ کی ہر ایک امکانی رہنمائی کرنے کے علاوہ ان کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے تھے۔ قدرت نے آپ کو قائدانہ صفات عطا کی ہیں۔ آپ کی دور بین نگاہ، حساس دل اور مدبرانہ قیادت نے تمام نوجوانوں کو ان کے گرد جمع کر لیا تھا۔ میرے حال پر انھیں خصوصی کرم حاصل تھا۔ اور آج بھی، جب کہ وہ گوشہ نشینی اور قلندرانہ وضع اختیار کیے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی مہربانی اور شفقت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ مکرم خواجہ صدرالدین مجاہد، خواجہ عبدالغنی صاحب نرالی اور دوسرے بزرگ مجاہد منزل میں براہِ راست مولانا کی صحبتِ کیمیا اثر سے مستفید ہوتے تھے۔ میرے ذمہ بیرونی اخبارات کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے کا کام رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اخبار "زمیندار" لاہور، "سیاست"، "انقلاب"، "مدینہ" بجنور، کشمیری وغیرہ میں میرے مضامین مختلف قلمی ناموں کے تحت شائع ہوتے تھے۔ ان میں غیر ذمہ دار نظامِ حکومت کے مظالم اور جبر و استبداد کی داستان، تحریکِ حریت کی رفتار وغیرہ کی اطلاعات چھپ جاتی تھیں (ان کے تراشے میرے پاس اس وقت تک محفوظ ہیں) اس تحریک نے اب ہندوستان گیر شدت اختیار کی تھی۔ لاہور میں کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا اور احرار کی یلغار نے سراج

کے "ابوت" میں آخری کیل لگا دی تھی۔ انگریز اور کشمیر کے ڈوگرہ حکمران اس صورتِ حال کو دیکھ کر بوکھلا اُٹھے تھے اور وہ تحریکِ آزادی کا قلع قمع کرنے کے لیے متحدہ محاذ قائم کر گئے تھے۔ اور اس صوبے میں کسی آئین، اخلاق اور شائستگی کو کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ کشمیر صحیح معنوں میں سرزمین بے آئین بنا ہوا تھا۔ یہاں زین العابدین صاحب، سید اسماعیل صاحب غزنوی، محمد الدین صاحب تاثیر، مولانا علم الدین سالک اور دیگر زعمائے پنجاب موجود تھے۔ وہ زعمائے کشمیر کو اپنے گراں قدر مشوروں اور تجربوں سے مستفید کرتے تھے۔ یہاں کی حکومت اس سے بے خبر نہ تھی۔ وہ تحریک کی وسعت کو ہر قیمت پر سمیٹنا چاہتی تھی۔ لیکن مجاہدینِ کشمیر کے سامنے یہ سب منصوبے بے کار ہو کر رہ گئے اور وہ سدِ سکندری کی طرح ان تمام طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں صف آرا رہ گئے مولانا مسعودی مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری منتخب کئے گئے تھے۔ وہ اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ نے فیصلہ کر لیا کہ ایک تاریخی اجلاس منعقد کر کے قوم کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کیا جائے اور غیر ذمہ دار حکومت پر اتمام حجت کر دیا جائے تاکہ وہ کشمیریوں کے مطالبات تسلیم کرے!

مولانا مسعودی تمام تحریری مواد کو خود ترتیب دیتے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ وہ خطبۂ صدارت کو لاہور میں طبع کرائیں۔ مولانا نے یہ خطبہ خود لکھا تھا (حالاں کہ اس قسم کے خطبات کی ترتیب و تدوین کمیٹی کے سپرد کر دی جاتی ہے) اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ہندوستان کے زعماء کو اس تاریخی اجلاس میں شمولیت کی درخواست کی جائے۔ اس میں سرفہرست علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی رکھا گیا تھا۔ علامہ مرحوم کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے۔ ویسے بھی وہ سنِ شعور ہی سے کشمیریوں کی دردناک حالت سے بہت متاثر تھے۔ خود بھی کشمیری نژاد تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، چناں چہ اپنے ابتدائی کلام میں وہ اس طرح سخن سرا ہیں ؎

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا

توڑ اس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

اور آخری کلام میں فرماتے ہیں ؎

کشیری کہ با بندگی خوگرفتہ است بتے مے تراشد زِ سنگے مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

بہر حال فیصلہ ہوا کہ مولانا محمد سعید مسعودی صاحب لاہور تشریف لے جائیں گے تاکہ خطبۂ صدارت کی کتابت وطباعت بھی ہو اور ساتھ ہی وہاں کے سرکردہ احباب کو اس تاریخی اجلاس میں شمولیت کی دعوت دے کر کشمیریوں کی کلاہِ افتخار کو عزت بخشیں، سرکردہ اصحاب میں علامہ کے علاوہ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر "زمیندار"۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر "انقلاب" مولانا عبدالمجید سالک اور دیگر مفصل حضرات شامل تھے۔

اس سے قبل مولانا مسعودی صاحب نے نوجوانانِ کشمیر کو منظم اور مرتب کرنے کے لیے انجمن خُدامُ الخلق کی بنیاد ڈال دی تھی، اور راقم کو اس انجمن کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا تھا۔ انجمن کے اسٹیج پر مولانا مسعودی اور مولانا سالک نوجوانانِ کشمیر کے سامنے عالمانہ اور فاضلانہ خطبات کے ذریعہ ان کے ارواح کو گرمی اور ان کے مردہ اجسام میں خونِ زندگی دوڑاتے تھے۔ اس حیثیت سے کہ راقمِ احقر اس انجمن کا جنرل سیکرٹری تھا، مولانا موصوف اکثر و بیشتر تقاریب میں ساتھ لے جاتے تھے۔ چناں چہ یہاں بھی قرعۂ فال نیاز مند کے نام پڑا۔ اور مجھے ساتھ چلنے کا حکم ہوا۔ حضرت مولانا موصوف، سالک صاحب اور نیاز مند براستہ جموں عازمِ لاہور ہوئے۔ رات بانہال میں ٹھہرے رہے اور دوسرے دن جموں پہنچے۔ یہاں مرحوم چودھری حمید اللہ کے مکان پر ٹھہرے رہے۔ یہاں مبارک جالندھری جو کہ مشہور شاعر تھے۔ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے تحریک حریت کشمیر کی نسبت اپنی نظمیں سنائیں۔ یہاں سے بذریعہ ریل لاہور پہنچے۔ وہاں مولانا عبدالمجید سالک کے مکان پر ٹھہرے رہے۔ آخر وہ مبارک دن آیا کہ ہم حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جوں ہی ان کے مکان پر دستک دی تو

حضرت علامہ کے خادم علی بخش کے ذریعہ علامہ مرحوم کو کشمیری وفد کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ جوں ہی علامہ کو اطلاع دی گئی، انھوں نے فوراً اندر بلایا۔ علامہ نہایت خوشی، شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ تحریکِ کشمیر کی نسبت حالات پوچھتے رہے۔ مکان کے صحن میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر علامہ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ سرخ و سفید رنگ، بھرا ہوا جسم، نیلے شیلے ہونٹ، ناک نہ بہت چھوٹی اور نہ زیادہ بڑی، پیشانی فراخ، لباس صرف ایک کرتہ اور تہہ بند۔ مولانا مسعودی نے مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی۔ علامہ چوں کہ گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن تشریف لے جانے والے تھے، اس لیے معذرت ظاہر کی۔ اس اثنا میں اور بہت سے بزرگ تشریف لے آئے۔ اسی موقعہ پر علامہ نے "جاوید نامہ" کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ "یہ کتاب پریس میں ہے، اور اس میں علامہ نے "زندہ رود" کے نام سے بزرگانِ ملت کی سماوی سیر کا تذکرہ کیا ہے۔ کشمیر کی نسبت انھوں نے اس کتاب میں کیا لکھا ہے، اس کی نسبت تفصیلی گفتگو فرمائی اور یہ تو بار بار دُہراتے رہے ؎

باش تا بینی بے کہ آواز صُور ملّتے برخیزد از خاکِ قبور

اس طرح پہلی اور آخری دفعہ اس عظیم الشان شاعر، فلاسفر، آفاقی اور عالمی شخصیت کا شرف حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام داستان ایک طویل عرصہ کے بعد ایک کمزور حافظہ کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس میں وہ سب کچھ نہیں ہے کہ جو سامنے آیا۔ کہیں تفصیلات ہیں اور کہیں جزئیات ہیں۔ ایک عزیز بھائی کے لیے یہ یادداشتیں مرتب کی گئیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں کسی شہرت اور خود نمائی کو دخل نہیں، البتہ کلامِ اقبال سے صرف یہی عرض کرنا ہے کہ ؎

بگیر ایں سرمایۂ بہار از من کہ گل بدست تو از شاخِ تازہ تر ماند

شائع شدہ "شیرازہ" اقبال نمبر۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ سری نگر

اقبال

تاثرات و مشاہدات

از :- رئیس احمد جعفری

میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا ایک طالب علم تھا، جامعہ کے اساتذہ میں نیازی صاحب کو اقبال سے خصوصیت تھی۔ انہوں نے ایک "حلقۂ اقبال" قائم کر رکھا تھا، اس حلقہ میں اس مردِ حق آگاہ کے کلام و بیان کی تشریح و تفسیر ہوتی تھی۔ اس کے خیالات و جذبات کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ اس کی فکر آسمان پیما، اور اس کے پیغام حیات آفرین پر بحثیں ہوتی تھیں، اس کے مشکل اور دقیق اشعار کی "مشکل کشائی" ہوتی تھی، اس کے اندازِ بیان اور اسلوب کلام پر نقد و تبصرہ ہوتا تھا، ہم لوگ سامع کی حیثیت سے بیٹھتے تھے، اور نیازی صاحب بلبلِ ہزار داستان کی طرح اپنی خوش بیانی اور معنی آفرینی سے ایک سماں پیدا کر دیتے تھے، میں اس حلقہ میں باقاعدہ شریک نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ لیکن اقبال کی جو عظمت میرے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس کبھی کبھی کے شریک حلقہ ہونے سے اور بڑھ گئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ نیازی صاحب کا اقبالیات پر نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا اور چونکہ اکثر و بیشتر انہیں خود بھی اقبال سے براہِ راست مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے، اس لیے اس مسئلہ پر، وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے۔

۳۲ء میں اقبال کسی کام سے دہلی آئے۔ اربابِ جامعہ نے طے کیا کہ انہیں ایک پارٹی دی جائے اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ اس موقع پر تعلیمی مرکز نمبر ۲ کا ہال سجایا گیا۔ اسی کے اندرونی صحن میں پارٹی کے انتظامات ہوئے، ساتھ ہی ساتھ مکتبہ جامعہ کی مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی۔

سہ پہر کو علامہ تشریف لائے، سب سے پہلے اساتذہ اور سربرآوردہ حاضرین

کا موصوف سے تعارف کرایا گیا، میں انجمن اتحاد (یونین) کا نائب صدر تھا، میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ حضرت علامہ مطبوعات جامعہ کی نمائش کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے، اُن کی نظر "سیرت محمد علی" پر پڑی یہ میری پہلی تصنیف تھی، اسے میں نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ترتیب دیا تھا اور ابھی شائع ہوئی تھی، اب علامہ سے میرا مزید تعارف ہوا، "سیرت محمد علی" کے مصنف بھی یہی ہیں۔

حضرت علامہ رُک گئے، کتاب اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ نہایت شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، فرمایا بہت سے واقعات میں محمد علی کے بارے میں ایسے بتا سکتا ہوں جو صرف مجھی کو معلوم ہیں۔ ان سے بھی فائدہ اٹھا لیتے۔ میں نے کہا ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ یہ تو ایسی نادر معلومات کا جویا ہوں، بات ختم ہوئی، علامہ آگے بڑھے اور حلقہ اساتذہ میں جا کر بیٹھ گئے، میں طالب علموں کے ساتھ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا نگاہ عقیدت سے ان کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے اُن کی وہ نظم یاد آ رہی تھی، جو ۱۹۲۰ء میں انہوں نے "محمد علی شوکت علی" کی طویل نظر بندی اور سزایابی سے رہائی کے موقع پر کہی تھی ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فرِ چیز لیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دلچسپ قفس سے بہرہ مند

"شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

جس شاعر اعظم نے محمد علی کی عظمت کا ان بلند الفاظ میں اعتراف کیا، اس کے نادر معلومات یقیناً محمد علی سے متعلق خاص طور پر قابل اخذ و استفادہ ہوں گے یہ سوچنے سوچتے مجھے اقبال کی وہ نظم یاد آ گئی، جو اس نے "دریوزۂ خلافت" کے نام سے کہی تھی، یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی، جب محمد علی "وفد خلافت" لے کر یورپ گئے تھے ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کہ ۔۔۔ خلافت کیا کرتے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے ۔۔۔ مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چہ، عار ناید"
کہ از دیگراں خواستن موميائی!"

کتنا خوددار ہے یہ شخص!

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم کانفرنس مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی۔ عوام کو تو کچھ اس سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن خواص ..... سرخان بہادر، دولتمند ..... اس محور کے گرد گردش کر رہے تھے۔ مسلم کانفرنس، مسلم سیاست پر اسی طرح اثر انداز تھی جس طرح آجکل مسلم لیگ نظر آرہی ہے۔

سر آغا خان، اُس کے پہلے صدر تھے، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں اور اس نہج کے دوسرے ارباب ہم اس کے خاص الخاص کارکنوں میں تھے۔ اب اس کی صدارت پر اقبال فائز تھے، یہ صدارت اقبال کے لیے باعثِ اعزاز نہیں تھی، البتہ مرحوم مسلم کانفرنس کی رُوح تا ابد اس پر نازاں رہے گی کہ اس کی صدارت کی کرسی پر، مشرق کا سب سے بڑا شاعر حیات متمکن ہو چکا ہے۔

اسی مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا۔ اقبال لاہور سے دہلی آئے۔ اب کی دہلی میں مولوی محمد شفیع داؤدی ایم، ایل۔ اے کی قیام گاہ پر مقیم ہوئے۔ شام کو میں محمد علی ہوسٹل سے کسی کام سے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی، موصوف نئی دہلی اقبال سے ملنے تشریف لیے جا رہے تھے۔ ازراہ کرم گستری مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ہم لوگ نئی دہلی پہنچے، شفیع داؤدی صاحب کی قیام گاہ پر اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے، مسلم لیگ کے لیڈر مسلم کانفرنس کے رہنما خلافت کے پرانے کارکن مرکزی اسمبلی کے ممبر اور بعض وہ لوگ بھی موجود تھے جو برطانوی ہند کی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مثلاً مسٹر شعیب قریشی۔

علامہ اپنے کمرے سے تشریف لائے۔ کسی سے معانقہ، کسی سے مصافحہ، کسی سے

آنکھوں آنکھوں میں پیام سلام ہوا، سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، اور باتیں شروع ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد علامہ نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی طرف رجوع کیا۔ اور گفتگو شروع ہوگئی، گفتگو کا موضوع سیاسی نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں ہر قسم کے مباحث چھڑ جاتے تھے۔ علامہ کی گفتگو کا عام انداز یہ تھا کہ گفتگو اردو میں شروع کرتے تھے، اور بہت جلد انگریزی پر آجاتے تھے۔ پھر کبھی انگریزی میں بات کرتے رہتے، کبھی اردو میں تقریباً دو گھنٹہ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں نہ معلوم کتنے مباحث پر گفتگو ہوئی، لیکن ہر مبحث پر اتنی جامع و مانع، اتنی مکمل اتنی سیر حاصل اور اتنی شگفتہ گفتگو ہوئی کہ میں تو علامہ کی حاضر دماغی بر جستہ گوئی، وسعتِ علم، اور بلندی فکر پر عش عش کر گیا۔ اقبال کی شاعری، ان کی فلسفہ دانی، ان کی قابلیت، ان میں سے ہر چیز اصول موضوعہ کی طرح اپنی جگہ پر مسلم تھی، لیکن یہ آج اندازہ ہوا کہ بزم کی صحبتوں میں بھی اقبال کی شخصیت کتنی دل آویز، کتنی پر کشش اور کتنی سحر طراز تھی؟

اس مجمع میں بڑے بڑے اہلِ علم و دانش موجود تھے۔ بڑے بڑے مفکر اور سیاسی موجود تھے بڑے بڑے نکتہ رس اور ہمہ دان موجود تھے، بڑے بڑے دانا و بینا اور ارباب بینش موجود تھے۔ لیکن اقبال کے علم، اس کی ہمہ دانی، اس کی معرفت اور اس کے دابِ دانش کے سامنے سب طفل مکتب معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے "کتاب الاغانی" کا وہ قصہ یاد آگیا جب عہد ہارون الرشید کے مشہور مغنی ابراہیم موصلی نے اپنے بیٹے اسحٰق کو اس عہد کے کامل فن ماہر غنا ابن جامع سے ملایا تھا، ابنِ جامع نے باپ بیٹے کی فرمائش سے مجبور ہو کر اپنے راگ سنائے، مجلس ختم ہوئی اور یہ دونوں واپس آگئے، راستہ میں ابراہیم نے اسحٰق سے پوچھا "کہو بیٹا ابن جامع کو کیسا پایا؟" اسحٰق نے کہا اگر ناراض نہ ہوں تو عرض کروں؟ ابراہیم نے پھر اصرار کیا تو اسحٰق نے کہا "آپ سے بڑھ کر راگ راگنی کے فن میں کسی کو بھی میں نہیں سمجھتا تھا، لیکن ابن جامع کو سننے کے بعد آپ کچھ نہیں رہے"۔

یہی حال میرا تھا۔ اس مجمع میں متعدد اصحاب ایسے تھے جن کے علم و فضل، مہارت و

قابلیت ذہانت وذکاوت کا میرے دل پر سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں سب طفل کم سواد" نظر آرہے تھے، اور اقبال ایک یگانہ شخصیت کی طرح جلوہ آرا تھا، جو سب پر چھایا ہوا تھا، سب جس کے سامنے گردن جھکائے ہوئے تھے۔

سنہ ۳۳ء میں عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت غازی رؤف پاشا کو ڈاکٹر انصاری مرحوم امیر چانسلر جامعہ نے دہلی آکر توسیعی خطبات دینے کی دعوت دی، رؤف پاشا نے یہ دعوت بہ مسرت منظور کرلی اور ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے انہوں نے مشرف فرمایا۔

رؤف پاشا خلافت عثمانیہ کے دور میں ایک ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے حمیدیہ جہاز کے سلسلہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے ایک دنیا واقف ہے، یہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت کے امیر البحر تھے۔ پھر انقلاب کے بعد بھی یہ ترکی میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، بعد میں مصطفےٰ کمال پاشا سے اور ان سے اختلاف ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ترکی چھوڑ کر ایک جلاوطن کی طرح پیرس میں رہنے لگے۔

قبل اس کے کہ رؤف پاشا ہندوستان پہنچیں ان کا نام نامی ہندوستان پہنچ چکا تھا، مسلمان تو مسلمان ہندوستان کے غیر مسلم بھی ان کی شخصیت میں غیر معمولی جذب وکشش محسوس کر رہے تھے۔ جامعہ میں ان کے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ کئی روز تک خطبات کا سلسلہ جاری رہا ہر روز صدارت کے فرائض اسلامی ہند کی کوئی مقتدر شخصیت انجام دیتی تھی۔

ایک جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ جلسہ رات کو تھا۔ علامہ صبح فرنٹیئر میل سے تشریف لے آئے، جامعہ کے طلبا اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھی، اس مرتبہ علامہ نے غالباً پروفیسر محمد مجیب جی کی کوٹھی (قرول باغ) پر قیام فرمایا۔

جلسہ کا وقت آگیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تھالی پھینکئے تو سر ہی سر جائے۔ ایک تو رؤف پاشا کی دلربا شخصیت۔ دوسرے جلسہ کی صدارت سونے پر سہاگہ، آج ہجوم

اور زیادہ تھا، بہت زیادہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مدظلہ، (شیخ الجامعہ) نے ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ اور زبردست تقریر میں پہلے اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا تعارف کرایا، پھر صدارت کے لیے ان کا نام پیش کیا۔

توقع تھی کہ اقبال اردو میں تقریر کریں گے۔ لیکن انہوں نے شاید مجمع کی مناسبت سے انگریزی ہی کو تقریر کے لیے پسند کیا۔ بڑی معرکہ آرا تقریر کی

ابھی کچھ عرصہ پیشتر علامہ سفر یورپ سے واپس آئے تھے۔ تیسری گول میز کانفرنس میں وہ مندوب کی حیثیت سے حکومت ہند کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعد علامہ نے اپنی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری کی۔ یعنی اسپین کی سیاحت یہ وہ سرزمین تھی۔ جہاں صدیوں مسلمانوں نے حکومت کی تھی، بادشاہت کی تھی۔ اور وہ بھی اس جاہ و جلال کے ساتھ کہ دیارِ فرنگ ان کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

اب اسپین میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو چکا ہے، ان کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ لیکن اب بھی وہاں کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے ثقافت کے نشانات موجود ہیں۔ اب بھی وہاں قصر الحمرا کے کھنڈر، مسجد زہرہ کے باقیات الصالحات، اور عہد اسلامی کی تعمیرات کے آثار موجود ہیں۔

اقبال ابھی ابھی اس سفر سے واپس آئے تھے، تاثرات تازہ تھے اور وہ اشعار کی صورت اختیار کر رہے تھے، اُن کی نظم "ہسپانیہ" ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی، لیکن محرمانِ راز اور خلوتیان حرم کی معرفت ایک آدھ شعر، حکومت سے خلوت سے جلوت میں آچکا تھا ؎

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں　　ما نادہ تب و تاب نہیں اسکے شرر میں
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن　　تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سُنا بھی
ہے دل کی تسلّی نہ نظر میں نہ خبر میں

اب اقبال کی شاعری پھر اردو کا جامعۂ حریر پہن رہی تھی۔ بہرحال اقبال نے تقریر شروع کی، سارا مجمع گوش برآواز تھا۔

اس تقریر میں انہوں نے فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور فرمایا، جب میں نے اُسے "لاتسبوا الدہر وانا الدہر" (یعنی خدا کہتا ہے، زمانہ کو برا نہ کہو میں خود زمانہ ہوں) سنایا تو وہ اسلام کے اس فلسفہ پر بھونچکا رہ گیا۔

اسی تقریر میں انہوں نے اپنے چند تازہ اشعار بھی سنائے۔ لیکن اس لحن اور طرز میں نہیں، جس کی گونج انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اکثر و بیشتر سُنی جاتی تھی، بلکہ تحت اللفظ، لیکن اس تحت اللفظ میں بھی جو اثر، جو کیف جو جادو تھا اُسے سُننے والے اب تک نہیں بھولے ہیں نہ شاید کبھی بھول سکیں۔

قبل اس کے کہ وہ اشعار درج کیے جائیں، اُن کا پس منظر بھی اگر پیش کر دیا تو مناسب ہوگا۔

اسپین پر ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ اس دوران میں وہ وہاں اجنبی نہیں رہے بلکہ گھل مل گئے۔ عیسائی خاندانوں سے انہوں نے رشتۂ ازدواج بھی قائم کیا، پھر وہ دور آیا کہ مسلمانوں کی نااتفاقی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے اُن کا شیرازہ بکھر گیا، اور وہ اندلسی حکومت جس کی طرف یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتی تھیں، اور جس کی عظمت، ہیبت و دبدبہ، سطوت اور جلال کا یہ عالم تھا کہ سارا فرنگستان اُن سے بیدلرزاں کی طرح کانپتا تھا، اسپین پر ٹوٹ پڑا، اور اسلامی حکومت ختم ہوگئی۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ اسلامی حکومت ختم ہوگئی، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان بھی وہاں سے نکال دیئے گئے۔ یہ الجزائر، ٹیونس، ریف

وغیرہ کے عربوں کا جو نام آپ سنتے ہیں یہ زیادہ تر وہیں کے خاندان ہیں، جو اسپین سے ہجرت کرکے، یا جلا وطن کرکے یہاں بھیجے گئے۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

لیکن کچھ خاندان ایسے بھی تھے، جو اسپین ہی رہ گئے اور وہاں کے نئے ماحول سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ انہوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا۔

عربی زبان کے ایک مشہور انشا پرداز نے ایک مختصر لیکن بلند پایہ کتاب "اندلس کا ماضی اور حال" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ انکشاف بھی ہے کہ قدیم عرب خاندان جو بعد میں عیسائی ہوئے تھے۔ آج بھی اسپین میں موجود ہیں، وہ اب بھی وہاں عیش و نشاط کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دولت و امارت ان کے گھر کی لونڈی ہے، وہ لارڈ ہیں، نواب ہیں، جاگیردار ہیں، زمیندار ہیں، دولت مند ہیں، اور وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی پر اثر رکھتے ہیں۔ انہیں اس پر فخر ہے کہ ان کی رگوں میں عرب خون دوڑ رہا ہے، بعض خاندان تو ایسے ہیں جو اپنے "صدیقی" اور "فاروقی" ہونے پر نازاں ہیں۔

شاعر مشرق، جب اندلس پہنچا تو صرف ایک عام زائر اور سیاح کی حیثیت سے اس نے کوچہ گردی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بہ نظر غائر وہاں کے لوگوں کا، ان کے رہنے سہنے کا، ان کے طور طریق کا، ان کے اصول اور ضابطہ کا مطالعہ کیا۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، اور پایا جس کی طرف کچھ عرصہ پیشتر ایک عرب مصنف اور انشا پرداز اپنی ایک مایہ ناز تصنیف میں اشارہ کر چکا تھا، اور اپنے تاثرات کو ایسے الفاظ میں قلم بند کیا کہ پڑھنے والے ہمیشہ پڑھیں گے اور روئیں گے، سننے والے سنیں گے اور سر دھنیں گے۔

اقبال نے اس جلسہ میں جو اشعار سنائے، وہ ایک طویل نظم "مسجد قرطبہ" کا ایک حصہ تھے، یہ وہ مسجد ہے، جو آج بھی موجود ہے اور اپنی گذشتہ عظمت کا فسانہ زبانِ حال سے سنا رہی ہے وہ اشعار جو اقبال نے اس مجمع میں سنائے یہ ہیں:۔

کعبہ ارباب فن، سطوت دیں بھی ہیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حامل "خلقِ عظیم"! صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم و اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت

اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں مغربیوں کا جہاں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

یہ اشعار اقبال نے ترنم سے نہیں پڑھے تھے بلکہ نخت اللفظ انہیں پڑھا تھا پھر بھی تاثر کا یہ عالم تھا کہ مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کَاَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِہِمُ الطَّیْر!

مجھے اقبال سے ملاقات، یا اخباری زبان میں "انٹرویو" کی سعادت نہیں حاصل ہوئی، البتہ مجھے اُن کے نظارہ کا دو ایک مرتبہ موقعہ ملا۔ یہ تاثرات و نقوش، اسی اجمال کی تفسیر ہیں۔

تحریکِ حریتِ کشمیر کے بانی قاضی گوہر الرحمٰن نے راقم الحروف کو بتایا کہ علامہ اقبال نے انہیں کہا جب تک کشمیریوں کے ہاتھ میں تلوار نہیں ہوگی وہ کبھی بھی اپنے حقوق تسلیم نہیں کروا سکیں گے۔

(کلیم اختر، مضمون: کشمیر اور اقبال)
(قندیل: ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء)

اقبال کا سفرِ افغانستان

چند یادیں

مقبول احمد

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے نومبر ۱۹۳۲ء میں کابل کا دورہ کیا تھا، بالِ جبریل میں اِس دورے کا ذکر ہے، حضرت علامہ نے اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے شہرہ آفاق منظم "ماازپے سنائی وعطار آمدیم" کی تمہید کے طور پر ذیل کے الفاظ لکھے:۔

"اعلیٰ حضرت شہید امیر المؤمنین نادر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے لطف وکرم سے نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی، یہ چند افکارِ پریشان جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روزِ سعید کی یادگار کے طور پر سپردِ قلم کیے گئے تھے۔"

دراصل علامہ اقبال کا یہ دورہ نومبر ۱۹۳۲ء سے تعلق رکھتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالِ جبریل میں غلطی سے نومبر ۱۹۳۳ء لکھ دیا گیا، راقم الحروف اس وقت کابل میں تھا اور اسے حضرت علامہ کے اس دورے میں کئی دفعہ شرفِ ملاقات بھی حاصل ہوا، علامہ صاحب کو اعلیحضرت محمد نادر خاں نے آنے کی دعوت دی تھی اور نومبر ۱۹۳۳ء سے پہلے ہی محمد نادر خاں وفات پا چکے تھے اور ان کے صاحبزادے محمد ظاہر شاہ ان کی جگہ سریر آرائے سلطنت ہو چکے تھے، یہ تاریخی واقعہ ہے لہٰذا اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

درحقیقت بچہ سقہ کی بغاوت کے نتیجے میں افغانستان میں جو خلفشار پیدا ہوا برصغیر اور ایران کے اخبارات میں اس کے بارے میں لاتعداد متضاد حکایتیں شائع ہوئی تھیں، اور اعلیحضرت محمد نادر خان افغانستان کے خلاف اس زہریلے پروپیگنڈے کو ختم کرنے کے لیے

ہمسایہ ملکوں کے لیڈروں کو افغانستان آنے کی دعوت دیتے رہتے تھے تاکہ وہ خود اس ملک کے حالات وکوائف ملاحظہ کریں اور غلط سلط پروپیگنڈے سے باز رہیں، اسی سلسلے میں "سیاست" لاہور کے ایڈیٹر مولانا سید حبیب، روزنامچہ دہلی کے ایڈیٹر مشہور مصنف اور ادیب خواجہ حسن نظامی اور "انقلاب" لاہور کے ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر کو بھی مدعو کیا گیا، چنانچہ ان حضرات نے واپس آکر افغانستان کے بارے میں کئی مضامین شائع کئے تھے جس کی وجہ سے حکومتِ افغانستان کو بدنام کرنے کی کوششوں کا کسی حد تک سدِباب ہوگیا تھا۔

مولانا ظفر علیخاں کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن چونکہ انہوں نے انقلابِ افغانستان کے وقت افغانستان میں اعلیحضرت محمد نادر خان اور ان کے بھائیوں کے داخلے کی اس بناء پر مخالفت کی تھی کہ وہ امان اللہ خان کے خلاف مہم کو تقویت بخشیں گے، اور وہ اس سلسلہ میں آخری وقت تک ان کی مخالفت کرتے رہے تھے، لہٰذا مولانا نے یہ دعوت نامہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

بہرحال حضرت علامہ اقبالؒ کو بھی اسی غرض کے لیے کابل آنے کی دعوت دی گئی تھی کہ "زمیندار" یا بعض دوسرے اخباروں میں حکومتِ افغانستان کے خلاف جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کا سدِباب ہو۔ علامہ اقبال کی معیت میں جو دوسرے اصحاب کابل گئے تھے، ان میں سرسید احمد خاں مرحوم کے پوتے سر راس مسعود، سید سلیمان ندوی، علیگڑھ یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر ہادی حسن، لاہور کے بیرسٹر غلام رسول اور علامہ اقبال کے ذاتی ملازم علی بخش بھی شامل تھے، حکومتِ افغانستان نے انہیں دارالامان میں ٹھہرایا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی وہ پندرہ بیس دن تک افغانستان میں حکومت کے مہمان کی حیثیت سے سیر و سیاحت میں مصروف رہے، انہوں نے کابل کے کئی تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا جن میں مکتبِ حبیبیہ خاص طور قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے باغ بابر، چہل ستون، پغمان، استالف، گل بہار، بامیان، قندھار، غزنی، ہرات اور بعض دوسرے مقامات دیکھے، انہوں نے غزنی میں سلطان محمود غزنوی، باغ بابر میں شہنشاہ ظہیرالدین بابر، غزنی کے ایک نواحی گاؤں میں حکیم سنائی، ہرات میں شیخ عطار اور ملا عبدالرحمٰن جامی کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔

علامہ اقبالؒ اور ان کی پارٹی کے دوسرے زعما جب باغ بابر تشریف لے جا رہے تھے، فیض محمد خاں وزیر خارجہ، شاہی خاندان کے بعض ارکان، شعراء، ادباء اور چند صحافی بھی ان کی معیت میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ اقبال شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی قبر پر فاتحہ پڑھتے پڑھتے زار و قطار رو رہے تھے، ان کے اشکوں سے ان کا رومال بالکل تر ہو گیا تھا۔ جن اصحاب نے ان کی معیت میں غزنی اور ہرات کا سفر کیا تھا اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ علامہ اقبالؒ محمود غزنوی، شیخ عطار اور ملا جامی کے مزاروں پر بھی اشک بار ہوئے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے کابل پہنچنے کے بعد ملتِ افغانیہ کے نام ایک پیغام روزنامہ "اصلاح" میں شائع کرایا تھا جو ایک قطعہ تک محدود تھا، لیکن وہ ادبی لحاظ سے بہت سی صفات کا مجموعہ تھا۔ کابل کے شعراء اور ادباء اس سے بڑے متاثر ہوئے۔ تھے، میں اس وقت "اصلاح" ہی میں کام کرتا تھا، میں نے اپنے حافظے پر بڑا دباؤ ڈالا، مگر افسوس یہ قطعہ میری یاد سے محو ہو چکا ہے اور میں اسے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

کابل میں بہت سے وفدوں نے حضرت علامہؒ سے ملاقات کی تھی جن میں اساتذہ، تجار، علماء، شعراء، ادباء اور صحافیوں کے وفود شامل تھے۔ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے وفد میں انجمن ادبی کے ارکان، مجلہ کابل (انجمن ادبی کا ماہوار رسالہ) کے کارکن، روزنامہ اصلاح، ہفتہ وار انیس، پانزدہ[15] روزہ اقتصاد، جمعیۃ العلماء کے ہفتہ وار اخبار "حی علی الفلاح" کے ایڈیٹر اور کارکن صحافی شامل تھے، یہ وفد کوئی پینتیس چالیس ارکان پر مشتمل تھا، وفد کے ارکان فارسی میں اظہار خیال کرتے تھے اور علامہ اقبالؒ، سر راس مسعود اور غلام رسول بیرسٹر انگریزی میں اور سید سلیمان ندوی اردو میں جواب دے رہے تھے، ترجمانی کے فرائض راقم الحروف ادا کر رہا تھا۔ تبادلۂ خیال کے دوران سرور گویا، سرور جویا مستغنی نے علامہ صاحب کو مخاطب کر کے کہا "آپ فارسی نثر ہی میں نہیں بلکہ فارسی نظم میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہم نے اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، جاوید نامہ اور پیامِ مشرق سے اچھا خاصا استفادہ کیا ہے، ہم آپ کی خداداد ذہانت اور قابلیت کے معترف ہیں، طویل عرصے سے ہماری دلی خواہش تھی کہ آپ سے ہم ہمکلام ہونے کی سعادت حاصل کریں، اگر بے ادبی پر محمول نہ ہو تو ہمیں یہ سوال کرنے کی

اجازت دیں کہ آپ اتنی علمی و ادبی استطاعت رکھنے کے باوجود فارسی میں ہمارے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے اور انگریزی بولنے کا تکلف کیوں روا رکھتے ہیں۔

حضرت علامہ نے قہقہہ لگایا اور کہا میں فارسی لکھ سکتا ہوں مگر روانی کے ساتھ بول نہیں سکتا، لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں انگریزی میں جواب دیتا رہوں۔ اس جگہ یہ ذکر کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف علامہ اقبال کی انگریزی ہی کا ترجمہ کر رہا تھا وفد کے ارکان فارسی میں جو کچھ کہہ رہے تھے، علامہ اقبال اسے بخوبی سمجھ رہے تھے۔[۲]

حواشی

۱؎ مصنف کو زبردست مغالطہ ہوا ہے، علامہ کی متعدد سوانح اور خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان گئے تھے، وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۳ کو کابل پہنچے۔ علامہ ۲، ۳ نومبر کو کوئٹہ کے راستے واپس آ گئے، نادر شاہ کا انتقال ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو ہوا نہ کہ ۱۹۳۲ میں۔

علامہ کے سفرِ افغانستان کے متعلق ملاحظہ فرمائیے "سیرِ افغانستان" از سید سلیمان ندوی

۲؎ شائع شدہ روزنامہ "مشرق"، پشاور یکم فروری ۱۹۷۷ء

اقبالؔ

محمد اسدؔ

..... میں نے اوائل عمر ہی سے برّاعظمی اخبارات کے نامہ نگار کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، مشرقِ وسطیٰ کے طول و عرض میں برسوں کی سیاحت کے بعد بالآخر ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس تبدیلیٔ مذہب کے بعد تقریباً چھ سال عرب میں مقیم رہا اور سلطان ابن سعود کا تقرب حاصل رہا، عرب کو چھوڑ کر میں ہندوستان گیا اور وہاں عظیم مسلم مفکر و شاعر محمد اقبال سے نیاز حاصل ہوا، جن کو پاکستان کے تخیل کو روحانی بنیاد پر استوار کرنے میں سب پر سبقت حاصل ہے۔ موصوف ہی کے آمادہ کرنے پر میں جلد ہی مشرقی ترکستان، چین اور انڈونیشیا کے سفر کے اہتمام سے باز آیا اور ہندوستان میں رہ کر ریاستِ اسلامی کے فکری عناصر ترکیبی و مبادی کی وضاحت میں سعی و معاونت کرنے لگا، جسکے خدوخال موصوف کے ذہن میں ہنوز ایک خواب کی مانند مبہم و ناصاف تھے۔ تاہم میرے اور علامہ موصوف دونوں کے نزدیک یہ دھندلا سا خواب اس واحد راہ کی نشاندہی کرتا تھا جس پر گامزن ہو کر ہم اسلام کی خوابیدہ آرزوؤں کو بیدار کر سکتے تھے اور ایک ایسی سیاسی جماعت کی تخلیق و تشکیل کر سکتے تھے جس کے افراد کو نسل و نسب کے پیوند سے نہیں بلکہ نصب العین کی وحدت سے باہم منسلک و متحد کرنا ممکن ہوتا، اس منصوبے کی تکمیل کے لیے میں نے خود کو وقف کر دیا، اور سالہا سال مطالعہ اور تصنیف و تقریر میں لگا رہا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ مجھے اسلامی قانون اور ثقافت کی ایک شارح اور ترجمان کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

(طوفان سے ساحل تک صفحہ ۳۶-۳۷)

از محمد اسد
سابق یورپولڈوسس

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت

لدھیانوی
فیضؔ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد اُن کی محفل میں اُٹھنے بیٹھنے والوں نے مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ اب تک جاری ہے۔ راقم الحروف کا شمار بھی علامہ اقبالؒ کی زیارت کرنے والوں میں ہے اور یہ بات میرے لیے تو بے شک باعثِ فخر ہو سکتی ہے لیکن اس میں دوسروں کے لیے کوئی خاص بات دلچسپی کی نہ تھی، اس لیے اس مضمون کی تاخیر کا سبب بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

میرے پرانے وطن لدھیانہ سے علامہ اقبال کا خاص تعلق تھا، انہوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، اُن کی پہلی شادی اسی شہر میں ہوئی تھی[1] وہاں کی نولکھا فیملی کا نام شاید آپ نے سُن رکھا ہو۔ مسلمانوں کا یہ امیر ترین گھرانہ ہجرت کے بعد آجکل لاہور میں آباد ہے۔ مرحوم کی پہلی اہلیہ اسی نامور خاندان کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ علامہ اقبال جب کبھی اپنے سسرال کے ہاں لدھیانہ میں تشریف لاتے تو نولکھا گارڈن کی کوٹھی میں قیام فرماتے۔ اُس جگہ اُن سے ملنے کے لیے اکثر مقامی علم دوست حضرات جاتے اور اُن کی عالمانہ صحبت سے لطف اندوز ہوتے لیکن یہ باتیں میرے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے کی ہیں، اُن کی لدھیانہ والی بیگم کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا[2] اور میں ان دنوں اسلامیہ ہائی سکول لدھیانہ کی چوتھی جماعت کا طالبعلم تھا، یہ تاریخ میں نے علی الحساب علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل فارسی قطعہ سے اخذ کی ہے جو لدھیانہ کے بڑے قبرستان میں مرحومہ کی لوحِ مزار پہ کندہ تھا اور جسے ایک اطلاع کے مطابق مسمار کر دیا گیا

ہے، بہرحال اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

اَلْمَبْطُوْنُ شَہِیْدٌ

اے دریغا زمرگِ ہمسفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخنِ پاکِ مصطفےٰ آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بہ شہادت رسید و منزل کرد

اقبال ——— ۱۳۴۳ھ ۳

اس قطعہ کے علاوہ علامہ اقبال کا ایک اور قطعہ بھی ذوالفقار گنج لدھیانہ (المعروف سرائے نواب صاحب) کے بیرونی دروازہ پر منقوش ہے، اس عمارت کے بانی ان کے جگری دوست سر ذوالفقار علی خاں نواب آف مالیر کوٹلہ تھے، جن کا ذکر "بانگِ درا" کی ایک نظم میں بھی موجود ہے :-

؎ کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خاموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پر منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

پوری نظم کو یہاں نقل کرنا موضوع سے دور جانا ہے البتہ وہ قطعۂ تاریخ ملاحظہ فرمائیے جو اس سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی ہے ؎

بانیٔ ایں خوش بنا سر ذوالفقار
سالِ تعمیرش ز ہاتف خواستند
از فلک تاریخ چوں شبنم چکید
بر زمیں خُلدِ بریں آراستند

اقبال ——— ۱۳۴۰ھ ۴

اس قطعہ کا تیسرا مصرع نصب کردہ پتھر پر یوں درج کیا گیا ہے ؎

از فلک ایں مصرع چوں شبنم چکید

ظاہر ہے کہ لفظ مصرع کی عین خارج از تقطیع ہے، میں نے مولانا عبدالمجید سالک صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو انہوں نے لفظ تاریخ سے نہ صرف اس اعتراض کو دور کر دیا بلکہ مضمون کی وضاحت بھی فرما دی۔

دراصل اس قسم کے فنی نکات کا شعور بہت بعد کی بات ہے، البتہ علامہ اقبال کا کلام پڑھنے کی سعادت مجھے زمانہ طالبعلمی ہی میں حاصل ہو گئی تھی، ہر جماعت کے اردو نصاب میں اُن کی متعدد نظمیں شامل ہوتی تھیں، مثلاً "ایک مکڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "ایک گائے اور بکری" "ہمدردی" "ماں کا خواب" "پرندے کی فریاد" "ایک پرندہ اور جگنو" "ہندوستانی بچوں کا گیت" اور "ترانۂ ہندی" وغیرہ۔ علاوہ ازیں اسلامیہ ہائی سکول لدھیانہ میں صبح کے وقت اجتماعی طور پر علامہ کی یہ نظم پڑھی جاتی تھی ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

تعلیم کی منزلیں طے کرتا ہوا جب میں نویں اور دسویں جماعت میں پہنچا تو علامہ اقبالؒ کی حسب ذیل نظمیں اردو کورس میں پڑھنے اور سمجھنے کا اتفاق ہوا:۔

"ابرِ کوہسار" "ایک آرزو" "نیا شوالا" "داغ" "حقیقتِ حسن" اور "نانک" وغیرہ

اُس زمانہ میں لاہور کی ایک بک ایجنسی نے علامہ اقبالؒ کی بعض مشہور قومی نظمیں مثلاً "شکوہ" "جوابِ شکوہ" "نالۂ یتیم" "تصویرِ درد" اور "خضرِ راہ" نہایت خوشنما کتابچوں کی صورت میں شائع کی تھیں، جنہیں میں نے منشی افتخار الدین آفت لدھیانوی کی لائبریری میں یکے بعد دیگرے پڑھا اور اپنے پسندیدہ اشعار ایک بیاض میں نقل کیے، اپنے اس انتخاب کا کچھ حصہ مجھے اب تک زبانی یاد ہے۔ "بانگِ درا" کا نام بھی میرے کانوں میں پڑ چکا تھا جسے شائع ہوئے چند سال کی مدت گذری تھی، اُسے بھی میونسپل لائبریری لدھیانہ سے عاریتاً حاصل کر کے بقدرِ ذوق و فہم استفادہ کیا۔ اتنا کچھ پڑھ لینے اور اکابر لدھیانہ سے علامہ اقبال کی ذات کے متعلق بہت

سی شوق انگیز باتیں سُن لینے کے بعد میرے دل میں غائبانہ طور پر اُن کی محبت و عقیدت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے، لیکن اُن کی زیارت سے مشرف ہونے کا موقع اب تک نہیں ملا تھا۔

۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کشمیری کانفرنس کا انعقاد نہایت دھوم دھام سے بمقام لدھیانہ ہوا، یہ تاریخی اجلاس بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر تھا۔ اس میں پنڈت موتی لال نہرو، مولانا کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، ڈاکٹر کچلو، مولانا محمد دین فوق، مولانا سید حبیب جیسی نامور کشمیری ہستیوں نے شرکت فرمائی تھی۔ چونکہ علامہ اقبالؒ کا شمار بھی اہلِ خطہ حضرات میں ہوتا ہے، اِس لیے انہیں بھی اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پروگرام میں اُن کا اسمِ گرامی دیکھ کر لوگ جوق در جوق آئے، لیکن افسوس ہے کہ علامہ اقبال کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے، جب اُن کا ارسال کردہ پیغام اجلاس میں پڑھ کر سُنایا گیا تو اُن کو دیکھنے والوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ آخر ۱۹۳۳ء میں مجھے علامہ اقبال کی زیارت کا پہلی بار موقع ملا، جبکہ میں پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور میں منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا، انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے کی نہایت شان کے ساتھ پبلسٹی ہو رہی تھی۔ نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک بات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا کہ اس سال اتنی مُدت کے بعد علامہ اقبال بھی بنفسِ نفیس تشریف لائیں گے اور اُن کی موجودگی میں اُن کی ایک تازہ اُردو نظم فلاں صاحب ترنم سے پڑھیں گے۔

"بانگِ درا" کی اشاعت کے بعد یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ علامہ اقبال نے اُردو شاعری ترک کر دی ہے، اب یکایک اُن کی تازہ اردو نظم کا اعلان ہُوا تو شائقینِ ادب کی باچھیں کھِل گئیں، لیکن افسوس کہ علامہ اقبال اپنے گلے کی خرابی کے باعث خود نظم پڑھنے سے قاصر تھے ورنہ اُن کی پُرسوز آواز کی جتنی تعریف سُنی تھی اُسے بھی بہشتِ گوش بنانے کا موقع ملتا۔ تاہم میرا دل خوش تھا کہ عنقریب اُس نامور ہستی کا دیدار نصیب ہو گا جس کو دیکھنے کے لیے آنکھیں بہت دیر سے بیتاب ہیں۔ خدا خدا کر کے جلسے کی مقررہ تاریخ آئی، صبح دس بجے کی نشست میں علامہ اقبال کی نظم کا پروگرام تھا، میں نے بہت پہلے اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں جا کر عالیشان پنڈال کے اندر پہلی صف کی ایک کرسی سنبھال لی اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ داخلہ فری تھا،

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پنڈال بھر گیا اور جلسے کی ابتدائی کارروائی شروع ہوئی ، اتنے میں علامہ اقبالؒ کے آنے کی خبر گرم ہوئی ، جونہی اُن کی کار آگرہ کی نعروں سے فضا گونج اُٹھی ، خیر مقدم کے طور پر گولے چھوڑے گئے اور سارا مجمع احتراماً کھڑا ہو گیا ، علامہ اقبالؒ خراماں خراماں پنڈال میں داخل ہوئے اور سٹیج پر جا کر براجمان ہو گئے ، اُن کے بیٹھتے ہی سب لوگ بھی بیٹھ گئے ۔ جس وقت علامہ اقبالؒ تشریف لائے حضرت حفیظ جالندھری اپنی ایک تازہ نظم (تعلیم اور پردہ) ترنم سے سُنا رہے تھے ، مجمع کی ہلچل اور نعروں کا شور ختم ہُوا تو انہوں نے پھر اپنی نظم پڑھنی شروع کر دی ، اس نظم کا آخری مصرع یہ تھا ؏

میں بھی حاضر ہوں میرا اقبال بھی موجود ہے

ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ کی موجودگی نے اس مصرع میں جان ڈال دی تھی ، اگر وہ چند منٹ اور تشریف نہ لاتے تو حفیظ صاحب کی نظم کا خاتمہ ایسی برجستگی اور عمدگی کے ساتھ نہ ہوتا ۔ عام حاضرین کی طرح میری نظریں بھی علامہ اقبال کے چہرے پر گڑ رہی تھیں ، میں نے دیکھا کہ وہ حفیظ صاحب کے اس مصرع کو سُن کر قدرے متبسم ہوئے ۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر تلے چھڑی پر رکھے ہوئے نہایت تمکنت اور سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر تشریف فرما تھے ۔ اُن کا لباس اُس وقت یہ تھا : پاؤں میں سلیم شاہی جُوتی لٹھے کا سفید پاجامہ ، سیاہ کوٹ اور سر پر تُرکی ٹوپی ، داڑھی بالکل صاف تھی ، البتہ تراشیدہ مونچھیں اُن کے چہرے کی شان کو دوبالا کر رہی تھیں جیسا کہ عموماً اُن کی عکسی تصاویر میں نظر آتی ہیں ۔

راقم الحروف نے پچھلے دنوں ماہنامہ "نقوش" کا "شخصیت نمبر" پڑھ رہا تھا ۔ اُس میں مولانا گرامی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سٹیج پر نظم پڑھنے کے لیے رُونما ہوئے تو علامہ اقبالؒ نے اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا :۔

"لوگو! آج گرامی کو جی بھر کے دیکھ لو ، تمہاری آئندہ نسلیں اس بات پر فخر کریں گی کہ تم نے گرامی کو دیکھا تھا"۔۔۔۔۔

اب میں علامہ اقبالؒ کے متعلق اُن کے الفاظ میں تھوڑا سا تصرف کر کے کہتا ہوں کہ :۔

"لوگو! میں نے اور دوسرے خوش قسمت لوگوں نے جی بھر کر اقبال کو دیکھا ..... اور آج ہم اپنی آئندہ نسلوں کے روبرو اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اقبالؒ کو دیکھا تھا"۔.....

جس نوجوان نے علامہ اقبالؒ کی نظم پڑھنی تھی وہ ابھی نہیں آیا تھا اس لیے اُس کی تلاش شروع ہوئی، اس دوران میں ایک دو آوازیں آئیں کہ حفیظ صاحب علامہ اقبالؒ کی نظم پڑھ دیں۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اپنی کسرِ شان خیال کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خوش گلو نوجوان آگیا، اور اس نے مائیکروفون پر علامہ اقبالؒ کی تازہ اُردو نظم ترنم سے سُنانی شروع کی، میں ارادتاً گھر سے کاغذ پنسل ساتھ لے کر گیا تھا اِس لیے میں نے ہر مصرع مِن وعَن نقل کر لیا۔ یہ نظم عوام کی سمجھ سے بالا اور بہت گہرے رموز کی حامل تھی، اس وجہ سے مجمع میں قطعاً واہ واہ کا شور برپا نہیں ہوا تھا بلکہ تمام لوگ ازروئے احترام دم بخود بیٹھے رہے، انہیں مرعوب کرنے کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ علامہ اقبالؒ کی نظم پڑھی جا رہی ہے۔ البتہ اس شعر پر جو نظم کے آخری حصہ میں تھا، تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی تھی ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ ؐ

اب یہ نظم ضربِ کلیم میں شائع ہو چکی ہے، لیکن اُن دنوں سب سے پہلے میں نے اسے ماہنامہ "مسلمہ" جالندھر میں اپنے مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کرایا تھا۔

نظم ختم ہوئی تو علامہ اقبالؒ واپس تشریف لے گئے اور جلسہ بدستور جاری رہا۔

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں مجھے دوبارہ علامہ اقبالؒ کو بہت قریب سے دیکھنے، سلام کرنے اور اُن کی معمولی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا تھا، جس کا تفصیلی حال انشاء اللہ پھر کبھی قلمبند کروں گا ؎

حواشی

۱؎ یہ بات درست نہیں، علامہ اقبالؒ کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں گجرات کے خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی لڑکی کریم بی بی سے ہوئی جن کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

۲؎ فیضؔ صاحب نے قطعہ تاریخ وفات کی ہجری تاریخ سے سنہ عیسوی اخذ کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے، اُدھیا نے والی بیگم کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہُوا تھا نہ کہ ۱۹۲۳ء میں۔

۳؎ "سرودِ رفتہ" صـ۲۱۹

۴؎ "سرودِ رفتہ" صـ۲۱۵ ۔ عیسوی سنہ ۱۹۲۱ ہے۔

۵؎ یہ نظم اب "لا الہ الا اللہ" کے عنوان سے "کلیاتِ اقبال" صـ۴۷۷ پر موجود ہے۔

۶؎ شائع شدہ "عزمِ نو" گوجرانوالہ ۸ جنوری ۱۹۵۸ء

میری بڑی خواہش تھی کہ میں اقبالؒ کو ایسے عالم میں دیکھوں جبکہ وجدانِ شعر کی صورت اختیار کر رہا ہو۔ قائدِ ملت نے خود بیان کیا کہ ایک مرتبہ قیامِ لاہور کے دوران میری یہ تمنا پوری ہوئی، جبکہ میں صبح صبح شاعرِ مشرق کی قیام گاہ "جاوید منزل" پہنچ گیا ــــ حسبِ عادت اقبال شعر گوئی اور گنگنانے میں مصروف تھے۔ شاعرِ مشرق کے خادمِ خاص علی بخش مرحوم کی مدد سے میں اُن کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا، جب شاعرِ مشرق کی آہِ سحر خیزی کا سلسلہ ختم ہُوا تب کہیں میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

(نواب بہادر یار جنگ سے خلاصۂ مضمون "اقبال کا ایک شیدائی"
شعور حیدرآباد دکن، اقبال نمبر ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء)

اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ملاقات

ڈاکٹر ریاض الحسن

۱۹۳۵ء کی شروع گرمیاں تھیں کہ ہندوستان کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومتِ کینیڈا نے معاشیات یا سیاسیات میں تحقیقات کے لیے وزنٹ ماسی وظیفہ دو سال کے لیے دینے کا اعلان کیا میں نے اس کے لیے درخواست بھیج دی اور اپنے پروفیسروں سے مناسب سرٹیفکیٹ حاصل کرکے اس کی نقلیں اس درخواست کے ساتھ منسلک کر دیں، لیکن اس کے بعد مزید تفصیل حاصل کرنے کا خیال ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے لیے ایک کمیٹی بن گئی ہے اور منجملہ دیگر ممبروں کے دو کے نام معلوم ہو سکے یعنی مسٹر لیارام سیکرٹری وائی، ایم، سی، اے لاہور، اور جسٹس دلیپ سنگھ لاہور، چنانچہ میں نے ان دونوں حضرات سے ملنے کا ارادہ کیا تاکہ مزید تفصیلات معلوم کر سکوں، اس خیال سے الہ آباد سے روانہ ہونے سے قبل میں اصغر گونڈوی سے ملا اور ان سے اپنے لاہور جانے کا ذکر کیا، انہوں نے کہا کہ لاہور جاؤ تو اقبال سے ضرور ملو اور ساتھ ہی ایک تعارفی خط بھی دے دیا۔

میں ۲۳ یا ۲۴ مئی کو لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں نہ تو لیارام ہیں اور نہ جسٹس دلیپ سنگھ، پھر ۲۵ مئی کی شام کو میں اقبال کی کوٹھی واقع میکلوڈ روڈ پر گیا، میں اس وقت یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا اس سڑک کا صحیح نام یہی تھا یا کوئی اور، اس لیے کہ میرا حافظہ سڑکوں وغیرہ کے معاملہ میں بہت کچا ہے۔[1]

میں چہار دیواری کے اندر داخل ہوا تو سامنے چھوٹا سا میدان تھا، میدان کے آخر میں کوٹھی تھی، کوٹھی کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور برآمدے کے پیچھے اقبال کے ملنے کا کمرہ تھا۔ جب میں داخل ہوا تو میں نے ان کے ملازم علی بخش کو دیکھا، میں نے اصغر گونڈوی کا تعارفی خط

اس کے ہاتھ میں دیا اور انتظار کرنے لگا، تین چار منٹ کے بعد اُس نے آکر کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو اقبال ایک پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹے ہوئے تھے، میں نے السلام علیکم کہا تو انہوں نے جواب دے کر ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا میں قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ دو تین دن پہلے ان کی بیگم یعنی والدۂ جاوید کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے میں نے ان کی صرف خیریت دریافت کی اور ماتم پُرسی کی بابت کچھ نہ کہا۔ کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے میں نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے عالمگیر شہرت کا ناول "نوجوان ورتھر کی داستانِ غم" کا اُردو ترجمہ شائع کیا تھا اور اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کو بھیج چکا تھا، میں نے اس ترجمے کی بابت ان سے سوالات کیے تو جو کچھ انہوں نے کہا اُس کو میں اس ناول کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں بیان کر چکا ہوں اس لیے یہاں دوبارہ دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

اس کے بعد عالمِ اسلام کے موضوع پر ان سے دلچسپ گفتگو ہوئی، انہوں نے عالمِ اسلام کے درخشاں اور شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لاہور میں انگریزوں کے آنے سے قبل ایسے محلّے تھے جن میں وسط ایشیا، افغانستان اور ان کے باشندے مستقل حیثیت سے رہتے تھے اور ان میں ایسے بھی تھے جو تھوڑی مُدت کے لیے لاہور آتے تھے پھر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے لیکن انگریزوں نے ہندوستان میں ان قوموں کی آمد اور لاہور میں ان کے قیام کو رفتہ رفتہ کم کرنے کی پالیسی اختیار کی، اور اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ لاہور میں وسطِ ایشیا کا کوئی خاندان آباد نہیں ہے جس کا سلسلہ براہِ راست وسط ایشیا سے آمد و رفت کی بنا پر ہو، اس لیے ہندوستان کے مسلمان افغانوں، ایرانیوں اور ترکوں سے دور ہوتے گئے۔

اس کے بعد اقبال نے کہا لیکن اب ایسا زمانہ آ رہا ہے جب وہ مغربی قومیں جنہوں نے مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس پالیسی کو چھوڑنے پر سیاسی حالات کی بناء پر مجبور ہو جائیں گے اور ان قوموں کے درمیان رابطہ بڑھانے کی کوشش کریں گے، اس وقت مسلمانوں کے عالمی اتحاد کو منظم کرنے کا اچھا موقع ہوگا۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ وہ کیا سیاسی حالات ہوں گے جن پر مغربی اقوام اپنی قدیم معاندانہ پالیسی ترک کر دیں گی۔

اس پر ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ذرا زور پیدا ہو گیا اور وہ بولے کہ روس کا اشتراکی انقلاب مغربی اقوام کے لیے ایک بڑے خطرے کا حامل ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مغربی ممالک کو اُن مسلمان قوموں کے تعاون کی ضرورت ہوگی جو روس کی سرحد پر آباد ہیں، اس میں ترکی سے لے کر ہندوستان تک کے مسلمان ہوں گے، اس طرح مغربی ممالک مسلمان ملکوں میں ربط ضبط بڑھانے اور اُن کو ایک مُتحدہ مقصد کے لیے آپس میں مُتحد ہونے کی دعوت دیں گے۔

پھر میں نے سوال کیا کہ کیا ہندوستان کے مسلمان بھی اس اتحاد میں شریک ہوں گے کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اشتراکیت کا پرچار شروع ہو گیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ممکن ہے مسلمان اشتراکیت کے بعض اصول مان لیں مگر یہ تسلیم کر لینا وقتی ہوگا، کیونکہ مجموعی طور پر مسلمان اشتراکی طرزِ زندگی کو جس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے کبھی دل سے قبول نہیں کر سکتے۔ اشتراکیت کو مان لینے سے گویا وہ خود اپنی زندگی کی نفی کر دیں گے، اور جو قوم ایسا کرتی ہے وہ زندہ نہیں رہتی۔

پھر میں نے پوچھا کہ وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ روس کے اشتراکی دباؤ کی بناء پر شاید وہ اشتراکیت کے بعض اصول وقتی طور پر قبول کر لیں مگر اس کا سخت ردِ عمل ہوگا اور وہ بھی کوئی موقع پا کر اس اصول کو دریا بُرد کر دیں گے، پھر انہوں نے کہا کہ میں تصور نہیں کر سکتا کہ امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) اور دوسرے عظیم مسلمان مُفکرین کا ملک اپنی زندہ روایات کا مُنکر ہو جائے۔

پھر انہوں نے کہا کہ اگر ہندو مسلمان مسئلہ طے ہو جائے تو مجھے قوی امید ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے[۲]۔

حواشی

سلہ مڑکوں کے بارے میں ڈاکٹر ریاض الحسن نے اپنے حافظے کے بارے میں جو ارشاد کیا ہے درست ہے۔
جاوید اقبال کی والدہ کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ہوا تھا، علامہ اقبال ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء کو میکلوڈ روڈ سے اُٹھ کر جاوید منزل واقع میور روڈ (موجودہ علامہ اقبال روڈ) میں رہائش پذیر ہوئے تھے، جاوید اقبال کی والدہ کا انتقال اسی کوٹھی میں ہوا، لہٰذا موصوف نے علامہ سے جاوید منزل میں ملاقات کی تھی نہ کہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر۔

سلہ "ساغر"، کراچی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء

ایک دفعہ علامہ اقبال نے "بالِ جبریل" کے مقام کا خود تعین فرمایا تھا، موضع خدر خیل ضلع کوہاٹ کے ایک افغان رسالدار سجید گل سے علامہ اقبال کے انتہائی دوستانہ مراسم تھے۔ دورانِ گفتگو رسالدار صاحب نے علامہ صاحب سے دریافت کیا کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب کا نام "ضربِ کلیم" کیوں رکھا؟ آپ نے جواب میں فرمایا، خانصاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی ضرب اتنی کاری اور گہری تھی کہ ایک ہی ضرب سے فرعون غرقِ نیل ہو گیا۔ انشاء اللہ اس کتاب کا ایک ایک شعر ضربِ کاری ثابت ہوگا۔ اور جب رسالدار نے "بالِ جبریل" کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا "جبریل" فرشتہ جتنا اُونچا اُڑ سکتا ہے اتنا اور کوئی نہیں اُڑ سکتا، میرے یہ اشعار بھی فکر کے اعتبار سے جبریل جتنے بلند پرواز ہیں۔"

[شام و سحر: جون ۱۹۷۶ء: صفحہ ۲۴
مضمون: محمد اختر]

اِقبال علیہ رحمۃ اللہ

چند یادیں

ملک افتخار علی

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے علامہ اقبال کو قریب سے دیکھنے کے کئی مواقع ملے، میرے والدِ مرحوم ملک برکت علیؒ سے ان کے گہرے ذاتی مراسم تھے، ان کی دوستی اور رفاقت خاصی پرانی تھی، اور بیس سال کے طویل عرصہ تک وہ ایک دوسرے کے قریب رہے۔

میرے والد مرحوم اکثر شام کو ان سے ملنے جایا کرتے تھے اور خاص طور پر سیاسی امور پر ان سے تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے، ان کی اور علامہ اقبال کی سیاسی سوچ کی حدیں بہت حد تک ملتی تھیں۔

مجھے علامہ اقبال کو پہلی بار دیکھنے کا موقع غالباً ۱۹۳۵ء کے اوائل میں ملا، اُس وقت میں نویں جماعت کا طالبعلم تھا، میں اُس وقت اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، مجھے ان کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ جب ہم جاوید منزل میں داخل ہوئے تو علامہ ایک معمولی سی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور حقہ پی رہے تھے، ہمارے پہنچنے پر انہوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ دو کرسیاں لے آؤ، ہم کوئی ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے رہے۔

انہوں نے میرے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کیا اور میرے لیے خاص طور پر سیخ کباب کی ایک پلیٹ منگوائی، ان کے سر کے نیچے ایک معمولی سا تکیہ تھا اور چارپائی پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی، میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، اُس وقت ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک دمک تھی، جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان (ان کی وفات سے چند روز قبل) میں اُن کی خدمتِ اقدس میں پانچ یا چھ دفعہ حاضر ہوا، جب میرے والدِ مرحوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے لیے الیکشن

لڑ رہے تھے، تو میری ہمشیرہ بیمار تھیں، اس زمانے میں علامہ اقبال حکیم نابینا کے زیر علاج تھے، جو خاص طور پر علامہ اقبال کی تیمارداری کے لیے لاہور تشریف لائے تھے، مجھے جالندھر سے میرے والد مرحوم کا فون آیا کہ میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حکیم نابینا سے اپنی ہمشیرہ کی علالت کے سلسلے میں ایک رقعہ لے کر حکیم صاحب سے مشورہ کروں، جب میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تو وہ اپنے ڈرائینگ روم میں چند جرمن سکالرز سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، اُن کے ملازم نے میرے آنے کی اطلاع کی، تو وہ اپنی مصروفیت کے باوجود مجھے ملنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں تشریف لائے، جب میں نے اپنا مقصد بیان کیا، تو پہلے تو انہوں نے میری ہمشیرہ کی صحت کے لیے دعا کی اور پھر حکیم نابینا کو رقعہ لکھا کہ وہ مہربانی فرما کر میری ہمشیرہ کا معائنہ کریں اور کوئی علاج تجویز فرمائیں۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب میرے والد مرحوم الیکشن کی تگ و دو کے بعد لاہور پہنچے تو اس دن ووٹوں کی گنتی ہونی تھی، میرے والد خاصے پریشان تھے کہ الیکشن کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس پریشانی کے عالم میں پیر تاج الدین مرحوم ہمارے گھر آئے اور میرے والد کی پریشانی کو دیکھ کر انہوں نے مشورہ دیا کہ علامہ صاحب کے پاس جا کر پریشانی کو دور کیا جائے۔ چنانچہ میرے والد نے میرے بھائی کو جالندھر میں فون پر مطلع کیا کہ جو نتیجہ بھی نکلے اس کی اطلاع علامہ صاحب کے فون پر دی جائے۔

جب ہم علامہ صاحب کے ہاں پہنچے اور علامہ صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے والد مرحوم پیر تاج الدین کے ہمراہ آئے ہیں تو وہ باہر تشریف لائے، اور فرمایا ملک صاحب! مبارک ہو آپ کامیاب ہو گئے ہیں، میرے والد صاحب نے عرض کیا نتیجے کا پتہ تو شام کو لگے گا، لیکن علامہ صاحب نے پورے اعتماد کے ساتھ کامیابی پر ملک صاحب کو مبارکباد دی اور فرمایا کہ آپ کامیاب ہو گئے ہیں، اس وقت اُن کی آنکھوں میں خوشی سے ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اس کو کرامت کہہ لیجئے کہ شام کو فون پر اطلاع ملی کہ میرے والد مرحوم الیکشن میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

غالباً سنہ ۱۹۳۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو علامہ اقبال کی عیادت کے لیے ان کے ہاں پہنچے، اُس وقت وہاں کوئی موجود نہیں تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد علامہ اقبال نے میرے والد مرحوم کو بتایا کہ انہوں نے پنڈت نہرو سے کیا گفتگو کی ہے، اُس وقت پنڈت نہرو سوشلزم کا پرچار کر رہے تھے، علامہ صاحب نے ان سے سوال کیا کہ کانگرس یا مسلم لیڈروں میں کتنے لوگ ان کے ہمخیال ہیں، پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ

ایسے اشخاص بہت کم ہیں۔ اس جواب پر علامہ صاحب نے فرمایا کہ گنتی کے چند اشخاص کی خاطر وہ مسلمانوں کو کس طرح سے یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ پنڈت نہرو کی قیادت کو قبول کریں، انہوں نے پنڈت نہرو کو برملا الفاظ میں بتلایا کہ ہندو قوم کے عزائم یہ ہیں کہ مسلمانوں کو بحیثیت قوم سیاسی آزادی سے محروم رکھا جائے اور مسلمان ہندوؤں کے تابع ہو جائیں۔ علامہ صاحب نے پنڈت نہرو کو صاف الفاظ میں واضح کر دیا کہ وہ معدودے چند اشخاص کی خاطر آٹھ یا نو کروڑ مسلمانوں کے مفاد کو قربان نہیں کر سکتے، انہوں نے پنڈت نہرو کو یقین دلایا کہ اگر ہندوؤں کی اکثریت ان کی ہم خیال ہوتی تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار تھے کہ وہ پنڈت نہرو کے ہاتھ مضبوط کریں، لیکن ہندو قوم مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی سیاسی آزادی کے لیے علیحدہ جدوجہد کریں اور ہندو سرمایہ داروں اور انگریزی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کریں جو بعد میں قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کی شکل میں قائم ہوئی اور جس کی بدولت مسلمانانِ ہند کو ایک علیحدہ مملکت نصیب ہوئی، اس طرح سے علامہ کے دیرینہ خواب کو قائداعظم نے اپنی انتھک کوشش سے پورا کر دیا اور یہ خواب اب حقیقت بن کر اقوامِ عالم کے سامنے آیا، اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھے اور پاکستان پھر ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

علامہ اقبال کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی، جب بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمڈ آتا تھا، رسولِ پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکر سے ان کا جسم کانپنے لگتا تھا اور ان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔

علامہ اقبال ان چند ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھی تھی، ان کی دوربین نگاہوں نے ۱۹۳۰ء میں ہی دیکھ لیا تھا کہ برصغیر ہندوستان کا سیاسی حل صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی علیحدہ مملکت ہو جہاں وہ اپنی زندگی اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق بسر کر سکیں۔

علامہ اقبال اس بات پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کو صرف قائداعظم محمد علی جناح ہی غلامی کی زنجیروں سے نجات دلا سکتے ہیں، چنانچہ ایک مراسلہ میں وہ قائداعظم کو لکھتے ہیں، یہ خط انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کو روانہ کیا تھا کہ آپ ہی وہ واحد شخص ہیں جو مسلمانانِ ہند کی صحیح راہنمائی

کرسکتے ہیں اور ان کو اس طوفان سے بچا سکتے ہیں جو ان کے گرد منڈلا رہا ہے، چنانچہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں طلب کیا جائے تاکہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل کے متعلق غور و خوض کیا جائے۔

میں نے علامہ اقبال کو آخری بار اُس وقت دیکھا جب وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے میں کوئی آدھ گھنٹہ ان کی نعش کے قریب بیٹھا رہا، ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مجھے ان کا وہ شعر یاد آ رہا تھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

علامہ اقبال ایک مردِ درویش تھے انہوں نے مسلمانانِ ہند کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ اُن کو یہ احساس دلایا کہ وہ ایک علیحدہ ملت ہیں اور ان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی نجات کا صرف ایک ہی حل ہے کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت قائم کریں جس مملکت کی بنیاد اسلام کی شاندار روایات اور اقدار پر استوار کی جائے، انہوں نے سچ فرمایا ہے ؎

سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

حواشی

۱؎ ملک برکت علی شروع سے لے کر آخر تک علامہ کی پالیسیوں کی حمایت کرتے رہے وہ اقبال کے دستِ راست رہے، ۱۹۱۱ء میں پیر تاج الدین کے ساتھ مل کر "آزاد لیگ" قائم کی، ۱۹۳۱ء میں کشمیر کے مظلومین کے لیے جو کمیٹی بنی، آپ اس کے سیکرٹری رہے، ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے انتخاب میں جیتنے والے واحد دو مسلمان ممبروں میں سے ایک آپ بھی تھے۔

۲؎ پیر تاج الدین سرگرم سیاسی کارکن تھے، پہلے کچھ عرصہ بندوبست کے محکمے میں نائب تحصیلدار رہے اور اسی

ضمن میں امرتسر میں بھی کچھ وقت گذارہ، پھر ایل ایل بی کرکے وکالت کے پیشے سے منسلک ہوگئے۔

۳؎ یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی، پنڈت نہرو ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹرایٹ لاء کے مقدمہ "ازالہ حیثیت عرفی" کے استغاثے کی شہادت دینے لاہور آئے تھے اور میاں افتخارالدین کے ہاں ٹھہرے تھے، اس ملاقات کے دوران میاں افتخارالدین اور راجہ حسن اختر بھی علامہ اقبال کے پاس موجود تھے۔

(بحوالہ ھما اردو ڈائجسٹ، اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۷۶ء)

۴؎ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کا یہ خط خطوطِ اقبال بنام جناح میں شامل ہے۔

۵؎ روزنامہ نوائے وقت ۹ نومبر ۱۹۷۹ء

◎ ◎ ◎

اقبالؒ کے ایک دوست مشہور ایڈووکیٹ تھے، فارسی میں ایک غزل کہہ کر لائے، زمین تھی ؎

زخ بالائے کہ ارزانی ہنوز

ایڈووکیٹ صاحب کے پاؤں میں لنگ تھا، اس کی رعایت سے اقبال نے برجستہ داد دی ؎

گرچہ در قانون فلک پیما شدی
بر زمینِ شعر لنگانی ہنوز

(تحریر: عرش ملیانی، بروایت پنڈت ہرچند اختر)

مطبوعہ چٹان ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء

وضع سادہ

ڈاکٹر السعد مسعود

حضرت علامہ اقبال کے جوانی کے دور کا تو مجھے علم نہیں البتہ جاوید منزل میں رہائش کا تھوڑا سا زمانہ یاد ہے، بچپن میں مجھے دنیا کی اس قابلِ فخر ہستی کے پڑوس میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔ جاوید منزل کے سامنے سے گذرنا سکول کے زمانہ کا معمول تھا، آج سے پچیس سال پہلے ساتویں آٹھویں جماعت کے طالبعلم کا ذہنی شعور کیا ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ تو اس وقت مشکل ہے، البتہ مجھے ایک دو باتیں ابھی تک یاد ہیں۔ ان میں علامہ مرحوم کا لباس بھی ہے میں نے علامہ مرحوم کو سفید قمیص، سفید شلوار، کالی ٹوپی اور کالے جوتے میں نہایت سادگی کے ساتھ ملبوس دیکھا ہے، ان کا سفید و شفاف رنگ تو خدا کی طرف سے انہیں ظاہری حسن کے طور پر عطیہ تھا مگر اس پر انہوں نے سادہ طرزِ زندگی اختیار کر کے خداداد حسن میں اور بھی اضافہ کر لیا تھا۔

علامہ مرحوم کی زندگی کے متعلق کچھ روز ہوئے ایک دوست سے باتیں ہو رہی تھیں، یہ دوست ملک عبدالحی ہیں اور بچپن میں جاوید اقبال کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ میں نے علامہ مرحوم کے بستر کے متعلق دریافت کیا تو کہنے لگے کہ ان کے کمرے میں داخل ہونے کی جرأت تو خاص خاص آدمیوں کو ہوتی تھی، البتہ ایک دفعہ گھر میں ان کی رضائی کے متعلق بات ہوئی تھی۔ علامہ مرحوم رضائی کا استر کھدر کا لگواتے تھے۔ ایک بار گھر میں کسی نے کہا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے آدمی آتے ہیں، مناسب ہوگا کہ استر کسی نفیس کپڑے کا لگا دیا جائے، جواب میں فرمایا مجھے لوگوں سے کیا غرض مجھے تو اپنا آرام و آسائش دیکھنا ہے۔ اس کے بعد ان کی رضائی کا استر کھدر کا ہی رہنے دیا گیا۔

سادگی کے متعلق ایک اور واقعہ ملک عبدالحی صاحب نے بیان کیا کہ ایک دن گھر میں کسی بچی کے سر کے بال وقت کے تقاضے کے مطابق بنے ہوئے دیکھے، حضرت علامہ نے فرمایا یہ طرز اچھی نہیں البتہ سادہ مینڈھیوں والا پرانا طریقہ بہت ہی اچھا ہے۔ ایک دن منہ ہاتھ دھوچکے تو گھر میں کسی نے کہا کہ آپ نے صابون سے منہ نہیں دھویا، جواب میں فرمایا جو پہلے ہی حسین ہوں انہیں صابون کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ یہ جواب بھی اسی قسم کا ہے جو علامہ مرحوم نے ایک دفعہ اپنے اُستادِ مکرم کو دیا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ جماعت میں دیر سے آئے تھے، استاد نے پوچھا: "اقبال دیر سے کیوں آئے ہو؟" جواب دیا "اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے"۔

(نوائے وقت، ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

شاعر ہر وقت شاعر نہیں ہوتا البتہ عالمِ خیال میں اس کا گذر ہر وقت رہتا ہے اور اس وجہ سے اُس سے بعض اوقات عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق ایک واقعہ ہے کہ وہ ایک رات اسی عالم میں باہر سے تشریف لائے اور راستہ میں سوچتے آئے کہ جاتے ہی ہاتھ کی چھڑی ایک کونے میں رکھوں گا، خود چارپائی پر لیٹ جاؤں گا، چونکہ آپ اپنے خیال میں محو تھے اور یہ بھی خیال تھا کہ جاتے ہی چھڑی ایک کونے میں رکھ کر خود چارپائی پر لیٹ جاؤں گا، مگر جونہی آپ کمرے میں داخل ہوئے چھڑی کو تو چارپائی پر دراز کر دیا اور خود کونے میں کھڑے ہو گئے — اتنے میں ڈاکٹر مرحوم کو بھی اپنی بدحواسی کا خیال آیا تو بہت شرمندہ ہوئے۔

(زندگی کے لطیف حادثات از جانباز مرزا صـ ۱۶)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

کے ساتھ چند لمحے

محمد الیاس

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی موت مشرق کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے، اور ایسی ہستیاں جن کے دل میں وطن کا درد ہوتا ہے ضرور اپنی جدائی سے اہلِ وطن کو رنج والم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یقیناً اقبال اپنے اہلِ وطن اور خصوصاً اپنی قوم کی ترقی و بیداری کا آرزومند مشرق کا یہ مایۂ ناز شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا فلسفی، سیاست داں اور ہادیٔ قوم بھی تھا۔ عام شاعری اس پر اپنا رنگ نہ جما سکی بلکہ شاعر ہی کو اس نے اپنے رنگ میں رنگا اور اس کے ذریعے سے مقتضائے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اہلِ ملک کو ترقی اور بیداری کا سبق دیا، اس شاعر کی آہ اور واہ ہماری زبوں حالی کا مرثیہ اور ہماری عظمتِ گذشتہ کی تصویر تھی اور اس کی آرزو ہماری امیدِ تحقق۔ اقبال کا پیام صرف مسلمانوں یا ہندوستانیوں سے مخصوص نہ تھا، بلکہ دنیا میں جہاں کہیں غلام قوم آباد ہے وہ مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ اقبال کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔

میں اس وقت اس مختصر سی گفتگو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دو سال قبل کشمیر جاتے ہوئے اس شاعرِ اعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے پر ہوئی۔ عجب اتفاق کہ اول مئی اور لاہور کی گرمی کے تقریباً بارہ بجے تھے کہ میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ اقبال کی قیام گاہ "جاوید منزل" پہنچا۔ گو وقت ایسا غیر موزوں تھا لیکن اطلاع ملتے ہی فوراً اپنی آرام گاہ میں آنے کی ہم کو اجازت دے دی، برآمدے میں سے گذر کر ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت مشرق کا یہ شاعرِ اعظم پلنگ پر تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز لیٹا ہوا تھا، صرف تہمد اور کرتہ زیبِ بدن تھا، ہاتھ میں حقے کی نلی تھی، اور ایک صاحب سامنے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے، کچھ نوٹ کرایا جا رہا

تھا۔ ہماری جانب پشت تھی لیکن جونہی ہم داخل ہوئے ہماری طرف مڑکر سلام لیتے اور مصافحہ کرتے ہوئے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، اقبال کی علالت کا خیال کرکے جس کی وجہ سے شرفِ نیاز حاصل ہونے میں بھی ہم کو شک تھا، ہم لوگوں نے مشورہ کر لیا تھا کہ بہت ہی کم بات کریں گے غرض گفتگو کا آغاز اسی ممتاز ہستی پر چھوڑا۔ سر اقبال نے ٹھہر ٹھہر کر اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے گفتگو فرمائی اور بات کرتے وقت سانس کی آواز زور سے آرہی تھی، گفتگو کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں کی، زیادہ تر انگریزی ہی میں گفتگو رہی۔ سر اقبال نے ہماری آمد کی وجہ دریافت کی، اور جب ہم نے اپنا کشمیر کا قصد بتلایا تو فرمانے لگے کہ جہاں تم جا رہے ہو وہ اصل کشمیر نہیں میں بھی اصل کشمیر نہ دیکھ سکا۔ کشمیر ان اندرونی مقامات میں واقع ہے جن کا راستہ دشوار گذار اور اکثر برف سے بند رہتا ہے۔ گویا سر اقبال نے وادی کشمیر کو جس میں سری نگر آباد ہے یا خاص کر سری نگر کو اصل کشمیر قرار نہ دیا بلکہ اصل کشمیر وہ جنت نظیر مقامات ہیں جہاں کا راستہ صرف چند روز کے لیے کھلا رہتا ہے، اور جہاں جانے کی شاعر کو آرزو رہی۔ اس کے بعد دردمندِ قوم نے ہماری پستی اور زبوں حالی کا مرثیہ چھیڑا اور ہماری ترقی کی فی الحال بہت کم امید ظاہر کی۔ جب ہم نے یورپ کے موجودہ مسلمانوں کا ذکر کیا تو ارشاد ہوا کہ ان کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، اکثر بلائے نام ہیں اور حقیقی جوش ان میں مفقود ہے، ہندوستان کے متعلق فرمایا کہ یہاں کی حالت عیاں ہے، سلطان ٹیپو کے زمانے میں مسلمانوں کی امیدیں دکن سے وابستہ تھیں، اب شمالی ہند سے وابستہ ہیں۔ اس سے سر اقبال کا مطلب یہ نہ تھا کہ خدانخواستہ دکن کے مسلمان راہِ ترقی میں پیچھے ہیں بلکہ مراد یہ تھی کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کی امیدیں دکن سے وابستہ تھیں اور جب سلطان ٹیپو کا خاتمہ ہوا تو وہ امید باقی نہ رہی، اب کہ انگریزی حکومت ہے اور جمہوریت کا آغاز اور چونکہ مسلمانوں کی اکثریت شمالی ہند میں ہے اس صورت میں اس قسم کی امیدیں بھی وہیں سے وابستہ ہیں۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت خراب ہے، شمالی ہند کے امراء اور شرفاء کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اکثر حیدرآباد کے امراء و شرفاء کو عیش پرستی نے برباد کیا"۔ یہ کہہ کر سر اقبال نے میری طرف دیکھا، اس میں شک نہیں کہ یہ حیدرآباد پر حملہ تھا لیکن کچھ صداقت پر بھی مبنی تھا۔ میں نے کہا کہ اس کا اطلاق سب پر نہیں ہو سکتا، اور یوں تو دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں

جہاں اس قسم کی بدعنوانیاں نہ ہوں، تو اقبال سرحدی نے مسکراتے ہوئے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے، لیکن حیدرآباد اس کے لیے بدنام ضرور ہے"۔ اس قسم کی گفتگو سر اقبال نے اس وجہ سے فرمائی کہ ہم سب مسلمان تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کی عظیم المرتبت شاعر کو بے چینی سے آرزو تھی۔ اس کے بعد ہم نے وفاق کا مسئلہ چھیڑا۔ "یہ وہ پیچیدہ مسئلہ ہے جو حل ہونے کا نام نہیں لیتا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کب اور کس شکل میں حل ہوگا"۔ سر اقبال وفاق کی موجودہ صورت کے بالکل خلاف تھے، ان کی رائے میں ہندوستان کی تین حصوں میں تقسیم ہونی چاہیئے تھی یعنی دیسی ریاستیں، ہندو اور مسلم۔ ہم نے اس کے امکانات پر سوال کیا تو فرمانے لگے کہ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے اور اب کہ انڈیا ایکٹ پاس ہو چکا ہے، اس پر بحث کرنی بیکار ہے۔ ان دنوں شہید گنج کا مسئلہ تازہ تھا اور مسٹر جناح کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر سمجھوتے کے لیے مقرر کیا تھا، اس کے متعلق دریافت کرنے پر فرمایا کہ تفصیل اور واقعات تو تم نے اخبارات میں دیکھے ہوں گے، مسٹر جناح ایک شریف انسان ہیں، ان میں لیڈر ہونے کی پوری قابلیت موجود ہے اور مجھ کو ان پر کامل اعتماد ہے۔ یہ دو برس پہلے کی بات ہے اور اس کے بعد مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر اور بلا اختلاف مسلمانوں کے لیڈر بنے۔ میں نے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا کیونکہ اب پھر سر اقبال نے تکیے کو مسکا دے دیا تھا۔ میرے دوستوں نے اپنی اپنی آٹوگراف بک پیش کی، سر اقبال نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ میرا دستخط اسلام کے خلاف ہے، مسلمانوں کو اس قسم کا شوق نہ رکھنا چاہیئے، اپنے دستخط کیے۔ سر اقبال کا یہ فرمانا میرے موافق ہوا، کیونکہ نہ تو میرے پاس اس وقت آٹوگراف بک تھی اور نہ مجھے اس کا شوق، جب میری طرف کتاب کیلئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا "آپ کی ہدایت پر میں پہلے ہی سے عمل پیرا ہوں" تو مسکرانے لگے، اس کے بعد مصافحہ کر کے ہم خوش خوش اقبال سے رخصت ہوئے۔ یہ ایک اتفاقی ملاقات کی سرسری گفتگو تھی جو مختلف موضوعات پر رہی۔ تفصیل سے اقبال عمر بھر کہتے رہے۔ ان کا کلام ہمیشہ کیلئے جب تک اردو فارسی زندہ ہے زندہ رہے گا۔ اس پہلی اور آخری ملاقات کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اس وقت کی پوری تصویر میری نظر کے سامنے ہے، گفتگو اور طرز گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ قوم کا درد اس قومی شاعر کے قلب میں حقیقی طور پر جاگزیں ہے، اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ہم کو وہ درجہ نصیب کرے جس کی مرحوم کو آرزو رہی ہے۔[1]

حواشی:- [1] سب رس جون ۱۹۳۸ء، دسمبر ۱۹۷۷ء

کشمیر اور ڈاکٹر اقبال

شیخ محمد عبداللہ

میرے ذہن میں اقبال کی ذات اور حیات سے وابستہ وہ تمام یادیں تازہ ہو رہی ہیں جن پر گردشِ ایام نے گرد جما کر انہیں دھندلا کر دیا تھا۔ پینتیس برس قبل، اپنی موت سے دو ماہ پہلے انہوں نے لاہور میں اپنی قیام گاہ پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سال ضرور کشمیر تشریف لائیں گے اور ہم نے اُن کی آمد، اُن کے استقبال اور اُن کے قیام کے لیے تمام انتظام مکمل کر لیے تھے لیکن موت نے انہیں اپنا وعدہ نبھانے کی فرصت نہیں دی اور ہم اُن کی راہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

اقبال کو ساری دُنیا ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم تر فلسفی کی حیثیت سے جانتی ہے، وہ اپنے آہنگ، اپنے لب و لہجہ اور اپنی آواز کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ان کے عقیدتمند اور نکتہ چیں دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ اقبال اپنے فن اور عظیم ترین اندازِ فکر کے اعتبار سے ایک عہد آفریں شاعر اور مفکر تھے۔ ان کی عزت، عظمت اور شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ساری دنیا کی میراث ہے، وہ تمام عالمِ انسانیت کے شاعر، ہمدرد اور بہی خواہ تھے اور اسلئے اُن کی شاعری اور شخصیت کو جغرافیہ کے قید خانوں میں محبوس نہیں کیا جا سکتا، وہ ساری دنیا کی میراث ہیں اور اُن پر ساری دنیا کا حق ہے لیکن مجھے اس خود غرضی کے لیے معاف کیجئے کہ میں اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفے پر ساری دُنیا کا حق تسلیم کرنے کے باوجود ان کی ذات پر کشمیر کے حق کو فائق، اوّل اور افضل سمجھتا ہوں، صرف اس لیے نہیں کہ علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا اور انہوں نے اپنے کشمیری نژاد ہونے پر فخر کیا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کشمیر کے سچے عاشق، اہل کشمیر کے سچے دوست اور ہمدرد، ان کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار، ان کی غریبی اور غلامی کے ماتم گسار اور

مطلق العنانیت کے خلاف ہماری جدوجہد میں ہمارے شریکِ کار تھے۔

اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی، اس وقت میں اسلامیہ کالج لاہور میں بی ایس سی (B.Sc) کا طالبعلم تھا اور میرے ذہن میں ابھی کشمیر کی آزادی اور مستقبل کا کوئی واضح تصور بھی نہ تھا۔ لیکن اقبال نے کشمیر کے درد کو محسوس کر کے اس کی تقدیر بدل جانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ کشمیری زبان کے مشہور شاعر غلام احمد مہجور کے نام ان کا ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کا لکھا ہوا ایک خط اس قابل ہے کہ اسے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کروں۔ مہجور صاحب کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھ رہے ہیں۔ میں کئی سال سے اس کے لیے تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے توجہ نہ کی، اللہ آپ کے ارادوں میں برکت دے، افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا، اس تباہی کا باعث زیادہ تر غیروں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپرواہی، نیز اہالیانِ کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیمیافتہ اب بھی موجود، لٹریچر کی تلاش کے لیے ایک سوسائٹی بنائیں"

اور خط کے آخر کی یہ سطور قابل غور ہیں :-

"میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے"۔ [۱۵]

اس خط کے ایک ایک لفظ سے دلسوزی، دردمندی اور رغبت کا وہ شدید جذبہ نمایاں ہے جو اقبال کی شخصیت اور شاعری دونوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں تحریکِ حریت کے آغاز میں میں نے کلامِ اقبال سے بھرپور استفادہ کر کے ایک غلام قوم کا لہو گرمایا تھا۔ میں اپنی تقریروں میں اقبال کے حیات آفریں اور روح پرور اشعار کا بکثرت استعمال کرتا تھا اور غلامی سے اس حوصلہ شکن اور مایوس کن دور میں سننے والوں کے دلوں میں آزادی اور انقلاب کی لہریں اٹھتی تھیں۔ اس موقعے پر کشمیر کی تاریخ اور تقدیر کے متعلق اقبال کے چند ایسے اشعار مجھے یاد آ رہے ہیں جن سے اس زمانے میں ہم نے خوابیدہ احساس کو جگانے کا کام لیا ہے ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ دردناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی!
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چربہ دست و تر دماغ[۲]
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر[۳]

●

جس خاک کے خمیر میں آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند[۴]

●

سرمائی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جن کا امیروں کو دوشالہ[۵]

●

توڑ اس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا![۶]

کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اقبال اس سے براہِ راست وابستہ ہو گئے۔ کشمیر کمیٹی کے نام سے اس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے جو کمیٹی بنی اقبال اس کے سرگرم رکن تھے، بعد میں وہ اس کمیٹی کے صدر بن گئے[۷]۔۔۔ اور ہمارا ان کے ساتھ گہرا رابطہ قائم ہوا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے سیاست دان نہیں، لیکن آزادی کی تحریک کو چلانے کے سلسلے میں انہوں نے ہمیشہ ہماری صحیح رہنمائی کی اور وقتاً فوقتاً ہمیں مشورے دیتے رہے، اقبال پر فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا الزام لگانے والے تنگ نظروں کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ میں نے سیکولرازم اور نیشنلزم کا پہلا سبق اقبال سے ہی لیا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ میں اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کشمیر کی سیاست کے متعلق تبادلۂ خیال ہو رہا تھا تو انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ غیر مسلموں

کو بھی اپنی تحریک میں شامل کیجئے اس سے آپ کے کاز کو تقویت ملے گی، میں نے کہا کہ ہم کوشش تو کر رہے ہیں لیکن غیر مسلم ساتھ نہیں دیتے، تو اقبال نے جواب دیا آپ اپنی کوشش جاری رکھئے۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے لیے جہاں اور بھی کئی وجوہات اور محرکات تھے وہاں اقبال کے مشورے کا بھی اس میں بڑا عمل دخل تھا، وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک کشمیر کے مسائل سے دلچسپی لیتے رہے اور اگر ان کی صحت نے اجازت دی ہوتی تو وہ یہاں آکر کئی مہینے قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ان کی شاعری میں ساری دنیا کا دکھ اور درد سمٹ آیا ہے لیکن کشمیر کی تباہی اور اہل کشمیر کی بے عملی انہیں خاص طور سے بے چین اور بے قرار رکھتی تھی ؎

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشناسے، ز خود شرمسارے
بہ ریشم قبا خواجہ از محنتِ او!
نصیبِ تنش جامۂ تارتارے
ازاں مے فشاں قطرۂ برکشیری
کہ خاکسترش آفریند بہارے

یہ اسی مردِ مومن کی دعاؤں کا اعجاز تھا کہ ۱۹۳۱ء میں یہ بے دست و پا قوم مطلق العنانیت اور استبداد کی آہنی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرانے پر آمادہ ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آزادی کی شمع شہیدوں کے لہو سے کچھ اس طرح روشن ہونے لگی کہ صدیوں کا اندھیرا مٹ گیا اور ہم نے ۱۹۴۶ء میں اس رسوائے زمانہ بیعنامہ امرتسر کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو چیلنج کیا جس پر کشمیر کے عاشق اور ثنا خواں اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ میں احتجاج کیا تھا ؎

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی — حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند — قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اقبال کو پاکستان اور صرف مسلمانوں کا شاعر کہہ کر اقبال کے عقیدتمندوں اور ان کے دشمنوں نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، وقت آگیا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے۔
میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اقبال کے نادان دوستوں اور جاہل دشمنوں دونوں کو اقبال کی صحیح عظمت جاننے اور ان کی قدر و قیمت پہچاننے کا سلیقہ اور حوصلہ عطا کرے۔

حواشی

۱ "اقبالنامہ" اوّل ص۵۸ ، انوار اقبال ص۷

انوار اقبال میں یہ خط منشی محمد دین فوقؔ کے نام منسوب کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ تاہم غلام احمد مہجورؔ تذکرہ شعرائے کشمیر نہ لکھ سکے اور یہ کام فوقؔ ہی نے مکمل کیا۔ اس خط کی تاریخ شیخ عبداللہ نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء لکھی ہے جو درست نہیں، یہ خط ۱۹۲۲ء میں لکھا گیا تھا۔

۲ کلیاتِ اقبال ص۶۷۸ ——— دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ دراصل یوں ہے ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوزناک

۳ کلیات اقبال ص۶۷۹ ——— پہلے مصرعہ میں "ہو" کے بجائے "ہے" ہونا چاہیئے۔

۴ کلیات اقبال ص۶۷۵ ——— پہلے مصرعہ میں "سرمائی" درست نہیں "سرماکی" درست الفاظ ہیں۔

۵ متروک کلام، مشمولہ سرودِ رفتہ ص۲۲۶

۶ اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیے "حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں" مرتبہ عبداللہ قریشی ص۳۳

۷ ہما اردو ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۷۶ء

اقبالؒ سے میری پہلی ملاقات

ابو محمد مصلح

مدارس کے علمی سفر سے واپسی پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے چند روز حیدرآباد میں بھی ٹھہرے۔ میں تحریک قرآن کے سلسلے میں نواب نذیر جنگ بہادر کے ہمراہ ملنے گیا۔ تعارف کے بعد تحریک قرآن کا اولین مقصد قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطلب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا گیا۔ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ اقبال نے اپنے خاص انداز میں کہا:

"مولوی صاحب! آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر پہلے یہ تو بتایئے کہ قرآن پڑھائے گا کون؟ مجمع ہمہ تن گوش بن گیا۔ اور مجھ کمبل بدوش، کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی معاصر نہ تھا اور نہ کسی معمولی شخص کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے جس دن یہ کمی پوری ہوئی سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر آپ مجھے قرآن قرآن کرنے دیجئے۔ کیونکہ آپ کے حسبِ منشا قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے۔"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور میں نے رخصت چاہی۔ دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ کچھ چھپی ہوئی چیزیں بھجوائیں اور تحریک کے متعلق رائے طلب کی۔ طالب علم نے اپنی طرف سے یہ جرأت کی کہ ان کو بھی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دی۔ انہوں نے مزاحاً کہا:

"پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھوں گا پھر ضرور ایسا کروں گا۔"

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال کس شان کے آدمی تھے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ان کو کسی سے قرآن کا درس لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو دوسروں کو خدا کا آخری پیغام، سنانے کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور پھر اس علم و حکمت کے زمانے میں اپنے اس فرض کو ان سے زیادہ دل آویز پیرائے میں کس نے پورا کیا۔ جو روشن خیال تجدد پسند طبقہ کے لیے ناقابلِ انکار حقیقت سنا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے تحریک پر حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا:

جناب مولوی صاحب!

السلام علیکم: قرآنی تحریک کا پروگرام مبارک ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کا علم ہندوستان سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی جائے۔ کیا عجب کہ آپ کی تحریک بارآور ہو اور مسلمانوں میں قوتِ عمل پھر عود کر آئے۔

مخلص
اقبال

اقبالؒ سے میری دوسری ملاقات

میں "قرآن مجید" معہ بچوں کی تفسیر کی کتابت و طباعت کے سلسلے میں کچھ مدت کے لیے لاہور گیا۔ ایک دن ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی تھے۔ عصر کی نماز وہیں ادا کی۔ چائے نوشی کی بھی نوبت آئی۔ اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ علالت کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر اتنا نہیں کہ معذوری ہو چکی ہو۔ سب سے پہلے تحریک قرآن کی رفتار کے متعلق استفسار کیا۔ پھر لاہور آنے کی غرض دریافت کی۔ اپنے بچوں کے لیے چھپے ہوئے پارے چغتائی صاحب کے ذریعے بھیج دینے کو کہا۔

حیدرآبادی سیاست کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے "اسلامی کلچر" پر خیال آرائی کا بھی ذکر آیا۔ اقبال نے جو اس کا جواب دیا تھا میں نے اس کی تحسین کی۔ مولوی عبدالحق

کا انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدر آباد سے دہلی منتقل کرنے والے تھے۔ اقبال نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس کے۔ یہ موزوں مقام لاہور ہے اسلام میں عورتوں کی حیثیت کا ذکر چھڑا تو اقبال نے کہا مجھ سے ایک دن ایک امریکی لیڈی ملنے آئی اور اس نے شکایتہً کہا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اس پر اس کو ایسا مسکت جواب دیا گیا کہ قائل ہو گئی۔ اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہی ذات ایسی ہوئی ہے جس نے عورت کی فطرت کو کامل طور پر پہچانا اور وہ ذات گرامی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہٗ ابی وامّی) کی تھی۔ دیکھا گیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام مبارک آتے ہی اقبال کا دل بھر آیا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں۔

اقبال کی وفات

میں لاہور میں کئی برس رہا۔ سید محسن شاہ صاحب سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب اور میاں نظام الدین صاحب رئیس اعظم لاہور کی خواہش پر مدرسہ عالمگیر تحریکِ قرآن مجید کے نام سے ایک تعلیم گاہ شاہی مسجد میں قائم کی گئی۔ یہ ایک ضمنی کام تھا۔ اصل امور انجام دینے کے لیے مسجد سے باہر صدر دروازے سے متصل شمالی حجروں کے سامنے جھونپڑے ڈالے گئے تھے۔ آسانی کے خیال سے بعد میں شب و روز میں وہیں رہنے بھی لگا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت خطیب مسجد مولوی نور الحق صاحب نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں باہر آیا تو ان کی زبانی ڈاکٹر اقبال کے انتقال کی خبر ملی۔ خطیب صاحب نے یہ بھی کہا کہ دروازے کے دوسری جانب یعنی جنوب سمت کے حجروں کے سامنے جو صحن ہے مزار کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ ابھی ابھی میاں نظام الدین صاحب، سید محسن شاہ صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب اس سلسلے میں آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا اور کبھی کبھی اخبار سے کوئی خبر مل جایا کرتی تھی۔ مگر یہ بات گمان میں بھی نہیں تھی کہ قرآن کا مفسر، اسلام کا داعی، انسانیت

کا ہمدرد، مسلمانوں کا غم خوار، اور دنیا کا ایک بڑا آدمی اقبال ہمیشہ کے لیے ہم سے اس قدر جلد جدا ہو جائے گا۔ خدا کی مرضی ایسی ہی تھی۔ جسے بر حال پورا ہونا تھا۔ اب شاہی مسجد کے دروازے کے ایک طرف میرا قیام تھا اور دوسری طرف اقبال کے لیے قبر تیار ہو رہی تھی۔ شام ہوئی۔ جنازہ آنے سے پہلے شاہی مسجد کے اندر اور باہر لوگ جمع ہونے لگے۔ حضوری باغ میں بھی ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ اس کے بعد جنازہ جس شان سے آیا اور جتنا عظیم الشان اجتماع نظر آیا وہ اپنی نظیر آپ تھا۔

لاہور کی شاہی مسجد ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع مسجد ہے اس کے صحن میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی اور اس کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ قلعہ اور مسجد کا درمیانی صحن صدیوں سے خالی پڑا تھا اب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں نے بھی اس رعایت کو مدنظر رکھا تھا اور خود اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اپنے سوگوار اقبال کی خاطر منظور تھی اور چونکہ اس کے بعد بھی عرصہ تک لاہور میں رہا۔ اس لیے وہ سب مناظر رات دن دیکھتا رہا جو اقبال کے مزار پر عقیدت مندوں کی طرف سے پیش ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ؎

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی[۳]

(اقبال)

حواشی

[۱] علامہ کا یہ خط "اقبالنامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں شائع ہو چکا ہے۔

[۲] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم: علامہ کے دوستوں میں شامل تھے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی اور اقبال پر دو تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

[۳] شائع شدہ کتاب "اقبال اور قرآن"

اقبالؒ

شورش کاشمیریؒ

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلی صدی میں دو عظیم علمی وجود پیدا کئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ ۔۔۔ اوّل الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت نے ڈوبلی اور ثانی الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ نفرت۔

مسلمانوں نے علامہ اقبال سے جو عقیدت استوار کی ہے اس کا رشتہ دماغی نہیں قلبی ہے، اور ظاہر ہے کہ دل کی محبت ہمیشہ اندھی، موتی ہے، مسلمان اقبال کے نام سے محبت کرتے ہیں لیکن اقبال کے کلام کو صرف گاتے یا گواتے ہیں ع

میرا یار اں غزل خوانے شمروند

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کی فکری زندگی پر سرسید کے بعد سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، وہ اپنے فکری خطوط کی بنیاد پر جس انقلاب کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے اگر وہ برپا ہو تو مسلمانوں کی جدید صورتحالات کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے لیکن مسلمانوں کی عملی زندگی اس کے فہم ہی سے معذور ہے۔

اُن کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد کا تبحر علمی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے ہتھے چڑھ گیا اور نتیجہ معلوم کہ مسلمانوں نے من حیث الجماعت اُن کے افکار کو بھی متہم ٹھہرایا ۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے لیکن دونوں ایک دوسرے سے دور ۔۔۔ دونوں میں معاصر ہونے کا بُعد تھا لیکن دونوں میں بعض باتیں قدرے مشترک کا درجہ رکھتی تھیں، مثلاً:۔

(۱) دونوں تخلیہ پسند تھے اور دونوں کو کبھی ہجوم کی معیت پسند نہیں آئی۔

(۲) دونوں کے گرد و پیش ایک خاص ڈھب کے عقیدتمند جمع ہوتے تھے۔

(۳) دونوں کے ذہنی خطوط دو مختلف تحریکوں اور دو مختلف راہنماؤں کی طرف راجع تھے۔
اقبالؒ قائدِ اعظمؒ کو دیکھتے تھے اور خود گوشہ نشین تھے یعنی عمل سے الگ تھلگ گویا ان کا فکر ہی ایک عمل تھا ــــ ابوالکلام، گاندھی جی کے ہمقدم تھے اور اقبال کے برعکس اپنے نظریات کے لیے صعوبتیں بھی جھیلتے تھے۔

(۴) دونوں عوام میں گھلنے ملنے کی بہ نسبت عوام سے پرے رہنے میں ذہنی مسرت محسوس کرتے تھے۔

(۵) دونوں "انا" کے سدرۃ المنتہیٰ پر تھے۔

(۶) دونوں کی ذاتی زندگی کے اعمال و افعال میں شروع سے اخیر تک عجیب و غریب یکسانیت پائی جاتی ہے جس سے (INTELECTUALS) کی سیرت کے برگ و بار سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

راقم الحروف کو حضرت علامہ سے ذاتی نیاز حاصل نہ تھا۔ ایک دفعہ اسکول لائف میں ہم دو چار دوست اُن کے ہاں سلام عقیدت کے لیے گئے تو حضرت علامہؒ نے جو کوٹھی کے برآمدے ہی میں کھڑے تھے، ملنے سے انکار کر دیا بلکہ نہایت درشت لہجہ میں فرمایا ــــ واپس جاؤ ــــ

۱۹۳۶ء میں مولانا ظفر علیخان کی معرفت اُن سے تعارف ہو گیا مگر اُن سے میل ملاپ میرے خیال میں چنداں آسان نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بڑے ہی سخت مزاج تھے۔

آزاد ہند فوج میں جس خاتون نے رانی جھانسی کا لقب پایا غالباً اس کی والدہ ۱۹۳۷ء میں مختلف شہروں کا دورہ کر رہی تھیں، مدراس سے لاہور پہنچیں، علامہ اقبال کے ہاں گئیں، اتفاق سے مولانا ظفر علیخانؒ اور راقم الحروف علامہؒ کے ہاں موجود تھے۔ اور حضرت علامہؒ ہمیں صحن میں بٹھا کر خود اندر کھانا کھانے تشریف لے گئے تھے ــــ وہ خاتون جلدی میں اندر ہی چلی گئیں، لیکن اُلٹے پاؤں منہ بسورے واپس آئیں، مولانا ظفر علیخان نے دریافت کیا تو پتہ چلا حضرت علامہؒ نے سخت الفاظ میں ڈانٹا ہے ــــ اتنے میں علامہؒ بھی باہر تشریف لے آئے، اُن کا غصہ اور تیز ہو گیا، بڑے ہی تیز کلمے کہے اور جب وہ بیک بینی، دو گوش

نکل گئی تو فرمایا:۔

"دیکھئے نا یہ بڑھیا جوان لڑکی ساتھ لیے پھرتی ہے اور اس پر کتنا مستزاد ہے، اس کو خبر نہیں کہ یہ مسلمان کا مکان ہے"

سو، اتفاق سمجھئے کہ حضرت علامہ کو مزید ایک دو بار اسی مزاج میں پایا۔ آج تک میرا ذہن عقیدتمندی کے باوجود اس خیال میں پکا ہے کہ وہ مزاجاً "نسیم سحر" نہ تھے[1]

خود مولانا ابوالکلام آزاد اسی مزاج کے بزرگ ہیں۔ اُن کی طبیعت میں بھی استغناء، مزاج میں اَنا اور چہرے پر بے نیازی مسلط ہے، وہ عقیدتمندوں کو ہمیشہ کھیت کی کھاد سمجھتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو علامہ اقبال کے مخلصین میں سے تھے۔ عموماً کہا کرتے تھے:۔

"اقبال کا قلم تمام عمر صحیح رہا۔ اور قدم اکثر و بیشتر غلط۔"

لیکن اُن کا یہ خیال کچھ جچتا نہیں، کیونکہ اقبال نے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا وہ یا تو پکارتا رہا یا للکارتا رہا یا پھر بیڑے کی طرح لہراتا رہا ع

وہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

میں اقبال کو مشرق کا کارل مارکس سمجھتا ہوں اور کارل مارکس کو مغرب کا اقبال۔ اور جب مجھ سے میرے دوست اس کی توجیہہ چاہتے ہیں تو میرا وجدان الفاظ کو گنگ پاتا ہے[2]

حواشی

[1] شورش کاشمیری صاحب کے خلوص اور نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا، اُن کے اس تاثر پر ہمیں اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ علامہ کے دوسرے متعدد "ملاقاتیوں" نے اس کے برعکس خیالات کا اظہار کیا ہے۔

[2] ماخوذ از کتاب "چہرے"، مصنف شورش کاشمیری۔

تاثرات

چوہدری محمد عبداللہ خان

دسمبر ۳۶ء کی آخری شام تھی میں اور میرے برادرِ عزیز محمد زبیر ایم۔اے حضرت علامہ کی خدمت میں پہلی بار نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ مجھے اس سے قبل کئی ایک بلند مرتبت شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ یہ لوگ اپنی نیازمندیوں کو اپنے سحر شخصیت سے مسحور کرنے کے لیے ایک ایسی تخیلی فضا مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک اجنبی آدمی جو پہلے ہی ان کے بڑے بڑے نام سُن کر مرعوب ہوتا ہے یہ عجیب و غریب ماحول، یہ تکلف آمیز گفتگو سن کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ عصرِ حاضر کی اس سب سے بڑی شخصیت کے حضور میں ہماری بھی یہی کیفیت ہوگی، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ایک درویش کا آستانہ ہے اور یہاں کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔

حضرت علامہ جاوید منزل کے صحن میں پلنگ پر دراز تھے اور ایک بے تکلف دوست سے گفتگو فرما رہے تھے، حضرت ممدوح کے نحیف اور کمزور جسم پر بڑھاپا اپنی تمام خوفناکیوں کے ساتھ مستولی ہو چکا تھا، سر کے بال سفید ہو رہے تھے، آنکھوں میں ضعفِ بصارت عیاں تھا، چہرہ کے شکن زندگی کی تلخیوں کے آئینہ دار تھے، طویل علالت نے بظاہر آپ کو مضمحل کر دیا تھا، کہولت و شیب کے تمام آثار نمایاں تھے۔۔۔ ہمیں قریب پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جانے کے لیے ارشاد فرمایا اور معمولی تعارف کے بعد سلسلہ کلام کو پھر جاری کر دیا، اور کئی گھنٹے مسلسل مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، بلند شخصیتوں کی عادات و گفتار میں شاید احساس برتری کے باعث اکثر فضول سا تکلف اور لغو سی متانت آجاتی ہے۔

حضرت علامہ کی طبع بلند حقیقت میں اس قدر بلند تھی کہ اس دُنیا کی بڑی سے بڑی بلندی اور ارتفاع بھی ان کے سامنے پستی کے عام درجہ پر ہوتی تھی، اسی لیے وہ تکلف بے معنی اور متانت بے ہودہ جو عام لیڈروں اور برخود غلط علماء کی گفتار و عادات میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں، وہاں نام کو نہ تھی، گفتگو میں سادگی اور بے تکلفی بدرجہ اتم تھی، یہاں تک کہ نیاز مندوں سے گفتگو کرتے وقت بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی نہایت ہی بے تکلف دوست سے باتیں کر رہے ہیں، آپ کی طبیعت میں نہایت لطیف مزاح تھا۔ زیرِ لب ہنسی کے ساتھ عام گفتگو میں کئی لطائف بیان فرما جاتے تھے، باتیں کرتے وقت ہمیشہ لبشاش نظر آتے تھے۔ گلے کی بیماریوں کے باعث آواز اگرچہ نہایت پست ہو چکی تھی، لیکن طویل سے طویل گفتگو میں بھی کوئی لفظ ایسا نہ تھا جس کے مطالب واضح نہ ہو سکیں۔ اصل اقبال تصنیفات کے اقبال سے مختلف تھا، خطاب اور شوکتِ الفاظ جو حضرت کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے گفتگو میں قطعاً ناپید تھا۔ آپ خوبصورت الفاظ اور دلفریب تراکیب سے اپنی گفتگو کو مزین کرنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے، آپ کی زبان نہایت سلیس ہوا کرتی تھی۔ حقیقت میں ان کی گفتار کی دلچسپی سحرِ بیان کی بجائے ان رموز و معارف میں ہوا کرتی تھی جس کا امانت داران کے سینہ کے سوا آفاق میں اور کوئی نہ تھا۔

علم و حکمت اور حقائق و معارف کے وہ ایک ایسے بحرِ بیکراں اور مخزنِ عمیق تھے جس کی اتھاہ گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کو جناب ممدوح سے شرفِ نیاز حاصل تھا صرف وہی جانتے ہیں کہ ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک قوم اور ایک عصر کی موت ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اقبال زندہ ہے لیکن اس کا کلام ہم میں موجود ہے، لیکن یقین مانیے یہ جملہ صرف انہی لوگوں کی زبان پر آ سکتا ہے جو اقبال کی ذات سے متعارف نہ تھے، اقبال کو صرف انہوں نے ان کی کتابوں میں دیکھ رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی تصنیفات اس کی ذات کے بحرِ ناپیدا کنار سے چند قطروں کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنی علالتِ طبع کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

ایک بار ڈاکٹروں نے فتویٰ دے دیا کہ آپ کے پیٹ میں ایک پتھر ایسی سخت چیز ہے جس کا علاج سوائے اپریشن کے اور کچھ نہیں، مزید یہ کہ اگر یہ اپریشن یورپ کے کسی کامیاب ڈاکٹر سے تین ماہ کے اندر اندر نہ کرا لیا گیا تو موت قطعی ہے، چنانچہ یورپ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، کہ اسی اثناء میں حضرت مولانا سید میر حسنؒ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی، انہوں نے فوراً سیالکوٹ بلوایا اور فرمانے لگے کہ آپ تاریخِ اسلام کے ماہر ہیں آپ خوب جانتے ہیں کہ شاہانِ اسلام اور امرائے اسلام ایسے نازک طبع لوگ زمانہ کی آنکھوں نے بہت کم دیکھے ہوں گے، ان ایام میں بھی یہ خوفناک امراض یقیناً موجود تھے، لیکن اسلامی طب میں اپریشن کو کوئی حیثیت حاصل نہیں، یقیناً اطبائے اسلام اپنے ہی طریقِ علاج کے ذریعہ ان موذی بیماریوں سے نجات دلواتے ہوں گے. پھر کیوں نہ یورپ کے عقل باختہ لوگوں سے زندگی کو خطرہ میں ڈالنے سے قبل کسی طبِ اسلامی کے ماہر سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ انہیں کے ارشاد کے مطابق حضرت علامہ فرمانے لگے کہ میں نے دہلی کے ایک حکیم سے علاج کرایا، علاج کے بعد انہی ڈاکٹروں سے پھر ملاحظہ کرایا جنہوں نے کہا تھا کہ اپریشن کے سوا دنیا میں اس مرض کا علاج موت ہے، وہ حیران ہوئے کہ اب ان کے پیٹ میں وہ سخت چیز موجود نہیں تھی۔ حضرت علامہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ انہی ایام میں ایک مشہور انگریز نے انگریزی اخبارات میں اسلامی طب کے خلاف جسے عرفِ عام میں غلطی سے یونانی طب کہا جاتا ہے، نہایت مذموم پروپیگنڈا شروع کیا، دو تین قسطوں کے بعد آپ نے اسے کہلوا بھیجا کہ وہ اسلامی طب کو بدنام کرنے سے باز آجائے ورنہ وہ انگریزی طب کے خلاف اپنے تجربات کی بناء پر لکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے، اور اس کا وہ اثر ہوگا جو شاید اس سے پوشیدہ نہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اس شخص کی طرف سے اخبارات کو اسلامی طب کے خلاف کوئی چیز موصول نہ ہوئی۔

اس کے بعد علامہ نے اسلامی طب کے متعلق ایسی پُر از معلومات باتیں ارشاد فرمائیں کہ ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ جہاں ایک بلند پایہ شاعر اور فلسفی ہیں وہاں اسلامی طب پر بھی عبور کامل رکھتے ہیں، حالانکہ واقعہ

یہ ہے کہ وہ حکیم تھے طبیب ہرگز نہ تھے، اس ضمن میں حضرت ممدوح نے کئی ایک واقعات و مشاہدات بیان فرمائے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر سی صحبت میں سب کچھ عرض نہیں کر سکتا۔[2]

حواشی

[1] علامہ کے استاد۔ پیدائش ۱۸۴۴ ..... وفات ۱۹۲۶

[2] شائع شدہ روزنامہ "احسان" ۳۰ مئی ۱۹۳۸ء

مجھے یاد ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی کے صدر تھے، انہیں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے خطوط موصول ہوتے، آپ انہیں پڑھتے اور آتش دان میں پھینک دیتے، ایک دفعہ شیخ صاحب تشریف لائے اور گلہ کیا کہ آپ جواب نہیں دیتے ــــ علامہ فرمانے لگے:۔

"یہ تمہارے خط پڑے ہیں انہیں لے جاؤ، میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لیے ٹکے ٹکے کے لوگوں کے پاس جاؤں۔"

(علوالدین سالک)[3]

(پیام اقبال" سیالکوٹ: فروری مارچ ۱۹۶۸ء)

[3] ۲۰۵

اقبال

شوکت تھانوی

لاہور آنے کا شوق سب سے زیادہ اس لیے تھا کہ سر محمد اقبال سے ملیں گے۔ چنانچہ ملے، شاعرِ اعظم انتہائی سادگی کے ساتھ ایک مُونڈھے پر بیٹھے ہوئے حُقّے سے شغل فرما رہے تھے اور لکھنؤ کے ایک مجذوب نوجوان شاعر "مجازی صاحب" آپ کے پاس بیٹھے تھے تعارف کے بعد لکھنؤ اور لاہور کا ذکر چھڑا ہی تھا کہ مجازی صاحب نے کہا:۔

"میرا مطلب یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ اگر آپ کی زبان بھی درست ہوتی تو....."

ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر کہا:۔ "تو سبحان اللہ"

مجازی صاحب نے کہا "یہی نہیں بلکہ ایک بات ہوتی"

ڈاکٹر صاحب نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا:۔ "مجازی صاحب میرے حال پر ترس کھا کر لاہور تشریف لائے ہیں، تاکہ میری زبان درست فرماتے رہیں، میں اب آپ ہی سے مشورہ لوں گا۔"

مجازی صاحب اس طرح متانت سے بیٹھے رہے گویا ڈاکٹر صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے، میں نے عرض کیا:۔

"ڈاکٹر صاحب یہ خدا کو ہی نہیں مانتے، آپ تو پھر بھی خدا کے بندے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "اسی لیے تو میں خوش ہوں، یہ مجھے بھی نہیں مانتے، یہ ایک طرف ہیں اور میں اور میرا خدا ایک طرف۔"

مجازی صاحب نے تمسخر سے فرمایا "ہیہ۔ خدا۔"

ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہا "زیادہ حدِّ ادب"

اِس کے بعد مجازی صاحب تو اپنے ناخنوں سے میل نکالتے رہے اور یہاں

گفتگو نہ جانے کہاں کہاں ہوتی ہوئی رفیع احمد خان صاحب تک پہنچ گئی، جن کا ایک شعر میں نے ڈاکٹر صاحب کو سنایا تھا، رفیع احمد خان صاحب عریاں کہتے ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے اصرار کر کے ان کے بہت سے شعر سُنے اور کہنے لگے کہ خیریت ہے کہ یہ صاحب اس رنگ میں کہتے ہیں ورنہ بڑے بڑوں کا پتہ نہ چلتا کہ کِدھر گئے، اس رنگ کے خود بھی اکثر شعر سُنائے۔

ان کی زبان درست تھی یا نہیں، وہ حقہ کہتے تھے یا حُکّہ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان سے ملنے کے بعد ان کی وہ عظمت جو کتابوں سے حاصل ہوئی تھی میرے دل میں دوگنی ہوگئی بکھنؤ جا کر اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گہرستان میں نے بھیجا، اس کو پڑھ کر جو خط مجھے لکھا اُس سے اِس عظیم المرتبت شخصیت کی رفعتوں کا اندازہ ہوتا ہے، پھر کچھ دن خط و کتابت رہی، مگر افسوس کہ ان کا وقت آچکا تھا اور میں نے ملنے میں بہت دیر کی تھی، پھر دوبارہ نہ مل سکا [۲]

حواشی

[۱] شوکت تھانوی ــــ (۲ فروری ۱۹۰۴ ــــ وفات ۴ مئی ۱۹۶۳) مشہور مزاح نگار۔ علامہ کا ایک خط محررہ ۲۴ اگست ۱۹۳۴ء ان کے نام ہے جو "انوار اقبال ص ۲۴۶" میں شامل ہے۔

[۲] شائع شدہ "شیش محل" مصنفہ شوکت تھانوی۔

اقبالؒ

پنڈت جواہر لال نہرو

کمال پاشا کی قدر ہندوستان کے مسلمان اور ہندو یکساں کرتے تھے اُس نے صرف ترکی کو بیرونی تسلط سے آزاد کیا اور اس کے اندرونی انتشار کو دور کیا بلکہ یورپ کی سامراجی طاقتوں خصوصاً انگلستان کی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب اتاترک کی پالیسی ظاہر ہوئی یعنی اُس کی مذہب سے بیگانگی، خلافت کا خاتمہ، سلطان کی برطرفی، دنیوی ریاست کا قیام اور درویشوں کے سلسلے کو توڑنا۔ تو اس کی یہ قدر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں باقی نہیں رہی اور وہ اس کی جدیدیت کی پالیسی سے بیزار ہو گئے۔ مگر اس پالیسی کی وجہ سے نوجوان ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ اور زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا۔ اتاترک نے ایک حد تک خیالی عمارت کو مسمار کر دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں غدر کے زمانے سے رفتہ رفتہ تعمیر ہو رہی تھی اور پھر ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا، بہت سے مسلمانوں نے اس خلاء ذہنی کو قومی تحریک میں شریک ہو کر پُر کر لیا، بعض پہلے ہی شریک ہو چکے تھے اور بعض تذبذب اور شبہے کے عالم میں اُسے دُور سے دیکھ رہے تھے۔ اصل کشمکش جاگیری اندازِ فکر اور جدید رجحانات میں تھی، جاگیر دار طبقے کی قیادت عوام کی تحریکِ خلافت کے سیلاب میں بہہ گئی تھی لیکن یہ خود تحریک سماجی اور معاشی حالات کی ٹھوس بنیادوں پر یا عوام کی ضرورتوں پر قائم تھی۔ اس کا مرکز ملک کے باہر تھا اور جب اتاترک نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا، تو تحریکِ خلافت کی ساری عمارت ایک دم سے بیٹھ گئی، مسلم عوام کے حواس جاتے رہے اور ان میں کسی قسم کے سیاسی عمل کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ پُرانے جاگیر دار قسم کے لیڈر تو ایسے موقعے کے انتظار ہی میں تھے، وہ برطانوی پالیسی کی مدد سے جس نے ہمیشہ ان کی دستگیری کی تھی، پھر میدان میں آ گئے لیکن اب وہ پہلی سی بات نہ تھی کہ لوگ اُن کی قیادت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

اب حالات کا رنگ کچھ اور ہو گیا تھا، مسلمانوں میں بھی بہت دیر کے بعد ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ عوام کی سیاسی تحریک نے جو نیشنل کانگریس کی قیادت میں اٹھی، ان پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اگرچہ دراصل مسلمان عوام اور نئے متوسط طبقے کی ذہنیت کی تشکیل واقعات نے کی تھی، لیکن مؤخر الذکر طبقے خصوصاً اس کے نوجوان کو متاثر کرنے میں سر محمد اقبال کا اہم حصہ ہے، ابتداء میں اقبال نے اُردو میں پُر زور قومی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ جنگ بلقان کے دوران میں انہوں نے اسلامی موضوع اختیار کئے وہ اپنے زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات سے متاثر ہوئے اور خود انہوں نے ان جذبات پر اثر ڈالا اور انہیں شدید کر دیا، لیکن وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیری نظام سے وابستہ تھے، نسل کے اعتبار سے وہ کشمیری برہمن تھے، انہوں نے اپنی اُردو اور فارسی شاعری کے ذریعے تعلیمیافتہ مسلمانوں کے لیے ایک فلسفیانہ نظریہ مہیا کر دیا اور اُن میں تفریقی رُجحان پیدا کر دیا۔ یوں تو اُن کی ہر دلعزیزی اُن کے کمال شاعری کی وجہ سے تھی، لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلم ذہن کی اس ضرورت کو پورا کر رہے تھے کہ اُسے اپنے لیے ایک لنگر مل جائے۔ قدیم اتحادِ اسلامی کا خیال اب بے معنی ہو گیا تھا، خلافت ختم ہو چکی تھی۔ سب اسلامی ملکوں میں اور خصوصاً ترکی میں قومیت پرستی کا زور تھا اور انہیں ایک دوسرے کی کوئی پروا نہ تھی۔ قومیت کا تصور ایشیا پر یورپ و امریکہ کی طرح چھا گیا تھا، ہندوستان میں قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور برطانوی حکومت کو بار بار للکار چکی تھی، یہ قومیت ہندوستانی مسلمانوں کے دل کو لگتی تھی اور آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اہم حصہ لیا تھا لیکن ہندوستان کی اس قومی تحریک میں ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اُس پر اُن ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا، اس لیے مسلم ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوئی، بہت سے لوگوں نے اس قومیت کو قبول کر کے یہ کوشش کی کہ اس پر اپنا اثر ڈالیں، بہت سے اس تحریک سے ہمدردی رکھنے کے باوجود جیص بیص کے عالم میں اس سے الگ رہے اور بہتوں نے تفریق کا راستہ اختیار کیا جس کی طرف اقبال

کے فلسفے اور شاعری نے ان کی راہنمائی کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ یہی وہ حالات تھے جس کے ماتحت اب سے چند سال پہلے تقسیمِ ہند کی آواز بلند ہوئی، یوں تو اس کے بہت سے اصلی اور ضمنی اسباب تھے، فریقین کی بہت سی غلطیاں اور حماقتیں تھیں اور سب سے بڑھ کر حکومتِ برطانیہ کی تفریقی پالیسی تھی لیکن ان سب کی تہہ میں یہ نفسیاتی کیفیت تھی جو علاوہ اور تاریخی اسباب کے اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نشوونما بہت دیر میں ہوئی۔ آج ہمارے ملک میں جو اندرونی کشمکش نظر آتی ہے وہ صرف قومی تحریک اور غیر ملکی حکومت ہی میں نہیں بلکہ جاگیری نظام اور جدید تصوّرات وادارات میں بھی ہے۔

یہ کشمکش مجموعی طور پر پوری قوم میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری بڑی بڑی جماعتوں کے اندر بھی۔ قومی تحریک جس کی نمائندگی نیشنل کانگریس کرتی ہے، یقیناً جدید تصورات وادارات کی نشوونما کے تاریخی عمل کی علمبردار ہے اگرچہ وہ ان تصورات کو بعض قدیم اصولوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے، اسی وجہ سے اس میں ہر قسم کے لوگ جو آپس میں شدید اختلافات رکھتے ہیں، جمع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ایک تنگ اور بے لوچ سماجی نظام نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور دوسری جماعتوں کو بھی بھڑکا دیا، مگر اب خود اس سماجی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اس میں وہ سختی نہیں رہی۔ بہرحال اس نظام میں اتنی قوت نہیں کہ وہ قومی تحریک میں جو وسیع معنی میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں پر حاوی ہے، روڑا اٹکا سکے۔ اب قومی تحریک میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتی رہی ہے، مسلمانوں میں جاگیری عناصر بدستور طاقتور ہیں اور عام طور پر انہیں عوام سے اپنی قیادت کے منوانے میں کامیابی ہوتی رہی ہے۔ ہندو متوسط طبقے اور مسلمان متوسط طبقے کی نشوونما میں ایک نسل سے زیادہ کا فرق رہا ہے اور یہ فرق اب تک سیاست، معیشت اور دوسرے شعبوں میں نمایاں ہے، اسی پسماندگی نے مسلمانوں میں خوف کی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

پاکستان یعنی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز خواہ وہ جذباتی حیثیت سے کتنی

ہی کشش کیوں نہ رکھتی ہو، اس پسماندگی کا علاج نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس سے جاگیر دار طبقے کو اور تقویت پہنچے گی اور مسلمانوں کی معاشی ترقی میں تاخیر ہوگی۔ اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے لازمی خطرے اور لغویت کو محسوس کر لیا تھا۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران میں اقبال نے اُن سے یہ کہا تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمایت کی تھی مگر اُن کو یقین تھا کہ یہ تجویز کُل ہندوستان کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے مُضر ہے، شاید انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اُس نے کوئی اہمیت نہیں حاصل کی تھی۔ اُن کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیم ہند کے اس تصوّر کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہُوا، نہیں کھپتا تھا۔[۱]

آخر عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔[۲] سوویت روس کی زبردست کامیابی نے اُن کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رُخ بدل گیا، اپنی وفات سے چند مہینے پہلے جب وہ بسترِ علالت پر تھے اُنہوں نے مجھے بلا بھیجا اور میں نے بڑی خوشی سے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔[۳] جس میں مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کر رہا تھا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ باوجود اختلاف کے ہم دونوں میں کس قدر اشتراک خیال ہے اور کتنی آسانی سے ان کے ساتھ نباہ ہو سکتا ہے، اُن کی پُرانی باتیں یاد آ رہی تھیں اور وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر بڑھتے جاتے تھے۔ میں خود بہت کم بول رہا تھا اور بڑی توجہ سے ان کی باتیں سُن رہا تھا، میں اُن کا اور اُن کی شاعری کا مداح تھا اور مجھے بڑی خوشی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں، میرے رخصت ہونے سے ذرا دیر پہلے انہوں نے مجھ سے فرمایا "تم میں اور جناح میں کیا چیز مشترک ہے؟ وہ ایک سیاست دان ہیں اور تم محبِ وطن ہو" مجھے امید ہے کہ مجھ میں اور مسٹر جناح میں اب بھی بہت کچھ مشترک ہوگا۔ اب رہا میرا محبِ وطن ہونا تو یہ آجکل کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں سمجھی جاتی خصوصاً اس محدود معنی میں جس میں یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اگرچہ مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے لیکن میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ساری دُنیا کے مسائل تو درکنار خود اپنے

ملک کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے ہمیں قومی ہمدردی سے زیادہ وسیع جذبے کی ضرورت ہے۔ لیکن اقبال کا یہ خیال یقیناً صحیح تھا کہ میں کچھ زیادہ سیاست دان نہیں ہوں اگرچہ سیاست نے مجھے اپنے چنگل میں دبا رکھا ہے]۔[۴]

حواشی

[۱] ایڈورڈ تھامسن کے نام علامہ کا ایک خط حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری سے دریافت ہوا: مولانا راغب احسن کے نام خطوط" اقبال جہاں دیگر" ص ۱۱۶ پر علامہ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے پنڈت نہرو کے بیان کی مزید تائید ہوتی ہے، لکھتے ہیں :-

---"میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں---- براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز "پاکستان کی اسکیم" سے تعلق رکھتی ہے: جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے، جب کہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال و مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو"---

[۲] پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں: علامہ نے شروع میں اشتراکیت کی حمایت میں کچھ اشعار کہے تھے لیکن آخری عمر میں وہ اس تحریک کے زبردست مخالف تھے: "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" جو علامہ کے آخری مجموعہ کلام "ارمغانِ حجاز" میں شامل ہے، سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

[۳] پنڈت نہرو کی یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی: پنڈت نہرو ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کے ازالہ حیثیتِ عرفی کے مقدمے میں شہادت کے لیے لاہور آئے تھے: اور میاں افتخار الدین کے

گھر ٹھہرے، اس ملاقات میں میاں افتخار الدین اور راجہ حسن اختر دونوں موجود تھے، لاہور میں اس ملاقات کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی، اقبال کا یہ فقرہ کہ "جواہر لال آپ محبِ وطن ہیں اور جناح سیاست دان" بے حد مشہور ہوا۔ (ہمارا اردو ڈائجسٹ اقبال نمبر ۷۷ء)

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "مفکرِ پاکستان" از حنیف شاہد ص ۳۵۵

ماخوذ از "تلاشِ ہند" مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۴۶ء

◉

پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں مَیں نے "خضرِ راہ" ان کو پڑھتے سنا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگِ یورپ کے بعد عالمِ اسلام نہایت کرب کے عالم میں تھا۔ ہندوستان کے باہر بھی مسلمانوں پر انتہائی پریشانی کا عالم طاری تھا..... (ان سے باقاعدہ روابط تو نہ تھے) البتہ ایک ملاقات ضرور ہوئی اور وہ اس طرح کہ ان کی زندگی میں "یومِ اقبال" منایا گیا تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اس جلسے میں شریک ہونے کے لیے نکلا، راستے میں صلاح یہ ٹھہری کہ کیوں نہ علامہ صاحب کے درِ دولت پر حاضری دی جائے، چنانچہ "جاوید منزل" جا پہنچا۔ حضرت علامہ کچھ احباب سے مصروفِ گفتگو تھے، وہ مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے اور مجھے اعتراف ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا حضرت علامہ اسے تشنہ نہ چھوڑتے اسلامی ممالک کے رسم و رواج، ان کی سیاست سے لے کر ان کے مخصوص کھانوں کی مماثلت تک کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں فرماتے ـــــ میرا تعارف کرایا گیا تو بڑے تپاک سے ملے اور خاصی توجہ فرمائی۔

شائع شدہ رسالہ "کترن" اقبال نمبر ۷۷ء
مجلہ لاہور کالج برائے خواتین ـــ انٹرویو: ثریا احمد

یومِ اقبال

اسلم جیراجپوری

(مرقومہ ۱۹۳۸ء)

گذشتہ زمانوں میں بالعموم اہلِ کمال کو ان کے کمال کی داد ان کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اس دُنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ان کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے ؎

چہ دل کشاید از نیم کہ بعد ازیں گویند — کہ بودہ است فلاں دام اسمِ استاد
از ینکہ بعد بریدن تمام شانہ شود — گرہ کشادہ نگردد ز طرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع الحاق و اتصال اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دُنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہوگئی ہے اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم بردرہوڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ دُنیائے اسلام کے اس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ ان طلبہ نے مجھے بھی اس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ۔ اس لیے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا، دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے بولنے والے نظمیں اور مضامین سُنانے والے بہت، یعنی تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہوگیا تھا اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ۹½ سے رات کے ½ ۹ بجے تک رکھی گئی تھیں، پہلی نشست میں

مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اس لیے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔

دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیر صدارت سر شیخ عبدالقادر صاحب[1] ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی، اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے، خاص کر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم، اے، ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا انگریزی مقالہ بہت، گرانقدر تھا، مولانا عابد علی صاحب عابد ایم، اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی، اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں، نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی سے نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ۱/۲ ۴ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی[2] صدر تھے، اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ انکے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلے میں منتقل کر دی ہے، اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور شکریہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر عمر فاروق ایم اے اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم، ایس، سی نے انگریزی زبان میں پُر مغز مقالے پڑھے، کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں، جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت[3] کے ساتھ دلچسپی سے سُنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی تقریر "اقبال اور قرآن" پر شروع کی جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجئے، مگر چونکہ وقت زیادہ گذر چکا تھا اس لیے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی:۔

"ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جب کہ آج سے ایک تہائی صدی پیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا کرتی تھیں، زمانہ مابعد میں ڈاکٹر صاحب

کی مثنویوں اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق نیز جاوید نامہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے، ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جس قدر خدمت کی ہے اس سے کہیں زیادہ اِسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ قرآن سے ان کو لگاؤ نہیں رہا۔ ہے اور ان کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے، وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سرتاسر انسانی ہیں جن کو ملاؤں نے فرقہ بندی اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درہم برہم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیمیافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی اور بدگمانی پیدا ہوگئی جو اس صورت میں ہر عقل مند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہی ہونی چاہیئے تھی، ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دیپک کا راگ چھیڑا جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا۔

بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کے دلوں کو ہدایت کی طرف موڑنا وہ کام ہے جس کے لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گذشتہ زمانوں میں انبیائے کرامؑ آیا کرتے تھے، وہی کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کس قدر صحیح ہے ؎

در دیدۂ معنی نگہیاں حضرتِ اقبال پیغمبر یئے کردہ پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اس قدر مہمل ہو گئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں، شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مُبتلا ہیں اور کس لیے مبتلا ہیں، بس ایک پرانی لکیر ہے جس کو پیٹتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مبصر مولانا حالی مرحوم نے کہا ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے تھرا تے ہیں آسماں پر　　زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا
ہُوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عام بدذوقی کی دُنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا، یہ وہ چیز ہے جس کے لیے توفیق الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چُنتی ہے، چنانچہ آج بھی جبکہ اُن کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہو سکا، بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں عربی، فارسی اور اُردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، امیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں اُن کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں، اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے لیے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک موہبت کبریٰ ہے جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں

بہت بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ کے لیے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملّی سرمایہ ہے۔"

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبہ کی طرف سے تھا جن کے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سیکرٹری[۴] انجمن ترقی اُردو، مولانا سید سلیمان صاحب[۵] ندوی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سے سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے، ورنہ اقبال ڈے اور بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن، ہم ڈاکٹر اقبالؒ سے ملے جو ہمارے منتظر تھے، ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل ہے کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفرِ حج میں ہوں، عملاً جب موقع اللہ دے، بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں، ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تو باثر انجا و با خاصان بیا میز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔[۶]

حواشی

۱؎ شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ — ۱۹۵۲) "مخزن" کے ایڈیٹر اور علامہ کے بہترین دوستوں میں تھے۔

۲؎ عبداللہ یوسف علی..... اسلامیہ کالج لاہور کے سابق پرنسپل، مشہور سکالر، علامہ کے مداحوں میں تھے۔

۳؎ اسد ملتانی..... محمد اسد ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۲ کو ملتان میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۹ میں پاکستان کی وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے کے دوران انتقال فرمایا۔

۴؎ مولوی عبدالحق..... ۱۸۶۹ میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ کو انتقال کیا، متعدد کتابوں کے مصنف تھے:

مولوی صاحب کے نام علامہ کے سات خطوط "اقبالنامہ دوم" میں اور ایک خط "انوارِ اقبال" میں موجود ہے۔

۵؎ مولانا سید سلیمان ندوی..... پیدائش ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء پٹنہ — ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ کو فوت ہوئے — سیرت النبیؐ کی تکمیل ان کا مشہور کارنامہ ہے — علامہ کے متعدد خطوط موصوف کے نام ہیں جو شیخ عطاءاللہ نے اپنے مجموعہ مکاتیب "اقبال نامہ" میں شائع کئے۔

۶؎ شائع شدہ "آثارِ اقبال" (حیدرآباد دکن) جوہر اقبال نمبر (جامعہ ملیہ دہلی)

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے

آخری مُلاقات

پرویز

نوشتہ ۱۹۳۹ء

۳۸ء اور ۳۹ء کی درمیانی شب، گذشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا، گذری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں، جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گذرے تو وہ معلوم نہیں ہوتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل! اسی طرح دن گذرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ! ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یادیں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں، ابھی چند ورق اُلٹنے پایا تھا کہ ۱۰ جنوری کے صفحہ پر ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا، اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے ربطِ ہستی کے تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوئے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں، اور شعلہ ریز دیپک کے سُروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔

واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ جنوری کو "دہلی کا قافلہ" زیر امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہنچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ ان اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا، لیکن ۱۰ جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو کہ ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزم طلوعِ اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں شریک کر لوں۔ بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے

الفاظ ہی میں سُنیئے :-

۱۵ر جنوری بروز سوموار صبح نو بجے جاوید منزل واقع میور روڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب حسبِ وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے، حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے، لحاف اوڑھے ہوئے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا، حُقّہ سامنے تھا جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ ویوین ملنے کے لیے آیا، تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی، اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو اُردو میں چھڑا، لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسبِ معمول "پنجابیت" صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردہ میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھئے، لیکن اس دفعہ کمزور معلوم ہوئے تھے، بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے بیٹھا ہے۔ پہلے متفرق سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ہمیشہ موجود رہتی ہے لیکن آجکل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سُبک رَو کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آگئی فرمایا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے جب واپس آرہے تھے تو مولوی شفیع داؤدی صاحب (مرحوم) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئیداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آرہے تھے، مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ کہا وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جا گری تھی اُٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر

جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تھی، فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں، جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمدؒ (بریلوی) اور سید احمد دہلوی (سر سید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں، یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں، اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لیے جہاں ایک طرف انسانوں کے لیے یہ آیا ہے کہ وہ الیٰ ربّھم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے) دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وجاء ربك والملك صفًّا صفًّا (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشرقت الارض بنور ربھا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھلائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض و سما اور پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے، جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا، کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو، یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لیے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت (جس دن یہ ارض و سمٰوٰت بدل جائیں گے) شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں، خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں، نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔ ایک سیکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس تک امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو؟

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو TIME کے نظریہ پر ایک مقالہ

لکھ کر اپنے اُستاد MC TAGGART کے پاس لے گیا، اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے، میں نے اسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب برگسان کے نظریئے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اُس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہُوا، اس لیے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقتِ ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

اس کے بعد برگسان نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتی ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہینِ منت ہو کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اسے یقین کا رُتبہ حاصل ہوتا ہے، تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی نئی دُنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہُوا کہ ذہنِ انسانی کی وُسعتیں کس قدر حدود تا آشنا ہیں، اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے، علم و ادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ جانتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں صاف کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآنِ کریم کے متعلق ذکر آگیا، فرمایا کہ جب میں ایف اے (F.A.) میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا، والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے، ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم پڑھتا ہے پھر یہ سوال کیسا ہے؟ نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا

ہوں، کہیں کہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے، بات ختم ہوئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآنِ کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے، میں حیران تھا کہ کیا نبیؐ اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا؟ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا، پھر میں حیران تھا؟ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے، اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے، وہ سلسلہ گویا (MOHAMMAD IN THE MAKING) تکمیلِ محمدؐ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا، البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ "محمدؐ" مکمل ہو گیا، بابِ نبوت بند ہو گیا، انسانیت اپنے معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمدؐ ہے، کوئی انسان جتنا محمدیتؐ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآنِ کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآنِ کریم اُسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔

یہ تو تھی قرآنِ کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے۔ یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے، کوئی یہاں کوئی وہاں، ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے، اس مجموعہ کا نام ہے قرآن مجید۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہو گی وہ یقین کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے، قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہو گا۔ اس لیے کہ حیاتِ انسانی کے لیے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آ چکے ہیں۔ اب قرآنِ کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جس طرح یہ دُنیا کو ملتا چلا آیا ہے، کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی کہیں کسی بدھ کو، وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھیے، وہاں

نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کون سے، حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے، ان کے حقائق قرآنِ کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی، یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم نے ارض و سما کو لاعبین (IN SPORT) کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے، چنانچہ اُن کے ایک خدا کا نام نٹراجن (کھلاڑیوں کا بادشاہ) ہے، اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے، اور دُنیا پیدا ہوتی جاتی ہے، اس افسانے کی تردید لاعبین کے اندر ہے، یا مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی)۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائے گا خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیاء میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کی ہے، لہٰذا قرآنِ کریم سمجھنے کے لیے پہلے اس قسم کے "افسانوں" کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، خالص حقائق اب قرآنِ کریم کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے۔

رسول کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (LENGTH of TIME) کو سمیٹ کر ایک حال (PRESENT) کے اندر مرتکز کر لے۔ لہٰذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانۂ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں، اس لیے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی پیشگوئیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں، وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اس لیے اُن کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں، فرمایا کہ مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا، اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبال کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبال ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آگئی جس سے ہمیں حقیقی اقبال کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آج کل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گذشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں، جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی ہی باتیں ہوتی ہیں، یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، کچھ طبیعت سنبھلی تو فرمایا کہ بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانۂ اقدس پر پہنچوں گا تو یہ بھی عرض کروں گا وہ بھی، راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آگیا، کعبۃ اللہ میں پہنچ کر بہ حضورِ حق عرض کیا ہے کہ:-

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزلِ دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی، دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا

ہوگئی ہے، لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے، یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ امنڈ کر منہ میں بھر آیا ہے، گلا پھول گیا، چہرہ سرخ ہوگیا، اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لے جا رہے ہیں، بڑے کرب واذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے، غش کی سی حالت ہوگئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہوگیا، ایک ہیبت سی طاری ہوگئی، سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے، اجازت چاہی تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی؟ ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً وکرہاً رخصت ہوئے، دیکھا تو بارہ بج چکے تھے، تین گھنٹے گذر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوئے ہیں۔

زندگی میں چند لمحات بعض اوقات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں، یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبال کہاں پہنچ چکا ہے، دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر، اور قلب ہے تو عشقِ رسولؐ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا کہ انہیں فطرت کی کرم گستری نے کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے۔

(مرقومہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہرحال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنہیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اُس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہوگی اور اس کے بعد عالمِ اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی، اس کمی کو کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں

کبھی حضرت علامہؒ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو، آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حرماں نصیب کی حسرتیں کہ ؏

دگر دانائے راز آید کہ ناید[۵]

حواشی

[۱] اس "اقبال ڈے" کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے اسی کتاب کا مضمون "یومِ اقبال" از اسلم جیراج پوری

[۲] سید نذیر نیازی، مشہور ماہر اقبالیات

[۳] لارڈ لوتھین سے علامہ کی ملاقات گول میز کانفرنس کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ہندو مسلم اختلافات کے حل کے لیے جو موقف علامہؒ کا تھا، لارڈ لوتھین بھی علامہ کے ہم خیال تھے۔ یہ لارڈ لوتھین ہی تھے جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں علامہؒ کو انگلستان میں روڈز لیکچر کی دعوت دی تھی مگر علامہؒ اپنی علالت کی وجہ سے یہ لیکچر نہ دے سکے تھے۔

[۴] مولوی شیفیع داؤدی، روشن خیال عالم، علامہؒ کے دوست، جو گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

[۵] ماہنامہ "طلوعِ اسلام"، اپریل ۱۹۵۱ء

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ

شیخ عبدالشکور

یہ ناچیز بندہ نہ شاعر ہے اور نہ ادیب۔ حق بات یوں ہے کہ ہمیں تو علامہ مرحوم کے ملازم علی بخش مرحوم سے بھی گفتگو کرنے کا پورا شعور نہ تھا، زندگی کا بیشتر حصہ گورنر کے سیکرٹریٹ کی ملازمت میں گذار دیا، علامہ موصوف کے متعلق کچھ لکھنا بڑی جسارت اور کاوش چاہتا ہے، پھر ہماری ہستی کیا؟ البتہ چند واقعات جو میری آنکھوں کے سامنے گذرے ہیں اُنہیں قلمبند کر کے پیش کرتا ہوں۔

علامہ مرحوم کو ہم نے آج سے ساٹھ سال پیشتر انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پہلی مرتبہ دیکھا جب وہ اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" سُنانے کے لیے اسلامیہ کالج میں تشریف لائے تھے۔ علامہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ سرخ و سفید رنگ، شاندار مونچھیں، بڑے وجیہہ اور جامہ زیب انسان تھے، سُرخ ترکی ٹوپی اُن کے سر پر عجب بہار دکھاتی تھی۔ اس سے پیشتر وہ انجمن حمایتِ اسلام کے سابقہ جلسوں میں اپنی "نالۂ یتیم" جیسی موثر نظمیں سُنا کر اپنی شاعرانہ قابلیت کی دھاک بٹھا چکے تھے، لہٰذا اس جلسے میں خلقت کا بے پناہ ہجوم ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے چیدہ علماء اور مُقرّرین وہاں جمع تھے۔ مولانا قاری شاہ سلیمان (پھلواری) اور خواجہ حسن نظامی کو پہلے پہل ہم نے وہیں دیکھا۔ آنریبل جسٹس شاہ دین، سر محمد شفیع اور دیگر مسلم اکابرین کے علاوہ خواجہ عبدالصمد صاحب گگڑو ریمیں بارہ مولا (کشمیر) بھی وہاں تشریف فرما تھے، خواجہ صاحب موصوف کشمیر کے ایک بڑے تاجر تھے اور قومی کاموں میں بھرپور حصّہ لیا کرتے تھے، وہ علامہ اقبال کے فدائیوں میں سے تھے۔

چونکہ نظم "شمع و شاعر" کافی طویل تھی اس لیے علامہ نے اسے دو نشستوں میں پڑھا، پہلی نشست نمازِ عصر کے بعد ہوئی اور اُس کے صدر خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب تھے، یہ صاحب مرزا قادیانی کے بڑے صاحبزادے، ہلا کے ذہین اور بڑے پائے کے ادیب تھے۔ اُن کے مضامین رسالہ "مخزن" میں

زینت ہوا کرتے تھے، اُن کی کتاب "اساس الاخلاق" کسی زمانے میں یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں شاملِ نصاب تھی۔

علامہ کی یہ نظم ایک پولیٹیکل شاہکار تھی اور ادبی لحاظ سے بھی نہایت بلند پایہ، علامہ اسے ترنم سے سنا رہے تھے اور چندے کی ریل پیل ہو رہی تھی، علامہ نے جب یہ شعر پڑھا ؎

درغمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

تو خواجہ عبدالصمد کلکڑ و نے کہا: "اقبال! بارِ دگر بخواں"۔ اِس پر علامہ نے بے ساختہ کہا: "تابِ دگر بار سوختن ندارم" اِس برجستہ جواب پر سامعین سراپا داد بن گئے اور خواجہ صاحب نے بے تاب ہو کر علامہ کا ہاتھ چوم لیا اور انجمن کو ایک ہزار روپے چندہ عطا فرمایا (آج کے حساب سے یہ رقم بیس پچیس ہزار کے برابر ہے)۔ نمازِ مغرب کے بعد دوسری نشست ہوئی تو اس کے صدر عزت نشان فقیر افتخار الدین صاحب تھے۔ فقیر صاحب موصوف، سرمراتب علی شاہ کے نواسے اور فقیر سراج الدین سیکرٹری ریونیو پنجاب کے والد ماجد تھے اور بڑی شاندار شخصیت کے مالک، سفیرِ کابل رہ چکے تھے اور داد و دہش کے باعث مشہور تھے۔ اِس اجلاس میں علامہ نے اپنی نظم پڑھنے سے پیشتر فارسی کے چند شعروں میں ایک لطیفہ بیان کیا۔ علامہ کے ایک بے ریا دوست نے بڑے اخلاص سے اُن سے کہا کہ تم ابھی تک دُوئی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو، یعنی کبھی تو "سلطان" (مرزا سلطان احمد) اور کبھی "فقیر" (فقیر افتخار الدین) کے پاس بیٹھتے ہو، یہ کیا بات ہوئی؟ اِس پر علامہ نے اُس کو جواب دیا کہ تم طلسمِ ظاہری کے اسیر ہو، ورنہ :-

من کہ شمعِ عشق را در بزمِ دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

اس پر سامعین نے بے اختیار داد دی اور قطعے کو مکرر سنانے کی فرمائش کی۔ اب سامعین کی طرف سے اصرار ہوا کہ نظم کو فروخت ہونا چاہیئے، خلقت کے شوق کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک کاپی پانچ پانچ روپے میں فروخت ہوئی اور فوراً تمام کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اسی طرح علامہ کی شہرۂ آفاق نظمیں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" تھیں، جن کی بدولت انجمن کو ہزاروں روپے وصول ہوئے۔

لاہور میں قزلباشوں کا خاندان ایک خاص مقام رکھتا ہے، نواب علی رضا خاں اور نواب سرنوازش علی خاں صاحب

کے نام رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ نواب فتح علی خاں مرحوم (والد نواب مظفر علی خاں قزلباش) ایسے شاندار انسان تھے کہ ہر تعلیمی اور قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور پھر نواب محمد علی خاں قزلباش تو بڑے سخی اور خدمت گذارِ خلق تھے، اُن کا دسترخوان بڑا وسیع تھا، اسی لیے خلقت اُن کی گرویدہ تھی۔ اُن کے ہاں (۱۹۱۳ء میں) ایک بزرگ شیخ عبدالعلی صاحب ہروی رہا کرتے تھے، بلا کے مقرر اور سیاستدان تھے، وہ کبھی ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ چونکہ ایران میں رُوسی اثر بہت تیزی سے نفوذ کر رہا تھا اور سرکار شیخ اس کے خلاف تھے، لہٰذا حالات نامساعد ہونے کے باعث وہ ایران سے ہندوستان تشریف لے آئے اور نواب محمد علی خاں کے گھر مقیم ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں علامہ اقبالؒ انارکلی میں شیخ عنایت اللہ کی دوکان کے عین سامنے نیو مارکیٹ کی اوپر والی منزل میں رہا کرتے تھے، سرکار شیخ صاحب علامہ سے ملنے کے لیے وہاں آیا کرتے تھے اور پھر علامہ بھی مہینے میں کئی بار سرکار شیخ سے تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے نواب صاحب کی کوٹھی پر آیا کرتے تھے۔

یہ خاکسار اُس وقت رنگ محل اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور نواب صاحب موصوف کے دو بیٹے میرے ہم جماعت تھے، اُن سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی، اُن کی کوٹھی پر میرا پھیرا اکثر رہتا تھا۔ جب کبھی علامہ مرحوم کوٹھی تشریف لاتے تو کوٹھی میں ایک عجیب بہار آجایا کرتی تھی۔ ہم سب لڑکوں سے بہت مشفقانہ انداز سے ملتے اور پُرسشِ احوال کے بعد سرکار شیخ صاحب کے کمرے کی طرف چلے جاتے، پھر گھنٹوں تبادلۂ خیال میں مشغول رہا کرتے تھے۔

سرکار شیخ صاحب سب کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ سے جو کسی بات پر بحث چھڑی تو انہیں کھانے کا بھی دھیان نہ رہا اور ادھر ہم کھانے کے لیے بے چین تھے، آغا سعادت نے مجھ سے کہا کہ شیخ صاحب! ذرا دیکھئے تو وہاں کیا ہو رہا ہے اور قبلہ ہروی صاحب سے کہیئے کہ ہم لوگ کھانے پر اُن کے منتظر ہیں۔ اب میں نے ڈرتے ڈرتے کواڑ کھولا تو دیکھا کہ وہاں گرما گرم بحث ہو رہی ہے اور سرکار شیخ صاحب بہ شد و مد علامہ کو کوئی نکتہ سمجھا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں تو بھاگ آیا اور سب سے کیفیت بیان کی، مگر خیر، پھر چند منٹوں کے بعد سرکار شیخ صاحب تشریف لے آئے، علامہ تشریف لے جا چکے تھے اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

سرکار شیخ صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے، بڑے نستعلیق اور دھیمے مزاج کے بزرگ تھے۔

ہم سب سے حلیمانہ انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے، طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ چونکہ میری طبیعت میں قدرے بے تکلفی ہے اس لیے میں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا:۔

سرکار! بے ادبی معاف، آج ڈاکٹر اقبال سے کیا بات ہو رہی تھی؟ اِس پر سرکار شیخ نے ایک منٹ سکوت کیا اور پھر فرمایا:۔

"ذکرِ حافظ شیراز بود، اقبال عجب مردِ بے باک است ولے ہر چہ می گوید راست می گوید"

چونکہ اُس وقت ہم لوگ محض طالبعلم تھے اور فلسفے اور تصوّف سے ناآشنا تھے، اس لیے، ہم خاموش ہو رہے اور بات رفت گذشت ہو گئی، لیکن کچھ عرصے کے بعد مثنوی "اسرارِ خودی" چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو پتہ چلا کہ خواجہ حافظ شیراز پر کچھ گرم اشعار ہو گئے ہیں، یعنی ؎

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفندان الحذر

ان شعروں پر ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا اور صوفیہ کی مجالس میں صفِ ماتم بچھ گئی، علامہ پر خوب لے دے ہوئی حتیٰ کہ ایک مولوی صاحب نے ان کے برخلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں تو وہ تمام چالیس شعر چھپ گئے تھے لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں یہ اشعار حذف کر دیئے گئے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے متعلق علامہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا:۔

"وسطِ ایشیا کے قلب پر ایک پپڑی جمی ہوئی ہے، میں اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں"

علامہ ایک ہیرے کی مانند تھے، یعنی اُن کی قابلیت کے کئی روشن پہلو تھے۔ بیرسٹری کے ساتھ ساتھ تصنیف اور شعر گوئی تو ہوتی رہتی تھی لیکن اُن کی طبیعت کے یہ رنگ بھی ملاحظہ ہوں کہ اگر صبح کو جرمن سفیر سے جرمن زبان میں فلسفہ اور نطشے کے عقائد پر بحث کر رہے ہیں تو دوپہر کے کھانے پر سردار صلاح الدین سلجوقی سے حافظ شیراز اور مولانا رُوم کے متعلق فارسی میں گفتگو ہو رہی ہے، پھر شام کو کبھی کبھی پنجابی زبان کے بے مثل شاعر میاں عشق لہر آجائیں تو اُن سے کمال شوق سے

"خیال" اور نعتیں سُن رہے ہیں۔ اُن کے دل کی نزاکت کی یہ کیفیت کہ جب رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نام نعت میں آجاتا تو بے اختیار رونے لگتے اور ہچکی بندھ جایا کرتی تھی، خصوصاً جب یہ نعت پڑھی جاتی تو عجیب کیفیت ہونے لگتی اور اُن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا:۔

؎ جے دل نیڑے تے روضہ دُور کی اے ؟
نیں خبرے اوس نوں منظور کی اے ؟

اب ذرا علّامہ کے روحانی مقام کے متعلق جو واقعہ مولانا عبدالمجید سالک نے قلمبند کیا ہے، سُنئے:۔

"فورمین کرسچین کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے ایک ملاقات میں حضرتِ اقبال سے سوال کیا کہ "کیا آپ کے نبیؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے یا الفاظ نازل ہوتے تھے"۔ جواب دیا کہ "میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر نازل ہوتی تھی، یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہام ہیں۔۔۔ اس پر ڈاکٹر لوکس نے کہا "مجھے بڑی حیرت ہے کہ آپ ایسا عالی دماغ فلسفی الہامِ لفظی (VERBAL INSPIRATION) پر کیوں اعتقاد رکھتا ہے"؟۔۔۔ فرمایا۔۔۔ "میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوں، مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں محض شاعر ہوں، جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اُترنے لگتے ہیں اور میں اُنہیں بعینہٖ نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ایسا ہُوا ہے کہ میں نے اُن اشعار میں کوئی ترمیم کرنا چاہی لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جُوں کا تُوں رکھا۔ جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے تو اس میں کیا تعجب ہے کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر قرآن کی پوری عبارت نازل ہوتی تھی"۔

ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور آکر علّامہ کچھ عرصہ تو بھاٹی دروازہ کے اندر ایک مکان میں مقیم رہے اور پھر وہ انارکلی کے اُس مکان میں اُٹھ آئے جو شیخ عنایت اللہ کی دوکان کے عین سامنے ہے اور جو اُس وقت "راجہ برادرز" کی دوکان تھی اور اب وہاں نیو مارکیٹ ہے۔

علامہ مرحوم اُس زمانے میں لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ شیخ عنایت اللہ کی دوکان سے چار پانچ دوکانیں اُدھر ہمارے ایک شفیق دوست شیخ عبداللطیف ڈنٹسٹ کی دوکان تھی، یہ صاحب بڑے ہنس مکھ اور یارباش قسم کے انسان تھے اور دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کی دوکان پر بعد دوپہر دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور وہ موسم کے مطابق شربت اور چلئے کا انتظام بڑے خلوص سے کیا کرتے تھے۔

یہ خاکسار ۱۹۲۱ء کے اوائل میں ریاست کپورتھلہ کی ملازمت چھوڑ کر پنجاب سیکرٹریٹ میں بطور اسسٹنٹ ملازم ہوگیا تھا اور دفتر سے واپسی پر لطیف صاحب کی دوکان پر بالعموم پہنچ جایا کرتا تھا۔ سر عبدالقادر کے داماد شیخ عبداللطیف تپش بھی (جو ان دنوں اسمبلی میں ملازم تھے) وہاں تشریف لایا کرتے، شیخ عبدالاحد (مرحوم) سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں آن پہنچتے، دوستوں کی "پالی جمتی" اور خوب لطیفے بازی ہوا کرتی ـــــ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم سب دوست لطیفہ گوئی میں مصروف تھے کہ تپش صاحب نے ایک ایسا شعر پڑھا کہ ہم سراپا داد بن گئے، شعر ملاحظہ ہو:۔

؎ گر نہ سر پائے شود راہِ تو رفتن نتواں
جز بہ جاروبِ مژہ کوئے تو رفتن نتواں (فیضی)

اسی اثنا میں اتفاق سے علامہ کے منشی شیخ طاہر دین صاحب اُدھر آنکلے، شیخ صاحب موصوف کی ذاتِ گرامی بھی مغتنمات میں سے تھی، خلوص اور شفقت کے پتلے تھے ـــ شیخ صاحب نے جب ہمیں واہ واہ کرتے اور داد دیتے دیکھا تو دوکان کے سامنے رُک گئے اور دریافت فرمایا کہ کس شعر پر داد مل رہی ہے، اِس پر تپش صاحب نے انہیں وہ شعر سنایا۔ دراصل شعر ہی ایسا تھا کہ شیخ صاحب نے بھی بیساختہ داد دی اور دوسرے مصرع کو دو تین بار دُہرایا، دو منٹ سکوت کے بعد شیخ صاحب (طاہر دین) نے فرمایا، لیجئے ایک شعر سُنیئے:۔

؎ سر بر سرِ راہِ تُو فدا شُد چہ بجا شُد
ایں بارگراں بود، ادا شُد چہ بجا شُد (عُرفی)

ظاہر ہے کہ یہ شعر بھی بہت خوب تھا ہم نے خوب داد دی اور شیخ صاحب کے ذوقِ سلیم کی تعریف کرتے رہے۔

اب مجھے معاً حضرت علامہ اقبال کا خیال آیا اور میں نے شیخ صاحب موصوف سے دریافت کیا:

کہیئے جناب! ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے اور پریکٹس کیسے چل رہی ہے؟ (اُس زمانے میں لوگ انہیں ڈاکٹر اقبال ہی کہا کرتے تھے) شیخ طاہر دین نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب بالکل بخیریت ہیں۔ البتہ پریکٹس کے متعلق کوئی جواب نہ دیا بلکہ مجھے دوکان سے باہر آنے کو کہا۔ اُن کے ارشاد کے مطابق میں دوکان سے باہر نکل کر بازار میں کھڑا ہوگیا۔ اب شیخ صاحب نے مجھے علامہ کے مکان کے کٹہرے کی طرف دیکھنے کو کہا چنانچہ میں نے دیکھا کہ دو شخص کمبل اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ پھر شیخ طاہر دین فرمانے لگے "شکور صاحب! وہ ایک تو آپ کے ڈاکٹر اقبال ہیں اور دوسرے گرامی صاحب ہیں۔ یہ دونوں حضرات تین دن سے یہاں براجمان ہیں، یہیں کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیند آنے پر یہیں لیٹ بھی جاتے ہیں، اگر ڈاکٹر صاحب کوئی شعر پڑھتے ہیں تو گرامی صاحب سر ہلانے لگتے ہیں اور اگر گرامی صاحب کوئی شعر پڑھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب سر ہلانے لگتے ہیں، ایسے میں بھلا خاک پریکٹس چلے گی؟"

ہم سر ہلنے والے فقروں پر بہت ہنسے مگر حقیقت یہی ہے کہ اُن کا یہ فقرہ درست تھا کیونکہ جب کچھ عرصے کے بعد "پیامِ مشرق" چھپ کر آئی تو ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ حضرات کیوں ایک جگہ تین تین دن بیٹھے رہتے تھے۔ جی ہاں! کچھ ایسے ہی تو شعر ہوں گے کہ گرامی صاحب جیسے بے بدل شاعر بھی سر ہلاتے ہوں گے۔ ذرا آپ بھی سُنیں:۔

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بُردی و رسوا ساختی
جُرمِ ما از دانۂ، تقصیرِ اُو از سجدۂ
نہ بہ اُو بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی
صد جہاں می روید از کُشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہان و آں ہم از خونِ تمنّا ساختی

علامہ مرحوم کی آخری علالت کافی طویل تھی۔ ۱۹۳۷ء میں عید کا تہوار جنوری میں ہوا، علامہ صاحب عید کی نماز شاہی مسجد میں پڑھا کرتے تھے، آپ جُراب پہنے بغیر سرد فرش پر سے گذرتے ہوئے منبر کے قریب پہنچ گئے، نماز کے بعد واپسی پر اُسی طرح فرش پر سے گذرے۔ گھر پہنچ کر سیویاں کھائیں۔ (شاید دہی ملا کر) اس سے اُنہیں سانس کی تکلیف ہوگئی اور پھر آواز تقریباً بند ہوگئی، مختلف علاج

کیے گئے، تھوڑے سے عرصے کے لیے تو آرام ہو جاتا تھا مگر تکلیف پھر عود کر آتی تھی۔ آخر دہلی کے مشہور طبیب حکیم نابینا صاحب کی طرف رجوع کیا گیا اور سید نذیر نیازی صاحب (جو اُس وقت جامعہ ملّیہ دہلی میں پڑھا کرتے تھے) حکیم صاحب موصوف سے مشورہ کر کے ادویات بھجواتے رہتے اور اس طرح خط و کتابت سے علاج ہوتا رہا، اِس علاج سے بہت کچھ افاقہ ہوا لیکن کچھ مدّت کے بعد پھر آوازیں کمی ہو گئی، اور سب سے بڑا اندوہ یہ ہے کہ علّامہ کی بینائی زائل ہو گئی تھی۔

میرے ہم زلف شیخ محمد سرور انسپکٹر ریلوے (لکھنؤ) اسی بیماری میں مُبتلا تھے، حسنِ اتفاق سے لاہور کے مشہور ڈاکٹر کرنل پُوری لکھنؤ میڈیکل کالج کے طالب علموں کا امتحان لینے کے لیے وہاں کے سول ہسپتال میں گئے اور وہاں انہوں نے شیخ محمد سرور کو اس عجیب بیماری میں مُبتلا دیکھا۔ کرنل صاحب نے شیخ سرور کو مشورہ دیا کہ اس مرض کے لیے آپریشن ضروری ہے اور ہندوستان میں فقط ایک کرنل میراج ہی کر سکتے ہیں، جو اُس وقت لاہور کے میو ہسپتال میں سرجن تھے۔ کرنل پوری کی رائے پر عمل کیا گیا اور سرور صاحب کو لاہور لایا گیا، پھر کرنل میراج کرنے نہایت تندہی سے اُن کے گلے کا آپریشن کیا اور یہ عمل چھ گھنٹے تک جاری رہا، ہندوستان بھر میں یہ آپریشن دوسرا تھا جو کامیاب رہا۔ اس آپریشن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کسی نہ کسی طرح اس آپریشن کی خبر علّامہ تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ حالات دریافت کرنے کے لیے اس خاکسار کو طلب کیا گیا۔ شیخ طاہر دین مجھے سیکرٹریٹ سے اپنے ہمراہ لائے اور علّامہ کے کمرے میں لے گئے۔ اُس وقت اُن کے بہت سے فدائی مثلاً راجہ حسن اختر، خواجہ عبدالرحیم اور ڈاکٹر عبدالحمید صاحب جو وہاں تشریف فرما تھے، مصروفِ گفتگو تھے۔ علّامہ اسی پُرانے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور جسم کے گرد وہی پُرانا کمبل لپیٹ رکھا تھا جو اُن کا ہمدمِ دیرینہ تھا۔

علّامہ اِس قدر نحیف ہو چکے تھے کہ میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا مگر خاموش رہا۔ اب شیخ طاہر دین نے سب حضرات کو باہر تشریف لے جانے کو کہا، چنانچہ جب کمرہ خالی ہو گیا تو علّامہ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور مجھ سے خیریت دریافت کرنے کے بعد میرے عزیز کے مرض اور آپریشن کے متعلق پوچھا۔ میں نے مختصراً دونوں کی کیفیت بیان کی۔ علّامہ غور سے سنتے رہے، میری ناقص رائے میں اگرچہ علّامہ مرحوم کا مرض بھی قریب قریب وہی تھا جو میرے عزیز کا تھا مگر میں نے اُن کی تسلّی خاطر کے لیے کہا:۔

جناب! آپ کا مرض وہ ہرگز نہیں جو میرے عزیز کو لاحق تھا اور جس کے لیے آپریشن کی ضرورت

پڑی، حضور کا مرض تو مختلف ہے اور امید ہے کہ قبلہ حکیم قرشی صاحب کے علاج سے انشاء اللہ جلد آرام ہو جائے گا۔

میری بات ختم ہونے پر علامہ مرحوم نے جو فقرے کہے وہ یادگار ہیں، فرمانے لگے "شیخ صاحب! آپ ہمیں کیا تسلی دیتے ہیں، ہم بہت زندگی دیکھ چکے ہیں اور موت سے کوئی ڈر نہیں، دعا کریں کہ ہماری عاقبت نیک ہو۔"

یہ ایسے فقرے تھے کہ میرے آنسو بے اختیار نکل پڑے، واقعی خاصانِ خدا کا شیوہ یہی ہے:

"چو مرگ آید تبسم بر لبِ اُوست"! ازاں بعد علامہ کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ اسلامی کا وہ چراغ جس سے لوگ نور حاصل کرتے تھے، ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ آج سے چالیس سال پیشتر ایک مشہور ہندو مصنف لالہ مالک رام ایم، اے نے علامہ مرحوم کے متعلق جو شذرہ تحریر کیا تھا وہ بھی سننے کے قابل ہے:-

"اقبال" کی شاعری اب یاس وقنوط کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور نئی عمارت کو متفاولی بنیادوں پر قائم کیا ہے، اُس کا نام "وعدہ" اور "بشارت" کے مترادف ہے۔ اُس نے زمانۂ حاضر کے غیر معمولی اثر پر قابو پا لیا ہے جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا، اور یہ سب کچھ اُس نے اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے، جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے، اُس کی روحانی تعلیم نے اُس انانیت کو فتح کر لیا ہے جو اِس مادی دور کی پیداوار ہے۔ اقبالؒ اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزلِ مقصود حرمِ محترم ہے۔"

حواشی

۱؎ یہ بیان درست نہیں ہے، اس حساب سے "شمع و شاعر" کا سال تصنیف ۱۹۱۸ء قرار پاتا ہے، حالانکہ یہ نظم ۱۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو "انجمن حمایتِ اسلام" کے ستائیسویں اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی۔ یہی مضمون سب سے پہلے ہفت روزہ "لاہور" کی اشاعت ۲۴ر فروری ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں "شمع و شاعر" کا سالِ تصنیف "پچاس سال" پہلے یعنی ۱۹۱۴ء قرار پاتا ہے۔ "سب رس" کے مدیر نے ہفت روزہ "لاہور" میں شائع ہونے والے متن میں جا بجا اصلاح کی ہے، اگرچہ زیادہ تر اصلاح الفاظ تک ہی محدود ہے، تاہم بعض صورتوں میں یہ اصلاح نامناسب ہے۔

۲؎ ہفت روزہ "لاہور" کے متن میں "ماتھا" چومنے کا ذکر ہے۔

۳؎ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے نام لکھے گئے خطوط میں علامہ اقبالؒ نے ان کا ذکر کیا ہے۔

ایک بار راقم الحروف مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت کی معیت میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور علامہ صاحب اپنا حُقّہ گڑگڑاتے رہے۔ ایک بار مولانا حسرت سے پوچھا کہ سنائیے آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ حسرت صاحب دیر سے حُقّے کے انتظار میں بیٹھے تھے، فوراً بولے آپ کے حُقّے کی خودی پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ ہے، علامہ صاحب نے ہنستے ہوئے اپنے حُقّے کی نَے حسرت صاحب کی طرف گھما دی۔ کچھ دیر کے بعد اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کا ذکر چلا، اور مولانا سالک نے بتایا کہ عنقریب مولانا اپنے اخبار میں باقاعدگی سے غیر ملکی مختصر افسانوں کے تراجم شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے فرمایا "تو پھر ان مختصر افسانوں کے سرِفہرست 'الگزنڈر ڈوما کا ناول کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو' ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ ضخیم ناول ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

(حرف و حکایت: پنج دریا: امروز ۲۲ر اپریل ۱۹۵۳ء)

دانائے راز ——— خواجہ غلام السیدین

ڈاکٹر اقبالؒ

اقبال سے آشنائی تو ان کے کلام کے ذریعہ اس وقت تھی جب اس کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا شعور نہ تھا لیکن جب تھوڑا بہت ادبی ذوق اور ان کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو بہت جلد یہ شناسائی عقیدت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر کئی مرتبہ، جب کبھی لاہور جانا ہوا، ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت ملی، کچھ خط و کتابت بھی رہی، ایک مرتبہ علی گڑھ میں ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا جب وہ یونیورسٹی کی دعوت پر "اسلامی فکر کی تعمیرِ نو" پر اپنے خطبات دینے وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ بھوپال میں سر راس مسعود کے ہاں مقیم تھے ان کے ساتھ چند روز گذارنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کتنی مختصر تھیں یہ ملاقاتیں جن سے ایک طرف حافظہ اب تک روشن اور لطف اندوز ہے اور دوسری طرف اس محرومی کی خلش کھٹکتی ہے کہ سمندر کی ہم عصری نصیب ہوئی اور چن پائے چند خزف ریزے! لیکن پھر سوچتا ہوں کہ شخصیت، علم و فضل، عظمت و کمال کے سرچشموں سے نیاز مندی ایسی چیز نہیں جن کو وقت کے گز سے ناپا جائے۔ اس لیے ذاتی صحبت اور ملاقات میں جو بھی فیض کے جو موقعے ملے اس کے لیے شکر کرنا چاہیے پھر ان کے فکر و کلام کی دولت، جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے، گزشتہ چالیس سال سے میرے مطالعہ میں رہی ہے اور جوں جوں اس پر غور کیا اس کی معنویت اور اس کے حیات بخش پیغام کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔

مشاہیر میں سے دو بزرگوں کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ دوسرے سر سید راس مسعود۔ اس عقیدت مندی میں ہندوستان کے ہزاروں لاکھوں آدمی میرے شریک ہیں۔ کیونکہ ان کی صحبت ایک فیض جاری تھی۔

جس میں ہر قسم کے لوگ آتے اور اپنی صلاحیت کے مطابق مستفید ہوتے طالب علمی کے زمانہ میں مجھے اقبال کی ذات سے بالواسطہ یعنی ان کے کلام کی وجہ سے عقیدت تھی لیکن جب ان کی ملاقات کی نعمت نصیب ہوئی تو مجھے اس حقیقت کا از سرِ نو احساس ہوا کہ جو انسان واقعتاً بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ ان کا روشن دماغ ایک فوارۂ نور تھا جو ایک متحرک لائٹ ہاؤس کی طرح چاروں طرف کے اندھیرے کو روشن کر دیتا تھا۔ ان کے خیالات میں جدت اور شگفتگی اور اظہارِ خیال میں ایک خاص قدرت تھی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے جس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے، اس میں ان کا معنی آفریں دماغ عجیب عجیب اور نئے نکتے پیدا کرتا اور ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک مسئلے میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ لیکن برخلاف عام شعرائے کرام کے جو خود کو براہِ راست خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعے اور غور کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مطالعہ تمام عمر نہایت سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کی بدولت ان کا علم و عرفان زیادہ تر وسیع اور گہرا اور متنوع ہوتا گیا۔ اور ان کی شاعری ایک آلۂ تفریح کے بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کی شاعری اور فلسفے میں بھی ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبرئیل اور ابلیس۔ رومی اور نیٹشے، غالب اور گوئٹے۔ بھرتری ہری اور قرۃ العین سب کے لیے گنجائش تھی۔ کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلو لے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ کا مرکز اسلام کی تعلیم کی صحیح اور متبحرانہ تفسیر تھی لیکن انھوں نے کبھی عام مولویوں کی طرح دنیا کے گوناگوں علوم اور مشاہدات اور تجربات سے روگردانی نہیں کی بلکہ ہر طرف کی روشنی سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔ عمر کے آخری دور میں ان کی شانِ فقر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ دنیا کی جھوٹی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔

میرِ انشمین نہیں درگہِ میر و وزیر
میرِ انشمین بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی حاجت تھی نہ اجازت طلبی کی ضرورت۔ ان کا دروازہ امیر و غریب، عالم و جاہل۔ دیسی بدیسی سب کے لیے کھلا تھا اور ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے، علمی، سیاسی، مذہبی مسائل پر بحث کرتے مقامی معاملات پر مشورہ کرتے۔ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنتے، حقہ پیتے۔ بعض محض زیارت کرتے اور اس بندۂ خدا کے دل میں سب کے لیے جگہ تھی۔ ہر ایک سے اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق مخاطب ہوتے اور انسانیت کے رشتۂ مشترک کا پورا احترام کرتے۔ جب کوئی صلاحیت رکھنے والا شخص ان کی صحبت سے اٹھتا تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت بہت کم لوگوں کو اس قدر روشن دل و دماغ بخشتی ہے!

شعر اور فلسفہ کا میل کوئی آسان چیز نہیں۔ بعض شاعروں کا فلسفیانہ رجحان ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری ان کے فلسفے کی سیل کو نہیں تھام سکتی، فلسفہ سے مرعوب ہو کر رہ جاتی ہے! بعض شاعر محض زبان کی تراش و خراش اور لطف پر بس کرتے ہیں۔ اُن کا کلام یا تو معنی کے لحاظ سے کھوکھلا ہوتا ہے یا ان کے شعروں میں صرف ہنگامی جذبات اور تاثرات کی عکاسی ہوتی ہے اور بس۔ اقبال کا کلام معنی اور بیان دونوں کے اعتبار سے ایک حسین اور فکر انگیز شاہکار ہے جس میں لطف بیان اور معنی آفرینی کا ایک نادر امتزاج پایا جاتا ہے۔ اگر شاعری محض "معنی منظوم" ہو تو اس میں کشش نہیں ہوتی۔ اگر صرف لفظوں کا کھیل ہو تو دماغ کو اسیر نہیں کر سکتی۔ اقبال کے کلام کو پڑھتے ساری عمر بیت گئی۔ لیکن اس کی شگفتگی، اس کی نشاط انگیزی، اس کی معنی آفرینی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کے نئے نئے پہلو ذہن کے سامنے آتے رہتے ہیں اور اس کی روشنی زندگی کے نئے گوشوں کو منور کرتی ہے۔ ان کا دماغ ایک متحرک فوارہ نور تھا۔ جس طرف مڑ جاتا جوت جگا دیتا۔ اُن کے خیالات میں جدت اور روشنی تھی اور اظہار خیال میں ایک خاص

شگفتگی - وہ جس مسئلے کو بیان کرتے، جس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے اس میں اُن کا معنی آفرین دماغ انوکھے نکتے پیدا کرتا ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک عالمانہ بحثوں میں بھی دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعرائے کرام کے، جو خود کو براہ راست خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعہ اور غور و فکر کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں، انہوں نے ساری عمر سنجیدہ مطالعہ کا شغل جاری رکھا اور اس مطالعہ اور فکر خلاق کی بدولت ان کا علم اور عرفان زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا گیا اور ان کی شاعری محض سرمایہ تفریح ہونے کی بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کے کلام اور فلسفے میں ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبرئیل اور ابلیس رومی اور نیتشے، غالب اور گوئٹے، رام اور بھرتری ہری، فاطمہ زہرا اور قرۃ العین سب کے لیے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے کشمیر کے خطبات میں بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ اقبال میں یہ فکری رواداری کس قدر کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور انہوں نے کس عقیدت اور محبت کے ساتھ مثلاً ہندو فلسفیوں، مفکروں اور مذہبی رہنماؤں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے فکر کا مرکز یقیناً اسلام کی تعلیم تھی اور اس کی مبصرانہ تفسیر لیکن انہوں نے کبھی عام مولویوں اور تنگ نظر عالمانِ دین کی طرح دوسرے مذہبوں کی تعلیم یا جدید علوم اور تجربوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہر طرف سے روشنی لی اور اس سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔

اقبال کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی نئی بات کہنا آسان نہیں۔ لیکن ہر شخص کا اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر ہوتا ہے جس سے وہ افراد اور واقعات اور فکری تحریکوں کو جانچتا اور پرکھتا۔ شاید اس طرح غیر شعوری طور پر خود کو بے نقاب کرتا ہے۔ اقبال کی [illegible] سے پہلو ہیں جن میں سے صرف دو کے ذکر پر بس کروں گا۔ ایک تو اقبال [illegible] کی شان جس میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام کی انسان دوستی اور عالمگیریت جو میرے نزدیک ان کی فکر کی سب سے بڑی

اور امتیازی خصوصیت ہے۔

اقبال کا ایک شعر ہے :؎

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال کی صحبت میں ایسی ہی ایک بارگاہ کی شان نظر آتی تھی۔ ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی اجازت تھی، نہ اجازت طلبی کی ضرورت، نہ چھوٹے بڑے، گمنام نامور، دیسی بدیسی، جاہل عالم، غریب امیر، ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تمیز ان کے گھر کی طرح ان کے دروازے بھی تمام انسانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے مگر اس میں مختلف لوگوں کے لیے الگ الگ خانے نہ تھے۔ ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے اور اس چشمۂ فیض سے اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہو کر جاتے۔ بعض علمی، سیاسی، فلسفی، مذہبی مسئلوں پر گفتگو کرنے آتے۔ بعض مقامی معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے۔ بعض ان کی گفتگو سے لطف اٹھانے اور ان کے شوخ لطیفوں اور قصّوں کو سننے، بعض محض گپ کرنے اور حقہ پینے اور بعض شوق زیارت میں۔ کئی مرتبہ یہ تماشا دیکھا کہ وہ اپنے برآمدے میں ایک نیم شکستہ مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور ہر طرح کے لوگ، طالب علم، پروفیسر، مغرب کے ارباب علم و ادب، سوسائٹی کی مشاہیر نواز خواتین، گاؤں کے جاہل لیکن عقیدت مند ملاقاتی، اُن کے پاس آئے اور وہ سب سے ان کی عقل اور دل چسپی کے مطابق تپاک کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتوں میں دل چسپی لیتے۔ نہ کسی کی جہالت اور آداب مجلس سے واقفیت پر چیں بہ جبیں ہوتے نہ کسی کی قابلیت اور وجاہت سے مرعوب۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی مشہور غیر ملکی مفکر سے فلسفہ یا ادب کی گہری حقیقتوں پر گفتگو کر رہے ہیں اور بیچ بیچ میں اُن کے نیم جاہل ملاقاتی، جن کو اس گفتگو کی سمجھ ہوتی، نہ اس میں دل چسپی، حقے کی نے کو ان کی طرف موڑتے اور سلسلۂ کلام کو بے تکلفی سے توڑ کر کہتے۔ ڈاکٹر صاحب تم حقہ پیو نا، اور ڈاکٹر صاحب فلسفے کو ملتوی کر کے ان سے ایک

دو باتیں کرتے یا ایک آدھ فقرہ چست کرتے اور پھر اپنی سنجیدہ علمی گفتگو میں مشغول ہو جاتے! اس وقت اُن کا دماغ کبھی علم و ادب کے خزانے لٹاتا۔ کبھی تاریخ اور فلسفے کے رازوں کو بے نقاب کرتا۔ کبھی ایک تیز نشتر کی طرح زندگی پر تنقید کرتا اور سماجی ناسوروں سے فاسد مادے کو خارج کرتا۔ کبھی اہل سیاست کے بلند آہنگ دعووں اور ریاکاریوں کا پول کھولتا۔ لیکن اس تنقید میں نہ مردم بیزاری تھی نہ مردم آزادی۔ ہاں شوخی اور ظرافت ہوتی، برتر فکر اور بہتر زندگی کی ترجمانی ہوتی اور گداز قلب کی دھڑکن۔ اور یہی جذبہ ان کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔ جب کوئی صاحبِ ذوق یا باعلم شخص ان کی صحبت سے اٹھتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ذہن اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انہیں لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ فکر نہ ہوئی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قائم کریں اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالیہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلندی کا اعلان نہیں کرتا! ان کو نہ سربلندوں سے انکسار تھا۔ نہ خاکساروں سے سربلندی۔ ہر شخص انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی سلوک کا مستحق تھا۔ بلکہ میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو!" برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں کے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے نا جنھوں نے کہا ہے:

خیر و خوبی برخواص آمد حرام　　زیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

دراصل اقبال کو جو زبردست شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ ان کی غیر معمولی قابلیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف ہے جو خلاف معمول انہیں اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوا۔ ورنہ دنیا میں نام حاصل کرنے کے لیے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے وہ بیگانہ تھے۔ دنیاوی ترقی مصلحت پسندی چاہتی ہے اور ان کا اصول تھا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

دنیاوی ترقی کا مطالبہ یہ ہے کہ جو صاحبان قوت اور اختیار ہیں ان کی ہم نوائی کرو اور ان کے خوان کرم سے جو ریزے گریں ان کو شکریے کے ساتھ قبول کرو لیکن یہاں حق گوئی اور بے باکی کی بدولت اپنوں اور بیگانوں سب کو ناراض کرنے کا حوصلہ تھا اور زہر ہلاہل کو قند کہنے سے انکار۔ انہوں نے کبھی مصلحت اندیشی کے خیال سے اپنی بیحی اور بے امان تنقید کی تلوار کو میان نہیں کیا اور کس کس پر تنقید نہیں کی؟ حکومتِ برطانیہ، حکومتِ ہند اور حکومتِ پنجاب پر، ہندوؤں اور مسلمانوں پر، غلامی کی ذہنیت اور آزادی کی بے راہروی پر، مشرقی تصوف اور مغربی تہذیب پر، سرمایہ داری اور سوشلزم پر، جمہوریت اور فاشزم پر، شاعری پر، جوانیوں کی طرح خواب آور ہو، عقل پر جس کی مہار عشق کے ہاتھ نہ ہو، یعنی ان تمام بتوں پر جو افراد اور جماعتوں نے اپنے دل و دماغ میں بٹھا رکھے ہیں اور جن کی پوجا میں وہ اکثر بنیادی صداقتوں کو بھول جاتے ہیں ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں — مجھے ہے حکمِ اذاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ!

اگر وہ زبانِ نثر میں یہ سب باتیں کہتے تو حکومت کو ان کی زبان بندی لازم ہو جاتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ حکومتوں میں ادبی ذوق اور شعر سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

مگر بت شکنی کتنی ہی ضروری ہو وہ بت شکن کو ہر دل عزیز نہیں بناتی، یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ باوجود عمر بھر اس ناگوار فرض کو انجام دینے کے انہوں نے، اُن کے فکر نے، اُن کے کلام نے، ہماری نسل کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور وہ ہماری ذہنی، جذباتی اور روحانی میراث کا ایک جزوِ عزیز بن گئی ہے۔ (ماخوذ از "آندھی میں چراغ")

میرا بھائی[1]

علّامہ مرحوم کی بہن کی زبانی

اقبالؒ ۱۸۷۳ء[2] میں پیدا ہوئے، میں ان سے تین سال چھوٹی تھی، ہم گھر میں چار بہنیں اور دو بھائی تھے، اس سے پہلے دو بھائی اور دو بہنیں پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارے ہوئے۔

میرے والد بہت صوفی منش بزرگ تھے، ان کے متعلق ہم بھائی بہنوں کو یہ علم تھا کہ ہم سب جب سو جاتے ہیں تو وہ اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں، وہ صاحبِ احوال بزرگ تھے۔ ایک رات جو میری بڑی بہن جاگیں تو انہوں نے دیکھا کہ ابا کے کمرے میں دودھیالی روشنی ہو رہی تھی، دوسرے روز میری بہن نے ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا، تو ابا نے صرف اتنا کہا "تمہیں یہ کیسے پتہ چل گیا؟" اور پھر اپنے اوراد و وظائف کے لیے ایک دوسری جگہ تلاش کر لی۔

اقبال کی پیدائش سے پہلے میرے والد نے خواب دیکھا کہ ایک کبوتر اڑتا اڑتا ان کی جھولی میں آ گرا، میرے والد نے سمجھا کہ یہ ایک خوش بخت اور بلند اقبال بیٹے کی پیدائش کی بشارت ہے[3]۔

میری والدہ غریب الطبع اور روزے رکھنے والی بزرگ خاتون تھیں، وہ گھر کا بڑا اچھا انتظام رکھتی تھیں، والد کو گھر کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہ تھی، گھر کا سارا کام کاج والدہ کے ذمہ تھا، کیا مجال جو وہ گھر کے انتظامات میں ذرہ بھر بھی گڑبڑ پیدا ہونے دیتیں۔

اقبال کے پیدا ہوتے ہی ہمارے گھر کا نقشہ بدلنے لگا، میرے والد کی آمدنی جو گذارہ کے لیے پہلے بھی کافی ہوتی تھی بڑھ گئی اور ہمیں جیب خرچ کے لیے ایک دھیلے کے بجائے ایک ایک پیسہ ملنے لگا۔

"اُس زمانہ میں ایک پیسے کے دو[4] بلکہ چار لڈو ملا کرتے تھے۔"

والد صاحب یوں تو ہم سب کو ہی بیار کیا کرتے تھے لیکن انہیں اقبال سے خاص شغف تھا، انہوں نے اقبال کو کبھی ایک بار بھی تُو یا تُم کہہ کر نہیں بلایا بلکہ جب کبھی اقبال کے متعلق اُن کی غیر حاضری میں والدہ سے بات کرتے تو انہیں جمع کے صیغے میں یاد کرتے تھے، مثلاً "اقبال ہورں کتھے نیں"؟

ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر اقبال کے گالوں پر چانٹا رسید کیا تو والد نے انہیں یہ کہہ کر فہمائش کی کہ حضورؐ نے تاکیداً فرمایا ہے کہ بچوں کے گال پر چانٹا نہیں مارنا چاہیئے

اس وقت ہماری نانی زندہ تھیں، ہم دونوں بھائی بہن نانی کے ہاں چلے جایا کرتے اور بیر کے درخت پر چڑھ جاتے اور بیر توڑ توڑ کر کھایا کرتے۔ نانی ہزار جان سے فریفتہ ہو کر اقبال کی بلائیں لیتیں۔

اقبال نے ختمِ قرآن کے بعد مولوی میر حسن کے گھر پر پڑھنا شروع کر دیا، میں لڑکیوں کے سکول میں جاتی تھی۔ بالآخر جب اقبال سکول میں داخل ہوئے تو مجھے یاد ہے کہ وہ چھٹی میں ہوتے تھے اور میں تیسری جماعت میں۔

وہ کھلنڈرے بہت تھے سکول سے واپس آتے ہی بستہ پھینک پھانک کر کبوتر اڑانے کے لیے بھاگ جاتے، پھر بھی اتنے ذہین تھے کہ چوتھی جماعت میں انہوں نے وظیفہ حاصل کیا لیکن نویں جماعت میں فیل ہو گئے تھے، اسی طرح ایم اے کے امتحان میں بھی وہ پہلی بار فیل ہو گئے تھے۔

اس زمانے میں سیالکوٹ میں سستی چیزوں کا میلہ لگا کرتا تھا، لوگ سوانگ بھر کر بازاروں میں پھرا کرتے تھے، میں بھی میلہ دیکھنے کے شوق میں راج بازار چلی گئی، اقبال نے مجھے وہاں دیکھ لیا سخت برہم ہوئے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر واپس گھر پر چھوڑ گئے، حالانکہ میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ وہ جب کبھی مجھے ننگے سر دیکھتے تو ٹوکا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے سر سے دوپٹہ اتارنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

انہیں پتنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا، پہروں کوٹھے پر چڑھے پتنگ اڑایا کرتے۔

اقبال نویں جماعت میں تھے کہ ان کی منگنی ہو گئی۔ دسویں جماعت میں ان کا بیاہ ہو گیا۔ اقبال کی پہلی بیوی ان سے عمر میں بڑی تھیں، اس لیے شروع ہی سے ان دونوں کی طبیعت نہ مل سکی۔

دسویں جماعت کے بعد والد نے صلاح کی کہ اقبال کو تجارت میں لگا دیا جائے لیکن

والدہ نے اصرار کیا کہ انہیں ضرور پڑھانا چاہیئے، چنانچہ اقبال کو سیالکوٹ کے مرے کالج میں داخل کرا دیا گیا۔

ہمارے ہمسایہ میں ایک بیاہی ہوئی نوجوان لڑکی رہتی تھی جس کا خاوند پردیس گیا ہوا تھا۔ وہ گاہے بگاہے اپنے خاوند کو مجھ سے خط لکھواتے۔ اُس کا آیا ہوا خط پڑھوانے آیا کرتی تھی، اقبال کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے بُرا منایا اور والدہ کو علیحدہ بلا کر کہا کہ بیاہی ہوئی لڑکی کا اپنے خاوند کے نام کنواریوں لڑکیوں سے خط لکھوانا ٹھیک نہیں۔

جب اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت گئے تو والدہ دن رات ان کیلئے دُعاؤں میں مصروف رہتیں، ہر بُدھ وار کو اقبال کا خط آیا کرتا تھا، میری والدہ نہا دھو کر خط کے انتظار میں تاکی کے پاس بیٹھتیں اور جب ڈاکیہ آتا تو وہ ہمک کر اس سے خط لیتیں اور ہم سے کئی بار پڑھوا کر سُنا کرتی تھیں، اِقبال ہر خط میں والدہ کو دُعاؤں کے لئے لکھا کرتے تھے۔

جب والدہ کا انتقال ہوا تو ہم سب بھائی بہن سیالکوٹ میں اکٹھے ہوئے، اقبال بھی لاہور سے پہنچے، انہوں نے والدہ کے جنازے کے قریب کھڑے ہو کر کہا :-

"میں تیرے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا"

بات یہ تھی کہ جب اقبال دُودھ پیتے تھے تو ہمارے والد کی آمدنی کے متعلق والدہ کو کچھ شک ہو گیا۔ والدہ نے اقبال کو چھاتی سے دُودھ پلانا بند کر دیا، اور اپنا زیور بیچ کر انہیں دُودھ پلانے کے لیے بکری خرید لی۔ جب تک والدہ کو والد کی کمائی کے متعلق پورے طور پر یقین نہ ہو گیا اُنہوں نے چھاتی سے دُودھ نہ پلایا۔ اس طرح ننھے اقبال کے جسم میں رزقِ حلال کے علاوہ مشتبہ کمائی میں سے دُودھ کا ایک قطرہ بھی جانے نہ دیا، اقبال والدہ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولے۔

جب ہم اپنے گھروں میں آگئیں تو اقبال سے ملاقات کم ہو گئی، لیکن پھر بھی جب میں یا میری دُوسری بہنیں ان سے ملنے جاتیں تو وہ ہمیں روپے دیا کرتے تھے، عید بقرعید کے موقعہ پر تو وہ کبھی ہمیں بھولتے ہی نہ تھے۔

ان کے انتقال سے کافی عرصے پہلے میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی، میری چھوٹی

بہن بیماری میں اُن کے پاس تھیں، انہوں نے میرے متعلق پوچھا بھی اور مجھ سے ملنے کی خواہش بھی کی لیکن میں اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی میں تھی اور پھر اس کی تبدیلی پر شملہ چلی آئی، اس لیے مجھے ان کی بیماری کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک روز میرا بیٹا[۴] دفتر گیا تو اخبار ہاتھ میں لیے جلدی ہی واپس گھر آگیا اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ بھائی کے مرنے کی وجہ سے دفتروں میں چھٹی ہوگئی تھی، میں جب لاہور پہنچی تو انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔

حواشی

[۱] یہ مضمون علامہ کی چھوٹی بہن کریم بی۔ کے ایک انٹرویو سے مرتب کیا گیا ہے جو محمد شفیع نے اُن سے لیا اور آفاق لاہور ۳۰ر اپریل ۴۹ کی اشاعت میں چھپا۔

[۲] انہوں نے علامہ کا سال یاداشت سے لکھا ہے ان کا قیاس بڑی حد تک درست ہے، جدید ترین تحقیق کے مطابق علامہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔

[۳] یہ واقعہ علامہ کی تقریباً تمام سوانح میں مذکور ہوا ہے۔

[۴] غالباً اشارہ اپنے بڑے لڑکے ظفرالحق کی طرف ہے۔

صیقلِ ادراک

آفتاب اقبال بیرسٹر ایٹ لاء

میں پوری صداقتِ دل کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جو نسبت ایک ذرہ بے مقدار کو آفتابِ عالمتاب سے ہے وہی نسبت مجھ کو اپنے عظیم المرتبت والد سے ہے، اگر کوئی تابندگی میری زندگی میں آپ کو نظر آئی تو اس کا سرچشمہ اور منبع وہی آفتابِ تاباں ہے جس کا میں ایک ذرہ ہوں، مجھ میں واقعی اگر کوئی خوبی ہے جس کا نہ مجھ کو علم ہے نہ دعویٰ، تو وہ یقیناً میرے عدیم المثال والد کا ترکہ اور میرے بزرگوں کی دعاؤں کا صدقہ ہوگا۔

میں اپنی خداداد طبیعت کے بارے میں خدائے قدوس کا بے حد شکر گذار ہوں، میرے بزرگ دادا شیخ نور محمد صاحب نے مجھے بارہا نصیحت کی تھی کہ ایک خدا کا جانے والا سوائے خدا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتا اور نہ اپنے حسب نسب پر فخر کیا کرتا ہے، شکر ہے کہ آج تک نہ میں کسی انسان سے ڈرا، اور نہ میں استخوانِ بزرگ فروش بنا، میں نے کبھی اپنے باپ کے نام کو ذریعہ معاش نہیں بنایا، جنگِ زندگی میں نہ کسی سے کسی قسم کی مدد کا طلبگار ہوا، کیونکہ یہ میرے والد بزرگوار کی تعلیم اور میری طبیعت کے سراسر خلاف تھا، والد مرحوم نے حسب ذیل اشعار میں جو اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اس کا کچھ نہ کچھ عکس میں اپنے اندر بھی ضرور دیکھتا ہوں ؎

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر خاک میری طاقتِ پرواز
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

پھر کہا ہے

یارب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
نو برگ گیا ہے نہ وہی اہلِ خرد را
او گشت گل و لالہ بخشند نجرے چند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بیں و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوقِ شکر خند
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

رہی میری پریشانیاں، ان کے لیے صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں ؎

میں کیوں کہوں کہ غمِ زندگی گراں گذرا
وہ ساتھ ساتھ رہے ہیں جہاں جہاں گذرا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

اقبال جیسے شاعر، مفکر اور لیڈر دنیا کی تاریخ میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دُنیا کی اُن بڑی ہستیوں میں سے تھے جن کی عظمت وقت کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے، ان کی مثال ایک ایسے عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہے جس کی بلندی اور عظمت کا صحیح اندازہ اس سے قریب کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتا، آنے والی نسلیں اقبال کو ہم سے بہتر سمجھ سکیں گی۔ اور ان کی تعلیم ان کے لیے مشعلِ راہ ہو گی۔ میں جب دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر غور کرتا ہوں تو معاً مجھے اُن کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہے تُو
تیرے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل[۲]

حواشی

[۱] آفتاب اقبال..... علامہ کی پہلی بیوی کریم بی کی دوسری اولاد، ولادت ۱۸۹۹ میں ہوئی..... ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی، ۱۹۲۱ میں فلسفہ میں ایم۔اے کیا، ۱۹۳۱ میں لندن سے بیرسٹری کی، کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے ــــ ۱۹۴۱ تک اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا ــــ ۱۹۴۲ میں وکالت کا آغاز کیا، قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کراچی منتقل ہو گئے اور تادمِ وفات یہیں پریکٹس کرتے رہے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ــــ آفتاب اقبال اور اُن کی والدہ سے علامہ کے تعلقات کشیدہ رہے۔

[۲] شائع شدہ "ساغر"، کراچی ۲۵ دسمبر ۱۹۶۷ء

آباجی

بیگم منیرہ صلاح الدین

زندگی کی بے ثباتی، خوابِ ہستی کا وہ فریب ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے چاند مٹی میں جا ملتے ہیں کہ عقلِ انسان حیران رہ جاتی ہے۔ زندگی کا یہ جال کچھ اس طرح اُلجھا اُلجھا اور اتنا بکھرا بکھرا سا ہے کہ باوجود کوشش کے بھی ہم اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ وقت اس طرح ذرّوں میں بٹ گیا ہے کہ بسا اوقات کاروبارِ حیات میں کھو کر کبھی کبھی انسان اپنے بارے میں بھی بھول جاتا ہے۔ یُوں وقت کے سیلِ رواں میں بہتے ہوئے ہمیں یہ احساس تک نہیں ہو پاتا کہ کتنی حقیقتیں کب اور کس قدر خاموشی سے فسانہ بن گئیں۔ مشیتِ ایزدی پر مسلمان کا ایمان ہے، اس کے باوجود کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کاش آباجان میرے باشعور ہونے تک زندہ رہتے، مگر خواہشات کا پورا ہونا ممکن نہیں ہوتا، آج بھی جب میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو میرے سامنے آباجی کا ہنستا مسکراتا چہرا اپنی تمام تر عنایتوں کے ساتھ اُبھرتا ہے، جہاں یہ بھولی بسری یادیں ذہن و دل کو پریشان کر سکتی ہیں وہاں اکثر تسکینِ قلب کا باعث بھی بنتی ہیں۔

حضرت علامہ کی وفات کے وقت میں بہت چھوٹی تھی..... مجھے یاد ہے کہ مسز ڈورس احمد[1] جو ایک جرمن خاتون ہیں، میری والدہ محترمہ کی وفات کے بعد انہوں ہی نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو ایک مشفق ماں کی طرح پالا۔ ہماری دیکھ بھال کے علاوہ وہ تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتی تھیں، اُن کی حیثیت ہمارے گھر میں ایک فرد کی سی تھی۔ ایک دفعہ میں نے برجستہ انہیں کلمہ شریف سُنانے کے لیے کہا، مسز ڈورس احمد نے نفی میں سر ہلایا، تب میری حیرانی کو بھانپتے

ہوئے آپ نے مجھے پیار سے اپنے پاس بلایا اور پیار کرتے ہوئے کہا ہاں منیرہ تم آج یہ کلمہ شریف سکھاؤ۔

اقبالؒ ——— ایک تاثر

بیگم محمودہ ریاض

منیرہ صلاح الدین کا گھریلو نام بانو ہے، رشتے داروں اور عزیزوں کے ہاں وہ بانو کے نام سے پہچانی جاتی ہیں مگر حضرت علامہ اقبال انہیں ہمیشہ منیرہ کہتے تھے۔ بانو پر گھر کے مذہبی ماحول کا خاصا اثر تھا۔ ایک دفعہ علامہ اقبالؒ گول میز کانفرنس میں لندن شرکت کے لیے تیار ہوئے، جانے سے پہلے انہوں نے میرے نانا میاں نظام الدین کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے منیرہ کا ذکر بار بار کیا اور لکھا کہ میرے بچوں کی دیکھ بھال میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو، انہیں ہر قسم کی آسائش زندگی مہیا کی جائے۔ اس خط میں منیرہ کی تربیت کے بارے میں لکھا کہ اس کی پرورش خالص مذہبی اور اسلامی انداز میں کی جائے۔ علامہ منیرہ کے ساتھ انتہائی شفقت کا مظاہرہ کرتے، جب آپ لیٹتے بانو کو اپنے سینے پر بٹھا لیتے اور وہ بھی خوشی سے کودنے لگتی۔ وہ انہیں پیار کرتے میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منیرہ اپنے بھائی جاوید اقبال سے بہت چھوٹی تھی، اور والدہ کے انتقال کے بعد حضرت علامہ پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں، جن کو نبھانے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے ان کا کلام پڑھا تھا جس کا اثر آج بھی گہرا ہے، اب بھی اکثر اشعار مجھے ازبر ہیں ؎

؎ حقیقت ازلی ہے رقابتِ اقوام — نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تُو

؎ رہے گا تُو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا — اُتر گیا جو تیرے دل میں لا شریک لا

حواشی

۱ ڈورس احمد — پورا نام ڈورس لینڈور (DORIS LANDWEHR) ہے جو ڈاکٹر تاثیر کی سالی تھیں۔ جرمن نژاد خاتون جو علامہ کی اہلیہ کی وفات کے بعد گورنس کی حیثیت سے علامہ کے خاندان میں شامل ہوئیں۔

۲ بیگم منیرہ صلاح الدین .... علامہ کی اکلوتی صاحبزادی ہیں جو لاہور کے مشہور سیاستدان صلاح الدین کی اہلیہ ہیں۔ (پیدائش ۱۹۳۰ء) بیگم محمودہ ریاض منیرہ کے سسرالی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور میاں نظام الدین کی نواسی ہیں۔

یہ دونوں تاثراتی مضامین زرعی ترقیاتی سپلائی کارپوریشن کے رسالے "اپنی زمین" سے ماخوذ ہیں، یہ تاثرات انٹرویو کی شکل میں ریکارڈ کئے گئے تھے۔ جسے ہم نے مضمون کا روپ دیا ہے۔

۱۹۳۲ء کی آخری سردیاں تھیں، میں پہلی مرتبہ ان کے پاس انارکلی کے مکان میں حاضر ہوا، اور پھر دوسرے تیسرے دن ملاقاتوں کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ ہماری نشستیں دو سے گیارہ گھنٹوں پر محیط رہی ہیں۔ خدا شاہد ہے میں نے انہیں کبھی بدمزاج نہ پایا، البتہ بعض مقامات اور معاملات میں ان کے چہرے پر تکدر اور ملال کا عکس پڑنے لگتا، اسلام سے ناواقف، مذہب کی روح سے ناآشنا نوجوان الٹے سیدھے سوال لے کر آتے، ان سے بحث کرتے، لیکن وہ ہر بات ٹھنڈے دل و دماغ سے سنتے اور جواب دیتے۔

(غلام رسول مہر)

(پیام اقبال، سیالکوٹ: فروری، مارچ ۱۹۶۸ء)

اقبال

چند یادیں چند تاثرات

خالد صُوفی[1]

میری والدہ ماجدہ[2] کے بیان کے مطابق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مجموعی طور پر بڑے خوش طبع واقع ہوئے تھے، دورانِ گفتگو چھوٹے چھوٹے چٹکلے بلا تکلّف بیان کرتے جاتے تھے، لیکن خدا نے انہیں بیان کا ایسا سلیقہ عطا کیا تھا کہ کسی حالت میں بھی وہ تہذیب کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے تھے، انہیں جتنا مسلمانوں کی مذہب سے بے خبری اور بیگانگی پر دُکھ ہوتا تھا کسی دوسری بات پر نہ ہوتا تھا۔ جب کبھی بھی کوئی مذہب سے بے خبری کی بات کر دیتا تو وہ بے حد ملول ہو جاتے اور اکثر اوقات ان کے آنسو تک نکل آتے۔ رسولِ اکرم صلعم سے انہیں اس قدر عقیدت تھی کہ خاص طور پر زندگی کے آخری ایام میں جب بھی حضورؐ کا نام مبارک دورانِ گفتگو آتا تو بے اختیار ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں اور آواز کانپنے لگتی، ان کی گفتگو ہمیشہ بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہوتی تھی اور انہیں اپنے خیالات مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ سننے والے کبھی ان کی باتوں سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی محفل ہو یا گھر صرف وہ خود ہی بولتے جائیں بلکہ وہ دوسروں کی باتیں بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے اور کبھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ "چچا جان ہمیشہ پنجابی میں بات چیت کرنے کو ترجیح دیتے اور بعض اوقات اُردو میں بھی اظہارِ خیال کرتے البتہ جب بھی کوئی دقیق مسئلہ ہوتا تو اُسے انگریزی میں بیان فرماتے۔

نانا جان قبلہ اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گذارتے تھے اور جلسوں وغیرہ میں کبھی کبھار ہی

شمولیت فرماتے تھے، سینما اور دوسرے کھیل تماشوں کا شوق انہیں بالکل نہیں تھا۔ جوانی میں انہوں نے اکثر مشاعروں میں شرکت کی مگر بعد میں انہوں نے مشاعروں میں شامل ہونا بھی بالکل ترک کر دیا، ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ مطالعہ تھا۔ چنانچہ فارغ اوقات میں زیادہ تر مطالعہ ہی فرماتے تھے اور اکثر اوقات مطالعہ میں اس قدر محو ہو جایا کرتے تھے کہ گرد و پیش کا بالکل ہوش نہ رہتا تھا۔ اس سلسلے میں میری والدہ مکرمہ ایک واقعہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ "ایک دفعہ بڑے زور کا زلزلہ آیا، چچا جان (علامہ مرحوم) اس وقت اپنے بستر میں لیٹے کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے، زلزلہ اس قدر شدید تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا تہہ و بالا ہو جائے گی، گھر کے تمام افراد سراسیمہ تھے، میں ان دنوں بچی تھی، گھبراہٹ میں کبھی دوڑتی ہوئی چھت پر چڑھ جاتی کبھی نیچے اتر آتی، مگر چچا جان اسی طرح بستر میں لیٹے رہے اور مطالعہ جاری رہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، البتہ میرے بھاگنے دوڑنے اور چچی جان (والدہ جاوید) کے مجھے منع کرنے سے قدرے ان کی توجہ ہٹی اور انہوں نے صرف ایک بار کتاب سے نگاہیں ہٹا کر میری جانب دیکھا اور فرمایا۔ "وسیمہ! اس طرح مت بھاگو، اپنی چچی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" اتنا کہا اور پھر کتاب پڑھنے لگے۔"

علامہ مرحوم کو اپنے والدین سے بے پناہ عقیدت تھی، اپنے والد ماجد کو تو وہ پیر و مرشد مانتے تھے اور اپنی والدۂ مرحومہ سے انہیں بے انتہا پیار تھا جس کی ہلکی سی جھلک ان کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" سے ملتی ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر کہی تھی، جہاں تک مجھے علم ہے شاید ہی دنیا کے کسی شاعر نے اتنی بلند پایہ نظم اپنی والدہ کے متعلق کہی ہو۔ یوں تو پوری نظم ہی اپنی جگہ ایک خاص مقام کی حامل ہے اور اس کا ایک ایک شعر اپنے اندر معانی و مطالب کا بحرِ ذخار پوشیدہ رکھتا ہے مگر ذیل میں درج چند اشعار والدہ کے ساتھ ان کے دلی لگاؤ کی بڑی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں ؎

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور — دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اترآتے ہیں ہم — صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں — پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

نانا جان قبلہ اپنے والدین کو کیا مقام دیتے تھے، اس کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ابھی تک حج کرنے کیوں نہیں گئے، تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ "میں تو ہر سال حج پر جاتا ہوں"، پوچھنے والا بڑا حیران ہوا اور کہا کہ ہم نے تو کبھی اس کے متعلق نہیں سنا کہ آپ حج پر گئے ہوئے ہیں، تو حکیم الامت نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا ــــ "میں ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ جاتا ہوں اور وہاں اپنے والدین کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں ــ یہی میرا حج ہے"۔

میری والدہ مکرمہ بیان کرتی ہیں کہ ــ "چچا جان کی زندگی بڑی قناعت پسندانہ اور درویشانہ قسم کی تھی، اگر وہ چاہتے تو بے اندازہ دولت جمع کر سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی بھی دولت کو اپنا نصب العین نہیں بننے دیا"۔ اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ جب حضرت علامہ نے انگلستان سے واپس لوٹ کر وکالت شروع کی تو بے شمار مقدمات ان کے پاس آنے لگے مگر انہوں نے ہمیشہ ہی صرف اتنے کام کو ہاتھ ڈالا جس کی آمدن اُنکے ماہانہ اخراجات کے لیے کافی ہوتی، وہ اپنی آمد و خرچ کا حساب بڑی باقاعدگی سے رکھتے تھے، ہر ماہ خرچ کا تخمینہ پہلے ہی لگا لیتے اور جب تخمینے کے مطابق کام مل جاتا تو مزید مقدمے لینے سے انکار کر دیتے۔ وہ بڑے سیدھے سادے انسان تھے اور دُنیا کے فریب اور اونچ نیچ سے بالکل بے خبر۔ انہوں نے کبھی کسی مقدمے میں غلط بیانی یا غلط ذرائع کا سہارا نہیں لیا۔ میری والدہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ ــــ "چچا جان اکثر اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ کس طرح اپنے ضمیر سے لاپرواہ ہو کر جھوٹی گواہیاں دیتے اور وہ ہمیشہ ہی عدالتوں کے اس غلط نظام سے نالاں رہا کرتے تھے"۔

زندگی کے آخری ایام میں انہیں اپنی قوم کا خیال بہت زیادہ رہا اور وہ اکثر اس کے لیے روتے رہے۔ ایک شب بڑی دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے، گھر میں سے کسی نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں تو آپ نے فرمایا ــــ "مجھے اپنی قوم کا خیال بے چین کیے دیتا ہے ــــ خدا مسلمانوں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے"۔ ۵۴

حواشی

۱؎ خالد نظیر صوفی جو مشہور کتاب "اقبال درونِ خانہ" کے مصنف بھی ہیں۔

۲؎ وسیمہ بیگم جو علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی لڑکی تھیں۔

۳؎ مشمولہ "بانگِ درا" صفحہ ۲۲۶

۴؎ شائع شدہ رسالہ "مفکر" اقبال نمبر مرے کالج سیالکوٹ: ۱۹۷۵ء

ایک دَور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا۔ علامہ مرحوم سے (۵۶ھ) ۳۸ء میں دوسری ملاقات کی اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں "عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلادِ عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول جاتا اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لیے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا، اشعار وردِ زبان تھے اور اُن کی کتابیں ہر وقت کی ہمدم و ہم نشین۔ پھر تنبہ ہوا کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ محسوس ہوا کہ یہ ذوق قرآن مجید کے اشتغال اور ذوق پر غالب آ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ دوسرے مشاغل اور ذوق اس پر غالب آئے لیکن اب بھی اُن کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔

ابوالحسن ندوی

کتاب: مشاہیر کے محسن کتابیں صفحہ ۱۸۱

مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی

اِقبالؒ کے حضور

رُتھ ڈورتھی لینڈو

علامہ اقبال کی بیوی کی وفات (۱۹۳۵ء) کے بعد علامہ کو سب سے زیادہ فکر جاوید اقبال اور منیرہ کی پرورش کی تھی، وہ ایک ایسی خاتون کی تلاش میں تھے جو ان کے بچوں کی مناسب دیکھ بھال کے علاوہ امور خانہ داری بھی سنبھال سکے، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے توسط سے ڈاکٹر تاثیر کی ایک جرمن نژاد سالی اس کام کے لیے تیار ہوگئیں، علامہ کی وفات کے بہت بعد تک وہ علامہ کی اولاد کی پرورش کرتی رہیں، ۱۹۶۲ء میں واپس جرمنی چلی گئیں۔ (مُرتب)

دُنیا میں شاید ہی کوئی باپ ہوگا جسے اپنے بچوں سے محبت نہ ہو مگر جب بچے ماں کی محبت سے محروم ہو جائیں اور باپ کو ماں اور باپ دونوں کی محبت اکیلے دینا پڑے اور یہ احساس بھی ہو تو وہ پھر اپنے بچوں سے کیسے محبت کرتا ہے، جب تک بچے اسکول سے واپس نہیں آتے علامہ کھانا نہیں کھاتے تھے، ان دنوں وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، ہر وقت پلنگ پر پڑے رہتے تھے مگر دوپہر کا کھانا کھانے کے کمرے میں آکر بچوں کے ساتھ کھاتے تھے، ان سے باتیں کرتے سکول کے متعلق، تعلیم کے متعلق اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے، رات کو وہ کھانا نہیں کھاتے تھے، دل کے مریض تھے، انہوں نے اصرار کیا کہ انہیں رات کو کچھ کھانا چاہیئے، دل کے مریض کے لیے تو اور بھی ضروری ہے، وہ کہنے لگے کیا کھاؤں میں نے کہا سوپ پی لیا کریں۔ علامہ نے کہا سوپ کون بنائے گا۔ میں اس کے بعد ان کے لیے خود سوپ تیار کرنے لگی، رات کے کھانے کے بعد جاوید اور منیرہ باقاعدگی

سے ان کے پاس آتے، کہانیاں سُناتے، باتیں کرتے ان کے کمرے میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے، منیرہ بڑی شریر تھی اور ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوتے تھے۔

علامہ کو بچوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی، اِن کی ماں مر چکی ہے میرے بعد اَن کا کیا بنے گا؟ وہ سوچتے تھے اور کہا کرتے تھے بچے بہت چھوٹے ہیں اور میں عمر کے لحاظ سے ان سے بڑا ہوں، خدا نے آخری حصّہ عمر میں بچے دیئے ہیں، فی سبیل طور پر وہ مجھ سے گھُل مل نہیں سکتے۔ یہ اُن کا احساس تھا اور وہ ان سے زیادہ گھُل مل کر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

علامہ اقبال دل اور دماغ سے مسلمان تھے، مسلمان مُفکّر اور شاعر، علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، وہ بتایا کرتے تھے کہ اقبال بہت بڑا مفکر ہے اور بہت بڑا انسان ہے، اور اس وقت وہ دنیا میں مشہور ہو چکے تھے۔ بانو اور جاوید دونوں سکول جاتے تھے، میرے آنے سے پہلے ہی انہیں قرآن پڑھانے کے لیے مولوی صاحب مقرر تھے۔ جاوید سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتے تھے اور بانو (منیرہ) ایک مسلم سکول میں، لیکن مجھے وہ سکول پسند نہیں آیا، میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی اُنہوں نے کہا "آپ بانو کو اپنی مرضی سے داخل کرا سکتی ہیں"۔ میں نے کہا "میں اس شہر میں نئی ہوں، نہیں جانتی کہ اچھا سکول کون سا ہے، آپ کسی سے کہیں کوئی اچھا سکول تلاش کر کے بتائے"! انہوں نے کہا یہ کام آپ کو خود کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے طور پر تمام سکولوں کا جائزہ لیا اور بانو کے لیے کیتھڈرل سکول پسند کیا، مشنری سکولوں میں تمام بچے صبح مذہبی رسوم میں شرکت کرتے ہیں۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا "مجھے بانو کے سکول کی مذہبی رسوم میں شرکت پر کوئی اعتراض نہیں، میں نے خود بائبل پڑھی ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سکول میں دیگر بچیوں کی طرح پڑھے، مگر ساتھ ساتھ اُسے اپنے مذہب کے متعلق بھی پوری تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس مذہب کی رُوح سے آگاہ ہو اور خود اس کو سمجھنے کے قابل۔

بانو کو بچپن میں کہانیاں سُننے اور سُنانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک رات سونے سے پہلے اُس نے مجھے قصہ یوسف کہانی کے سے انداز میں سُنایا، میں قرآن کے انگریزی ترجمے

میں یہ قصہ پڑھ چکی تھی۔ بانو سے پوچھا کہ کیا اُس نے بھی یہ قصہ قرآن میں پڑھا ہے، اُس نے کہا نہیں۔ میں حیران ہوئی کہ قرآن پڑھتی ہے اور اصل قصہ نہیں جانتی، بانو نے بتایا کہ مولوی اسے قرآن عربی میں پڑھاتا ہے اور وہ عربی نہیں جانتی۔ میں نے علامہ مرحوم کے دوست اور ان کے بچوں کے سرپرست وولی چوہدری محمد حسین مرحوم سے بات کی کہ وہ کوئی ایسا مولوی لائیں جو قرآن پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو سمجھا بھی سکے تاکہ وہ اس کی تعلیمات اور رُوح سے آگاہ ہو سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کو قرآن سے عشق تھا، ایک روز انہوں نے مجھے بُلایا اور کہا آج ایک بہت مشہور عرب قاری آنے والا ہے جب وہ آئے تو بچوں کو میرے کمرے میں بھیج دینا اور اگر آپ پسند کریں تو خود بھی آجانا میں اس سے قرآن سُننا چاہتا ہوں۔ قاری آیا تو بچوں کے ساتھ میں بھی ان کے کمرے میں گئی، ڈاکٹر صاحب بستر میں اُٹھ کر بیٹھ گئے، قاری نے قرآن کی تلاوت شروع کی، ڈاکٹر صاحب دونوں ہاتھوں میں سر کو پکڑے ہوئے بیٹھے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری تھی، انہوں نے بتایا کہ اُن کے بستر پر ہر وقت قرآن موجود رہتا ہے جسے وہ تکیے کے ساتھ بیٹھے، لیٹے ہوئے ہر وقت پڑھتے رہتے تھے، لیکن بعض دفعہ نماز بھی چارپائی پر ہی ادا کرتے تھے۔

بانو بہت شریر تھی، ایک روز شام کے کھانے کے بعد علامہ کے کمرے میں سب بیٹھے تھے، وہ ضد کرنے لگی کہ آپا جان کہو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ....." میں نہیں کہتی تھی اور وہ ضد کر رہی تھی کہ اچھی آپا جان کہو نا، میرے لیے ایک ہی بار کہہ دو، میں نے کہہ دیا، وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور کہا "اب آپا مسلمان ہو گئی ہیں اور آپ کا نام فاطمہ ہے" علامہ اس کی ضد پر بہت خوش ہوئے اور ہنسنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب کو بیرونِ ممالک سے آنے والے خطوط میں ہی پڑھ کر سُنایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ لندن سے مسلمان طلباء کا ایک خط آیا جس میں پاکستان کے قیام پر زور دیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ مانگا گیا تھا، خط پڑھ کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا بات ہے دُنیا میں لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں اور آپ الگ برصغیر کے مسلمانوں کو

الگ کر کے ان کے لیے الگ ملک قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا "بیٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ پھر انہوں نے برصغیر کی تاریخ، مسلمانوں کے ماضی، حال، مذہب اور رسم و رواج کے حوالے سے پاکستان کے قیام کی ضرورت پر تفصیلی بات کی اور کہا کہ مسلمانوں کے بحیثیتِ قوم زندہ رہنے کے لیے اُن کے الگ ملک کا قیام ضروری ہو گیا ہے، اس کے بغیر ان کی بقا ممکن نہیں ہوگی"۔ آج ڈاکٹر صاحب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے، موت سے پہلے بچوں کے مستقبل سے بھی زیادہ انہیں برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی فکر رہتی تھی، وہ کہتے تھے ان کا کیا بنے گا؟ لیکن یہ بھی کہا کرتے تھے کہ پاکستان قائم ہو کر رہے گا۔

گھر میں دو اخبار آتے تھے، ایک اُردو اور ایک انگریزی، میں انہیں انگریزی اخبار پڑھ کر سُناتی تھی، اخبار پڑھنے اور سننے کے دوران وہ خبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کبھی کبھی میرے ساتھ سیاسی معاملات پر بات چیت کرتے تھے مگر عام قسم کی، لیکن ان سے مِلنے اور مشورہ کرنے والے بہت لوگ آتے تھے، جن سے وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے بات چیت کرتے تھے۔ میرے جاوید منزل میں قیام کے دوران ہی محمد علی جناح اور پنڈت نہرو انہیں ملنے آئے تھے، جس روز محمد علی جناح ملنے آئے ڈاکٹر صاحب نے پہلے سے ہدایت کی تھی کہ آج ایک بہت بڑے آدمی گھر میں آنے والے ہیں، جب وہ آئیں تو جاوید کو میرے کمرے میں بھیج دینا۔

ان کے احباب میں چوہدری محمد حسین کم و بیش ہر روز آتے، ان کے علاوہ راجہ حسن اختر، میاں امیر الدین، ڈاکٹر عبدالحمید، حکیم قرشی، میاں محمد شفیع اور سید نذیر نیازی اکثر آتے اور بہت سے دیگر افراد جو انہیں ملنا چاہتے بلا روک ٹوک چلے آتے۔ سید نذیر نیازی اور شفیع ان کے خطوط لکھتے تھے، یا جو اور کوئی چیز وہ لکھنا چاہتے علامہ لکھواتے تھے اور نیازی صاحب لکھا کرتے تھے، ہو سکتا ہے انہیں شعر بھی لکھواتے ہوں۔ چوہدری محمد حسین ہر روز آتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے پلنگ پر لیٹے رہتے، چوہدری صاحب پاس زمین پر بیٹھ جاتے اور پھر گھنٹوں ان سے آہستہ آہستہ باتیں کیا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد بھی چودھری

محمد حسین کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر روز آتے تھے اور مجھ سے بچوں کی صحت، تعلیم اور دیگر گھریلو مسائل کے متعلق پوچھتے تھے، چوہدری صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔

ڈاکٹر صاحب ہر ملنے والے سے اس کے ذہنی معیار کے مطابق بات چیت کرتے تھے اور بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے، اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے بڑے مفکر اور شاعر سے مل رہا ہے اور وہ یہ تاثر دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

جب میں جاوید منزل پہنچی تو وہ شلوار قمیص میں ملبوس بیٹھے تھے، ان سے ملاقات کے وقت "I WAS ALITTLE BIT NERVUS" لیکن جب ان سے بات چیت کی تو "I FELT IMMEDIATELY AT CARE"۔

علامہ پارٹیوں پر کم جاتے تھے، نہ انہیں پالتو جانوروں کا شوق تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کا مشغلہ شعر و شاعری ہی رہا، مجھ سے روزمرہ کے مشاغل پر گفتگو ہوتی تھی۔

وہ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے، ملازموں سے ان کا سلوک بہت اچھا تھا وہ انہیں کبھی نہیں ڈانٹتے تھے، علی بخش سے اگر کوئی بڑی سی غلطی بھی ہو جاتی تو وہ صرف یہ کہتے "علی بخش تو بہت بیوقوف ہے"

علی بخش کو ڈاکٹر صاحب سے بہت محبت تھی اور وہ بہت ہی وفادار ملازم تھا میرے آنے سے پہلے گھر کا تمام نظام، حساب کتاب اس کے ذمہ تھا، جب میں آئی تو حساب کتاب میرے حوالے کر دیا گیا جسے علی بخش نے بہت برا محسوس کیا، میں بازار سے واپسی پر اس سے ہر چیز کا حساب مانگتی تھی اور پھر ڈاکٹر صاحب کو بتاتی تھی مگر وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، علی بخش سے انہوں نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ کیا چیز کتنے کی آئی، اسی لیے وہ مجھ سے ناراض ہوتا تھا، مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی ناراضگی جاتی رہی اور وہ میرے ساتھ باقی تمام عرصہ بڑی خوشی سے کام کرتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب عموماً سوتی بنیان اور دھوتی پہنتے تھے، سردیوں میں اسی لباس پر دھسہ بھی استعمال کرتے تھے۔ کھانوں میں شامی کباب، بٹ کریلا اور دال مونگ، گوشت پسند کرتے تھے لیکن گائے کا گوشت قطعاً نہیں کھاتے تھے، انہوں نے

خاص طور پر ہدایت کی تھی اور انہیں اور بچوں کو گائے کا گوشت ہرگز نہ دیا جائے۔ میں بچوں کے لیے کیک تیار کرتی تو بانو انہیں بتاتی کہ آپا نے کیک بنائے ہیں، تو وہ ایک آدھ کیک چکھ لیتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے، مجھے خوش کرنے کے لیے پھلوں میں انہیں آم بہت پسند تھا۔ میاں امیر الدین اپنے باغ سے ان کے لیے آم لایا کرتے تھے، وہ چھوٹے چوسنے والے آم اور بڑے کاٹ کر کھانے والے آم پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ میاں صاحب ان کے لیے ایک نئی قسم کا آم لائے جو پیوند کاری سے اُن کے مالیوں نے تیار کیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے یہ آم بہت پسند کیا اور کہا اس کا نام ٹیپو سلطان رکھا جائے۔

جس وقت ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی تو اُن کے دوست اور خصوصی معالج حکیم حسن قرشی حیدرآباد دکن گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا تو وہ کہتے تھے اب یہ لوگ مجھے ٹیکے لگائیں گے، قرشی ہوتا تو اس کی دوائی سے مجھے جلد آرام ہوتا۔ وہ قرشی صاحب کی دوائی تو لے لیتے تھے مگر ڈاکٹروں کی دوائی پسند نہیں کرتے تھے۔ چار اور پانچ بجے کے درمیان فوت ہوئے، آخری وقت ایک ڈاکٹر اور ان کا پرانا ملازم علی بخش ان کے پاس تھا۔ مرنے سے پہلے آپ نے فرمایا: علی بخش مجھے سردی لگ رہی ہے اور میرا دل ڈوب رہا ہے، جس پر علی بخش نے آپ کے سینے پر مساج کیا۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے میں اُردو تھوڑی بہت بول لیتی ہوں مگر اتنی بھی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب جیسے مفکر کی گہرائی کو محسوس کر سکوں۔ ایک بار ایک جرمن نے علامہ کی شاعری کا جرمن ترجمہ انہیں پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ کتاب مجھے پڑھنے کو دی تھی، اس سے پتہ چلا کہ وہ کتنے بڑے شاعر اور مفکر ہیں۔ تاہم میں نے علامہ کی شاعری کے انگریزی تراجم ضرور پڑھے ہیں۔[۱۵]

حواشی

لہ یہ مضمون مس ڈورس کے دو انٹرویوز کے مواد سے مرتب کیا گیا ہے۔ پہلا انٹرویو رسالہ "ثانوی تعلیم" اقبال نمبر میں اور دوسرا انٹرویو رفیق ڈوگر نے لیا تھا جو "اسلامی جمہوریہ" کے اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

لہ مصنف کو مغالطہ ہوا ہے۔ حکیم قرشی دہلی نہیں گئے ہوئے تھے

اقبالؒ کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب انہوں نے اپنی پہلی غزل مشاعرہ میں پڑھی تھی اور شیخ عبدالقادر ایڈیٹر "مخزن" نے ان کا تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد لاہور اور بھوپال میں اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ بلاشبہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہے اور یورپ کے فلسفہ پر اس کو عبور ہے جس پر مسٹر آرنلڈ نے اکثر فخر کیا ہے ..... سر راس مسعود اردو کلام کے مقابلہ میں اقبال کی فارسی شاعری کے بہت مداح تھے۔ کسی جلسے میں بعض حاضرین نے اقبال کے کلام پر یہ اعتراض کیا کہ وہ شعرائے عجم کے خیالات اپنے خاص الفاظ میں ادا کرتے ہیں، مسعود اس کے قائل نہ تھے۔ جب ایک دوست نے بطور نظیر اقبال کا یہ مصرع پڑھا ع

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

اور ساتھ ہی عُرفی کا وہ شعر پڑھا جس کا یہ مصرع لفظی ترجمہ ہے تو سید صاحب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد مائل نے متعدد فارسی اشعار متقدمین شعراء کے سنائے جس کا اقبال نے چربہ اُتارا تھا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ مضامینِ تصوف میں اقبال نے ضرور متقدمین کے خیالات سے فائدہ اُٹھایا ہے، لیکن یہ سرقہ نہیں ہے صرف تتبع ہے۔

بہرحال یہ ضمنی بحث ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بلاشبہ اقبال نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا مایۂ ناز شاعر ہے .... اور اُردو کلام میں زبان اور محاورات کی غلطیاں، پنجابی ہونے کی حیثیت سے ہرگز قابلِ لحاظ نہیں ہیں دیکھنے کے قابل وہ مہتم بالشان خیالات ہیں جو اقبال کے قلم سے نکلتے ہیں۔

(یادِ ایام از عبدالرزاق کانپوری صفحہ ۳۸۶)

اشاریہ "ا" ـــــ موضوعات

تینوں اشاریوں میں متن سے ضروری اشارے ہی شامل کئے گئے ہیں :
ثانوی اہمیت کے بعض اشارے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

اُردو رسم الخط ۹۱

اجلاس

آل انڈیا کانگریس، سالانہ جلسہ ۴۲
آل انڈیا کشمیری کانفرنس ۱۷۵
آل انڈیا مسلم لیگ ۴۲
علی گڑھ یونیورسٹی جوبلی ۸۷
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۶۶، ۱۴۶
برما کی علیحدگی ۲۰
جلیانوالہ باغ کا واقعہ ۳۸

خطبات و تقاریر

خطبات ۸۸، ۱۱۵، ۲۴۲
عید میلاد النبیؐ (تقریر) ۷۶
لیکچرز (توسیعی) ۱۲۴

سفر

اسپین ۱۶۲
حیدرآباد ۳۲، ۱۲۵، ۱۹۸
دہلی ۱۵۷
علی گڑھ ۸۸
کابل ۱۶۷
کشمیر ۱۹۳
مدراس ۱۹۸

سوانح

افغانستان کی مدد ۹۷
بچپن ۲۵۰
بچوں کی پرورش ۲۶۳
بیگم کی وفات ۱۴۱
تدفین ۵۵
حج کی خواہش ۲۲۹
خطاب (ترجمان حقیقت کا) ۶۶
خطاب (سرکا) ۷۸، ۹۵
رہائش (انارکلی) ۲۷، ۲۳۴، ۲۳۶
شادی (لدھیانہ سے) ۱۷۲
علالت ۲۴، ۵۱، ۶۳، ۸۹، ۲۰۷، ۲۳۸
ملازمت (عثمانیہ یونیورسٹی) ۳۱
" (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) ۱۶
" بحیثیت اُستاد ۱۹
" بحیثیت وکیل ۱۹، ۹۶، ۱۵۲، ۲۶۱
" جامعہ کی پرنسپلی ۸۱
" مزارِ اقبال ۲۰۱
" ممتحن کی حیثیت سے ۶۷، ۹۰
ناتمام خواہشات ۱۸
وفات ۵۳، ۶۱، ۲۴۰، ۲۵۶

سیاست

احرار ۱۵۳
بصیرت (سیاسی) ۱۸۴
پاکستان ۸۳، ۹۴، ۲۲۳، ۲۶۵
پنجاب کونسل میں ۲۰، ۹۰
رکن یونینسٹ پارٹی ۲۰
عمومی بحث ۱۱۹، ۱۵۳
کانگرس ۱۳۱
گول میز کانفرنس ۲۲۴، ۲۵۷
" پہلی ۲۰، ۲۱
" دوسری ۲۲، ۶۹
" تیسری ۲۱، ۱۱۴، ۱۶۲
مسلم کانفرنس ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۹۶
مسلم لیگ ۱۱۸، ۲۱۴
مسئلۂ فلسطین ۹۱
نیشنل کانفرنس ۱۹۶
نیشنل کانگرس ۲۱۲، ۲۱۳
یونینسٹ پارٹی ۲۰

شاعری

اندازِ شاعری ۱۳۵، ۱۵۰
اصلاحِ کلام ۱۱۶
پسندیدہ شعراء ۶۶
تلامذہ اقبال ۶۳
زبان و بیان ۲۰۹، ۲۶۹
شعر کی تشریح ۶۸
شعری انہماک ۸۴
فرمائش کلام ۸۹، ۱۱۵
کلام اقبال (غیر مطبوعہ) ۳۸ تا ۴۲، ۱۷۳،

نظریہ **شخصیت**

آواز (ترنم) ۲۲
حُلیہ ۳۳، ۱۳۰، ۱۴۹، ۱۵۶
خودداری ۲۷
درویشی ۱۳۲، ۲۴۶
رندی ۱۴۶
سادگی ۱۸۸، ۱۸۹
سفارش ۷۵
عادات و اطوار ۹۴، ۹۷، ۹۹، ۱۴۰، ۲۴۴، ۲۶۰، ۲۶۷
لباس ۱۰۵، ۱۳۴، ۱۷۶، ۱۹۰
مشاغل (پتنگ بازی) ۲۵۰
" (کبوتر بازی) ۱۲۳
معمولات خورونوش ۱۲۶، ۱۳۴
قرآن مجید کی تلاوت ۲۲۶
کشمیر کی تحریکِ حریت ۱۵۳
گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ۔ ۱۹
لطائف (شگفتگیٔ طبع) ۶۹، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۱، ۱۸۹، ۲۰۶، ۲۲۴
مسلمانوں کے زوال کے اسباب ۱۲۰
نعت گوئی ۱۲۸

نظریات	۶۰	زمان ومکاں	۲۲۶
اشتراکیت	۱۰۰، ۱۰۳، ۱۸۱، ۱۸۴	سیلولرازم	۱۹۵
	۲۱۴-	شعروشاعری	۱۲۰، ۱۳۶
انسانِ کامل	۱۷	طبِّ اسلامی	۷۷، ۲۰۷
اسلام	۶۴، ۱۰۳، ۱۱۷، ۱۳۸	طلبہ (نوجوان نسل)	۹۹
اسلام کا مستقبل	۹۹	عشقِ رسولؐ	۱۶، ۹۷، ۱۰۱، ۱۴۰، ۱۸۵
پردہ	۱۳۸		۲۲۹، ۲۳۶،
تصوّف (صوفیوں کے		فرقہ واریت	۶۶
نظریات.	۲۲۸	قرآن	۱۹۹، ۲۳۶
تعصّب	۶۶	مذہب	۱۲۴، ۲۵۹
حیات وممات	۶۴، ۱۲۱	مغربی تہذیب	۶۰
ختمِ نبوّت	۲۲۷	ہیرو ورشپ	۱۹۲
خودی	۱۰۰	یوم اقبال	۶۲، ۷۱، ۹۸، ۱۲۷، ۱۲۹، ۲۱۶، ۲۱۷

شریعت یا جہالت (اضافہ شدہ ایڈیشن) از محمد امین اوقافی

رسوم وبدعات کی اِصلاح کے لیے اور اسلامی عقائد ونظریات کے مطالعہ کیلئے ایک مدلل کتاب۔ ہر مسئلے کا حوالہ مستند اور معتبر اسلامی کتابوں سے دیا گیا ہے۔

قیمت ۴۵/۰۰ روپے

اشاریہ "ب" — اسماء

آرنلڈ پروفیسر	۲۶۹		۷۴، ۳۵
آغا خان (سر)	۱۵۹، ۲۰	اکبر الہ آبادی	۱۴۶، ۱۲۶، ۳۷، ۲۲
آفتاب اقبال	۲۵۳، ۶۵	اکبر حیدری (سر)	۳۱، ۲۱
ابن جامع	۱۶۰	الگزنڈر ڈوما	۲۴۱
ابوالحسن ندوی	۲۶۲	امان اللہ خان	۱۱۳
ابوالکلام آزاد	۲۰۲	امیر الدین میاں	۲۶۸، ۲۶۶
ابو محمد مصلح	۱۹۸	انصاری (ڈاکٹر)	۱۶۱
اتاترک	۲۱۱	اورنگ زیب عالمگیر	۲۰۱
اجمل خان (حکیم)	۴۳، ۴۲	ایڈورڈ تھامپسن	۲۱۴
احمد بن مبارک (علامہ)	۷۸	ایڈورڈ میکلگن	۹۶
احمد سعید دہلوی	۱۷۵	بابر	۱۶۸
احمد شاہ پطرس بخاری	۷۴	باٹ (ڈاکٹر)	۷۶
اسد ملتانی	۲۱۸	بادشاہ حسین سید	۱۱۵
اسلم (ایم)	۲۴	بچہ سقہ	۱۶۷
اسلم جیراجپوری	۲۲۳، ۲۱۷	بخاری امام	۱۸۱
اسماعیل غزنوی	۱۵۴	برکت علی	۱۸۳، ۷۳
اسماعیل میرٹھی	۸۶	برگساں	۲۲۶، ۱۶۳، ۱۴۶
اصغر گونڈوی	۱۷۹	بریٹ	۱۹
اعجاز احمد	۲۰، ۱۹	بشیر احمد چوہدری	۱۹
افتخار الدین آفت	۱۷۴	بشیر حسین زیدی	۱۱۴
افتخار الدین فقیر	۲۳۳	بہادر یار جنگ	۱۷۸، ۱۲۸
افتخار علی ملک	۱۸۳	بیک صاحبہ	۶۴
اقبال	۲۶، ۲۱، ۲۰، ۱۹	بیگم اقبال (سردار بیگم)	۶۳

بیگم شاہنواز ۲۱۸
پوری (کرنل) ۲۳۹
تاج الدین پیر ۱۸۴
تاج محمد خان ۱۹
تاجور نجیب آبادی ۴۴
ٹیک چند بہار ۴۷
جالب دہلوی ۲۶
جانسن ۷۵
جاوید اقبال ۶۰، ۲۵۷، ۲۶۴
جلیل قدوائی ۸۵
جمال الدین افغانی ۹۹
جواہر لال نہرو ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۸۴، ۱۹۹، ۲۶۶
جوش ملیح آبادی ۸۲، ۸۳
جونز ۱۹
جیا رام (لالہ) ۱۹
چاولہ (مسٹر) ۱۹
چیتن انند (لالہ) ۱۹
چراغ حسن حسرت ۱۳۰، ۲۴۱
چھوٹو رام ۵۴
حافظ شیرازی ۴۲، ۹۵، ۲۳۵
حبیب (مولانا سیّد) ۱۶۸، ۱۷۵
حسرت موہانی ۱۴۵
حسن اختر راجہ ۲۳۹، ۲۶۶
حسن نظامی (خواجہ) ۱۴۳، ۱۶۸، ۲۳۲
حفیظ جالندھری ۸۱، ۱۷۶، ۲۱۸
حکیم احمد شجاع ۳۲
حکیم نابینا ۱۸۴، ۲۳۹
حمید احمد قدوائی ۸۵
حمید اللہ ۱۲۷
حمید اللہ چودھری ۱۵۵
حیدر جنگ (نواب سر) ۳۱
حیدر حسن (مرزا)، آغا ۲۹
خالد نظیر صوفی ۲۵۹
دلِ شاہجہان پوری ۸۶
دلیپ سنگھ جسٹس ۱۷۹
دین محمد (شیخ) ۲۰
دین محمد (منشی) ۹۵، ۱۱۰
ذاکر حسین ڈاکٹر ۱۶۲
ذوالفقار علی خان (سر) ۳۹، ۱۵۹، ۱۷۳
ڈورس لینڈور (احمد) ۲۵۶، ۲۶۳
رابندر ناتھ ٹیگور ۱۲۸
رالبسن ۱۹
رامس مسعود (سر) ۳۱، ۹۰، ۱۱۴، ۱۲۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۲۴۲، ۲۶۹
رام پرشاد کھوسہ ۱۹
رام حیدر جی (شری) ۳۳
رچی رام (لالہ) ۱۹
رحمت علی چودھری ۹۴
رحیم بخش (مولوی سر) ۲۰
رشید احمد صدیقی ۲۶۴
رضی الدین صدیقی (ڈاکٹر) ۱۲۹

رفیع احمد خاں ۲۱۰
رُومی (مولانا) ۷۶، ۲۳۵
رؤف پاشا ۱۶۱
رئیس احمد جعفری ۱۵۷
ریاض الحسن ۱۷۹
ریمزے میکڈانلڈ ۲۰
زرتشت ۲۲۷
سالک لاہوری ۴۸
سٹیفن (لیفٹیننٹ کرنل) ۱۹
سجاد حیدر یلدرم سید ۸۷، ۹۰
سجید گل ۱۸۲
سراج الدین فقیر ۲۳۳
سراج الدین منشی ۸۱
سردار محمد حاجی ۷۶
سرسید احمد خان ۱۶۸، ۲۲۵
سروجنی نائیڈو ۱۲۸
سرور گوہا ۱۶۹
سعادت آغا ۲۳۴
سکندر حیات (سر) ۵۴
سلطان احمد ۲۰
سلمان منصور پوری قاضی ۷۷
سلیمان پھلواری (شاہ) ۲۳۲
سلیمان ندوی ۹۰، ۱۶۸، ۲۲۱
سنائی ۱۶۷، ۱۶۸
سوامی رام تیرتھ ۳۳، ۱۵۱
سید احمد بریلوی ۲۲۵
سی آر داس ۱۵۲
شاد عظیم آبادی ۶۳
شاہ دین ۲۳۲
شفیع داؤدی ۲۲۴
شورش کاشمیری ۲۰۲
شوکت تھانوی ۲۰۹
شوکت علی (مولانا) ۴۲، ۸۱، ۱۱۳
شہاب الدین چوہدری ۲۰، ۱۳۶، ۱۳۷
صابر دُرّانی (شہزادہ) ۳۸
صدیق حسن خان ۸۳
صدرالدین مجاہد ۱۵۳
صُغریٰ ہمایوں مرزا ۶۲
صلاح الدین سلجوقی سردار ۲۳۵
صلاح الدین (مولانا) ۴۴، ۵۲
ضیاء الدین مولوی ۱۶، ۹۲
طاہر دین شیخ ۲۳۷، ۲۳۹
طغرائی امرتسری (حکیم) ۴۲
ظاہر شاہ ۱۶۷
ظفر اللہ خان (سر) ۱۹
ظفر الحسن (ڈاکٹر) ۸۹
ظفر علی خان ۲۵، ۳۷، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۵۵، ۱۶۸، ۲۰۳،
عابد حسین (ڈاکٹر) ۱۵۹، ۱۶۰، ۲۲۱
عابد علی عابد ۲۱۸
عاشق حسین بٹالوی ۴۴

عبداللہ چغتائی	۳۲، ۱۳۹، ۱۹۹	عرش ملیانی	۱۸۷
عبداللہ یوسف علی	۲۱۸	عرشی امرتسری	۴۲
عبدالحق (مولوی)	۳۱، ۲۰۰، ۲۲۱	عُرفی	۲۶۹
عبدالحمید ڈاکٹر	۲۳۹	عشق لہر میاں	۲۳۵
عبدالجلیل خان صاحبزادہ	۸۶	عطاء اللہ شاہ بخاری	۲۰۴
عبدالحمید ڈاکٹر	۲۶۶	عطارؒ شیخ	۱۶۸
عبدالحی (میاں)	۵۴	عطا محمد شیخ	۱۹
عبدالحی (ملک)	۱۸۹	عطیہ بیگم	۶۹
عبدالرحمٰن جامی	۱۶۸	علم الدین سالک	۱۵۴، ۲۰۸
عبدالرحیم خواجہ	۲۳۹	علی امام (سر)	۶۴
عبدالرحیم (شیخ)	۲۵	علی رضا خان	۲۳۳
عبدالرزاق	۲۳	علی بخش	۱۰۴، ۱۳۲، ۱۴۳، ۱۵۶، ۱۶۸، ۲۶۸
عبدالشکور (شیخ)	۲۳۲		
عبدالصمد کگڑو	۲۳۲، ۲۳۳	غلام احمد پرویز	۲۱۸، ۲۲۳
عبدالعزیز دباغ	۷۸	غلام احمد مہجور	۱۹۴
عبدالعلی ہروی شیخ	۲۳۴	غلام السیدین	۸۹، ۱۱۴، ۲۱۸، ۲۴۲
عبدالغفار خان	۱۱۱	غلام رسول	۱۶۸، ۱۶۹
عبدالغنی خواجہ	۱۵۳	غلام رسول مہر	۴۴، ۱۵۵، ۲۵۸
عبدالقادر شیخ (سر)	۲۰، ۹۵، ۲۱۸، ۲۳۷، ۲۶۹	غلام محمد (ملک)	۳۰
		غلام محی الدین ڈاکٹر	۶۹
عبدالقادر (کونسلر)	۲۳	غلام محی الدین قصوری	۱۶
عبداللطیف ڈاکٹر	۱۲۸، ۲۲۱	غلام مصطفےٰ تبسم	۲۱۸
عبدالماجد دریا آبادی	۱۴۵	فقیر محمد چشتی حکیم	۱۳۱
عبدالمجید سالک	۴۴، ۱۳۱، ۱۵۵، ۱۷۴، ۲۳۶، ۲۴۱	فلاٹ	۷۵
		فتح علی خان	۲۳۴
عبدالواحد شیخ	۲۳۷	فخر یار جنگ	۱۲۷

فردوسی ۶۲
فریادمرحوم ۶۳
فضل الحق (ابوالقاسم) ۲۰
فضل حسین (سر) ۲۰، ۲۱، ۹۶
فضل حمید ۹۶
فورلس ۷۵
فیاض احمد (حافظ) ۲۵
فیروزالدین مولوی ۹۵
فیض لدھیانوی ۱۷۲
فیض محمد خان ۱۶۹
فیضی رحمان ۶۹
کارل مارکس ۲۰۴
کچلو ۱۷۵
کشن پرشاد ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۱۲۸
کشن گپتا (سر) ۶۴
کفایت اللہ دہلوی ۱۷۵
کمال پاشا ۲۱۱
گاندھی ۱۱۲، ۱۳۱، ۲۰۳
گرامی ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۹، ۱۷۶، ۲۱۹
گل کرسٹ ۷۵
گورونانک ۳۳
گوگل چندنارنگ ۲۱۸
گولک ناتھ چیٹرجی ۱۹
گوہرالرحمٰن قاضی ۱۶۶
گوئٹے ۹۵
لالہ ہرکشن لال ۹۵
لوتھین لارڈ ۲۲۴
لوکس (ڈاکٹر) ۲۳۶
لینگ ہارن ۱۹
مالک رام ۲۴۰
مبارک جالندھری ۱۵۵
مجازی صاحب ۲۰۹
محسن شاہ سیّد ۲۰۰
ممتاز حسن ۱۵۲
محمد اسد ۱۷۱
محمد الیاس ۱۹۰
محمد حسن قرشی (حکیم) ۲۶۶، ۲۶۸
محمد حسین چوہدری ۲۶۵، ۲۶۶
محمد حسین عرشی امرتسری ۴۰
محمد دین تاثیر ڈاکٹر ۱۳۲، ۱۵۴
محمد دین فوق ۱۷۵
محمد زبیر ۲۰۵
محمد سرور شیخ ۲۳۹
محمد سعید دہلوی پروفیسر ۷۴
محمد سعید مرزا ۱۹
محمد شفیع داؤدی ۱۵۹
محمد شفیع (میاں) ۲۳۲، ۲۶۶
محمد شفیع (سر) ۲۰، ۱۵۹
محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۳۶
محمد عالم مفتی ۱۰۰
محمد عبداللہ خان ۲۰۵
محمد عبداللہ (شیخ) ۱۹۳، ۲۰۸

محمد عرفان (مولانا) ۶۹
محمد عبدہٗ مفتی ۹۹
محمد علی (جناح) ۲۰، ۲۱، ۱۱۹، ۱۸۵، ۱۹۲، ۲۰۳، ۲۶۶
محمد علی علویہ پاشا ۱۴۸
محمد علی جوہر ۲۰، ۸۰، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۵۸، ۱۸۲
محمد عمر فاروق ۲۱۸
محمد مجیب پروفیسر ۱۶۱
محمد یوسف رنجور ۷۳، ۷۵
محمود احمد ۲۵
محمود غزنوی ۱۶۸
محمود میاں ۸۱
محمودہ ریاض بیگم ۲۵۷
محی الدین قادری ۱۲۸
مراتب علی شاہ ۲۳۳
مرزا سلطان احمد ۲۳۲
مرزا علی اکبر خان ۶۹
مختار بیگم ۳۸
مخدوم محی الدین ۱۲۸
مسعود جنگ (نواب) ۳۱
مسعودی مولانا ۱۵۴، ۱۵۵
مشتاق احمد نواب ۱۲۲
مشتاق احمد وجدی ۹۴
مصطفےٰ کمال پاشا ۱۶۱
مقبول احمد ۱۶۷
منظفر علی خان قزلباش ۲۳۴
مکند لال ۱۹
ممتاز محل یار الدولہ ۶۱
مرتی لال نہرو ۴۲، ۱۷۵
منظور حسین خواجہ ۸۶
منوہر لعل (لالہ) ۵۴، ۵۵
منیر الدین ۲۱۸
منیرہ بیگم ۱۸۹، ۲۵۶، ۲۶۴
میراج کرنل ۲۳۹
مہتر چترال ۱۳۷
میر حسن مولانا ۹۶، ۲۰۷، ۲۵۰
میر غلام بھیک نیرنگ ۱۶
نادر خان ۱۱۲، ۱۶۷
نائیڈو مسز ۷۱
نجم الدین عشرت ۱۵۳
نذیر احمد ۷۸
نذیر احمد قدوائی ۸۵
نذیر جنگ بہادر ۱۹۸
نذیر نیازی ۸۱، ۱۰۴، ۱۵۷، ۲۲۴، ۲۲۹، ۲۳۹، ۲۶۶

نظامت

نظام الدین میاں ۱۷، ۲۳۵، ۲۲۶
نظامی ۲۰۸، ۲۵۷
نظم طباطبائی (علامہ علی حیدر) ۴۸
نظیر لدھیانوی (اصغر حسین) ۱۱۶
نقی محمد خان خورجوی ۳۷
نواب کھیرپال ۲۲
نوازش علی خان ۹۷، ۲۱
نوبہار خان ۲۳۳
نورالحق میرٹھی ۱۲۳
نورالٰہی (شیخ) ۲۰۰
نور محمد شیخ ۱۹
نیاز الدین خان ۲۴۹، ۲۵۳
نیوٹن ۱۲۳
وادن ۷۶
وجاہت حسین لکھنوی ۱۹
وقار الملک (نواب) ۲۶
ہادی حسن ۲۷
ہاشمی فرید آبادی (سید) ۱۶۸
ہمایوں مرزا ۱۲۸
ہیمی ۶۳
یوسف حسن (حکیم) ۱۹
یوسف حسن (ڈاکٹر) ۸۸
۱۲۸، ۱۲۹

اشاریہ "ج" ـــــ متفرق

(اخبارات، رسائل، کُتب، مقامات ادارے اور اقبال کی نظمیں)

ابطال ضرورت	۴۷	پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کمیٹی	۹۶
اُردوئے مُعلّیٰ	۱۴۵	پیام مشرق	۴۴، ۶۳، ۱۰۴، ۲۱۹
"اساس الاخلاق"	۲۳۲		۲۳۸
اسرار خودی	۲۸، ۹۵، ۲۱۹، ۲۳۵	پیسہ اخبار	۲۶
اسلامی کلچر	۱۹۹	تاریخ پنجاب	۹۶
اسلامیہ کالج لاہور	۷۷، ۱۹۴	تذکرہ شعرائے کشمیر	۱۹۴
اصلاح	۱۶۹	جامعہ ملّیہ دہلی	۲۵
اقبال (رسالہ)	۳۸	جاوید نامہ	۱۵۶، ۲۱۹، ۲۲۴
الناظر	۸۶	جہاں آرا بیگم	۶۸
النساء (رسالہ)	۶۲، ۶۳	چھندواڑہ جیل	۴۲
انجمن اتحاد	۸۰	حبیبہ ہال (اسلامیہ کالج)	۷۷
انجمن اسلامیہ پنجاب	۲۰۰	حی علی الفلاح	۱۶۹
انجمن ترقی اُردو	۲۰۰	خزینۂ معارف	۷۸
انجمن حمایت اسلام	۱۶، ۱۷، ۹۵، ۱۷۵، ۲۱۶، ۲۳۲	خطبات	۲۴۲
انجمن خُدّام الخلق	۱۵۵	خمخانۂ جاوید	۳۷
انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ	۲۱۷	ذوالفقار گنج	۳۹، ۱۷۳
اندلس کا ماضی و حال	۱۶۴	رموزِ بے خودی	۲۱۹، ۲۲۵
انقلاب	۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۵۳	روحِ اقبال	۸۳
ایم اے او کالج علی گڑھ	۲۵	زمانہ	۸۶
ایرانِ رفعت	۶۹، ۷۱	زمیندار اخبار	۲۵، ۴۰، ۴۲، ۵۲، ۱۵۳
بالِ جبریل	۱۶۷، ۱۸۲		

سیرت النبیؐ ۷۷
سیرت محمد علی ۱۵۸
شہید گنج مسجد ۱۹۲
صوفی (رسالہ) ۳۷، ۸۶
ضربِ کلیم ۱۷۷، ۱۸۲
عثمانیہ یونیورسٹی ۲۵، ۱۱۵
علی گڑھ میگزین ۸۷
فلسفۂ عجم ۹۶
فورٹ ولیم کالج ۷۳، ۷۵
کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو ۲۴۱
کتاب الاغانی ۱۶۰
کشمیر ۶۲، ۱۹۱
کشمیر کمیٹی ۱۵۳، ۱۹۵، ۲۰۸
کشمیری ۱۵۳
کلید اخبار بینی ۶۸
کیمبرج ۶۴
گورنمنٹ کالج لاہور ۲۴
گہرستان ۲۱۰
لغات فیروزی ۹۷
مخزن ۸۶، ۲۱۸
مدینہ، بجنور ۱۵۳
مسدس حالی ۱۲۳
مسلم آؤٹ لک ۳۹
مسلم کلچرل سوسائٹی ۱۲۸
مسلمہ جالندھر ۱۷۷

نظم اقبال

اسیری ۴۲، ۸۱
ایک آرزو ۳۷
ایک پہاڑ اور گلہری ۱۷۴
ایک گائے اور بکری ۱۷۴
ایک مکڑا اور مکھی ۱۷۴
بچے کی دعا ۳۰۰
بلاد اسلامیہ ۶۶
پرندے کی فریاد ۲۹
ترانۂ ملی ۳۷، ۸۵، ۱۴۵
ترانۂ ہندی ۸۶
خضرِ راہ ۳۷، ۲۱۶
دردِ یوزہ خلافت ۱۵۸
شکوہ جواب شکوہ ۲۲، ۳۵، ۱۲۰، ۱۲۳
۱۷۴، ۲۳۳
شمع و شاعر ۲۳۲
مرثیہ سسلی ۳۰، ۱۱۴
مسجدِ قرطبہ ۱۱۴، ۱۶۴
نالۂ یتیم ۱۷، ۱۲۳، ۲۳۲
نیا شوالہ ۸۶
والدہ مرحومہ کی یاد میں ۲۶۰
ہمدردی ۱۷۴
نوجوان ورتھر کی داستان ۱۸۰
والڈرف ہوٹل ۲۱
ہزار داستان ۶۳، ۸۶

باسمہ تعالیٰ شانہ وجل مجدہ

ادعوھم لآبائھم ھو اقسط عند اللہ (سورۃ احزاب ۵)

لے پالکوں کو ان کے باپوں کی
طرف نسبت کر کے بلاؤ یہ اللہ کے ہاں زیادہ انصاف ہے

بناتِ اربعہ

یعنی

چار صاحبزادیاں

رضی اللہ تعالیٰ عنہم

بنات الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعداد چار ہونیکا مدلل ثبوت۔
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چاروں صاحبزادیوں کی سوانح اور فضائل و
مناقب پر جامع و مدلل کتاب اور مسئلہ بناتِ رسول ؐ کے بارہ میں

اعتراضات کا مکمل ازالہ

تألیف

حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہ
محمدی شریف ضلع جھنگ (پنجاب)

ناشر: مکتبہ خلیل
گلستان سٹریٹ نمبر ۲۵
اسلام گنج ابراہیم روڈ
لاہور ۲: پاکستان

دَور حَاضر کی

شہرہ آفاق کتاب

لُو حَمَائِنَہُم

(ہر سہ حصص)

مَعہ مَسئلہ اقرَباء نوازی

مُصنّف: محقق العصر حضرت العلام مولانا محمد نافع مدظلہ

- حضرات خلفاء ثلثہ اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کے باہمی تعلقات کی حسین تصویر۔
- صحابہ کبارؓ اور خانوادۂ حضرت علیؓ کے درمیان اختلاف و انشقاق کی عجمی سازش کی مکمل بیخ کنی۔
- جماعتِ صحابہؓ بالخصوص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر قدیم جدید اعتراضات و مطاعن کا مکمل و مسکت جواب۔
- بین الاقوامی شہرت کی حامل کتاب۔ جس سے ان گنت قلوب منوّر ہوئے، علماء نے تحسین کی، اپنوں کو قلبی تسکین نصیب ہوئی اور بیگانے لاجواب ہو گئے۔
- صدر اسلام کے مردانِ خدا کی مثالی زندگی کا حسین عکس۔
- کتابت، طباعت اور کاغذ و جلد کے اعتبار سے انتہائی جاذب نظر۔

نوٹ:
دَور علوی
زیر ترتیب ہے۔

مکتبہ خلیل
اسلام گنج، ابراہیم روڈ، گلستان سٹریٹ ۲۵، لاہور

اسلامی معلومات کیلئے یہ کتابیں پڑھیں

سیرتِ محبوبِ کائناتؐ	حضورؐ کی دعائیں
خلفائے راشدینؓ	علمِ حدیث ؐ
مسلمان خاوند بیوی،	مسلمان خواتین کیلئے بیس سبق
تعلیم الاسلام (مکمل)	اسلام کیا ہے؟
طبِ نبویؐ	اعمالِ قرآنی
قبر کی پہلی رات	میری نماز
جدید عربی بول چال	سیرِ فرنگ

کتب خانہ شانِ اسلام

چوک اردو بازار

لاہور، پاکستان

نادِر و کمیاب علمی کِتابیں

ہمارے کتب خانہ میں ہر قسم کی نادر و کمیاب علمی کتب درسِ نظامی
تفاسیر و احادیث، متُون و شرُوح، تعلیقات و حواشی
شِعر و ادَب، تواریخ و سِیَر، طِب و حِکمت، تصوُّف
و اخلاق، عملیات و تسخیر، دوَاوِین و کُلّیات، عرَبی
فارسی، اُردُو کی خرید و فروخت وسیع پیمانے پر ہوتی
ہے۔ اہلِ علم خدمت کا موقع دیں۔ نیز قلمی کُتب اور
نوادرات بھی عموماً مُہیّا رہتے ہیں۔

نادر و کمیاب کتابوں کا مرکزِ عظیم

کتب خانہ شانِ اسلام

اردو بازار ○ لاہور

معیاری اسلامی اور علمی کتابیں

رسوم اور بدعات پر ایک مکمل اور مدلل کتاب

شریعت یا جہالت

قیمت = /۴۵

حقوق العباد پر ایک نئی اور آسان تصنیف

حیّ علی الفلاح

زیر طبع

ایک ہندو مصنف کا اسلام کا دوسرے نظام سے موازنہ

اسلام جس سے مجھے عشق ہے

قیمت ۷/۵۰

مفتی محمد شفیع رح کی نادر تصنیف

رسولِ اکرمؐ

قیمت ۵/-

جسے پڑھ کر آپ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکتے ہیں

جنت کی ضمانت

قیمت ۵/=

جزاء الاعمال

یعنی

گناہوں کا بدلہ دنیا میں

قیمت = ۵/- روپے

زکوٰۃ و عشر پر ایک مفید رسالہ

احکام زکوٰۃ و عشر

قیمت ۴/=

سنت اور بدعت کی صحیح تشریح

سنت، بدعت

قیمت ۵/=

مکمل نماز اور نماز کے مسائل مسنون دعائیں خطبات عید و نکاح

کتابِ نماز

قیمت ۴/۵۰

غیبت، چغلی، تکبر، بغض سے آپ کس طرح بچ سکتے ہیں

اُمّ الامراض

قیمت ۵/=

جسے پڑھ کر آپ اپنے گھر کا ماحول ٹھیک کر سکتے ہیں

نیک بیبیاں

متبع سنت کا منظر موت

قیمت ۷/۵۰

اگر آپ کی نظر پاک ہے تو آپ کا ایمان پاک ہے

بدنظری کا علاج

قیمت ۵/=

مضامین قرآن کے مطالعہ کے لیے ایک آسان کتاب

قرآن سے ایک انٹرویو

قیمت ۱۲/=

خوبصورت دو رنگا ٹائیٹل کے ساتھ

حضرت اویس قرنیؓ

قیمت ۱۰/=

خلفائے راشدینؓ

قیمت ۳۰/=

خاوند بیوی کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں

مسلمان خاوند اور مسلمان بیوی

خوبصورت پلاسٹک کور = ۱۲/

- کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں یا خط لکھ کر وی پی طلب کریں
- ڈرافٹ پر نام اس طرح لکھوائیں: مکتبہ خلیل اکاؤنٹ نمبر ۵۰۲ حبیب بنک داتا دربار لاہور

مکتبہ خلیل اسلام گنج ابراہیم روڈ گلستان سٹریٹ ۲۵ لاہور

میاں محمد یاسین جہانی کے قلم کا شاہکار

شریعت یا جہالت

اِسلام کے بنیادی عقائد

شریعت کے نام پر جاہلانہ رسوم کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

واعظانہ اور ناصحانہ انداز

گم کردہ راہ لوگوں کے لیے مینارۂ نور

عُلماء اور علم دوست اَحباب کے لیے دَلائل کا ذخیرہ

زبان آسان ، عام فہم، سَلیس اور سادہ

ضخامت ۸۵۶ صفحات ڈائی دار سنہری جلد آفسٹ کاغذ

کتابت و طباعت معیاری

قیمت =/۶۰ روپے صرف